مفتی اعظم کی یاد

مرتبہ:۔ حفیظ الرحمان واصف

مفتی اعظمؒ کی یاد

یعنی

اُن موقر و معتبر مقالات کا مجموعہ جو حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر غیر منقسم ہند کے مختلف جرائد و اخبارات میں اور الجمعیۃ دہلی میں شائع ہوئے۔

مرتبہ

حفیظ الرحمان واصف
مہتمم مدرسہ امینیہ۔ دہلی

۱۳۸۶ھ

قیمت پانچ روپے (5/-)

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

یہ مجموعہ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ یہ ایک گلدستہ ہے جس میں مختلف قسم کے پھول اپنی آب و تاب دکھا رہے ہیں۔ ہر ایک مقالہ اپنے مصنف کے محسوسات کا آئینہ دار ہے۔

وہ مقالات و مضامین جو حضرت مفتی اعظم (نور اللہ مرقدہٗ) کی وفات کے بعد اہل قلم حضرات نے سپرد قلم فرمائے اور مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں نیز اخبار الجمعیۃ کے مفتی اعظم نمبر کے مقالات سب کو اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں مولانا احمد سعید کے متعلق دو مقالے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

میں نے ان تمام مقالات کا مختلف زاویہ ہائے نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی اہم ترین خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ مبالغہ، مداہنت اور خوارق عادات کے تذکرے ان میں آپ کو نہیں ملیں گے۔ کیونکہ یہ سب اہل قلم وہ حضرات ہیں جن کا نہ تو مفتی اعظمؒ کے ساتھ سلوک و طریقت کے سلسلے میں کوئی تعلق تھا نہ بیعت و ارادت کا کوئی رشتہ نہ مفتی اعظم کی زندگی خانقاہی زندگی تھی نہ ان کے گرد و پیش مریدین کا ہجوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالات مبالغے سے پاک ہیں۔ ان میں کرامات و خوارق عادات کا کوئی باب نہیں ہے۔ مفتی اعظمؒ کی مبارک ہستی ہی اُن کے مربیوں اور شیوخ و اساتذہ کی ایک زندہ کرامت تھی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

شعرا حضرات نے نظموں میں اپنے دردِ دل اور جذبات عقیدت کی ترجمانی کی ہے۔ فن تاریخ کا ایک طالب علم اپنے خشک مضمون کے انہماک سے جب تھک جاتا ہے تو کیفیت کو بدلنے کیلئے کچھ ادبی چاشنی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ مجموعہ ایک ہلکا سا نقشہ ہے ایک عظیم الشان ہستی کی اسّی برس کی معتدل زندگی کا اور ایک ہلکا سا خاکہ ہے اس کی ساٹھ برس کی بے لوث خدمات کا۔ اور غرض اس کے شائع کرنے سے محض اپنے دلِ مضطرب کو تسلی دینا اور مرحوم کے منتسبین کو بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا ہے۔

زمانہ کی عادت تو نسیان ہی ہے۔ اہل زمانہ اپنے بڑے سے بڑے محسن کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس ذریعے سے مفتی اعظم کی یاد کچھ تازہ ہو جائے اور کوئی اہل دل ان کے حق میں بھی کسی خاص وقت میں دعائے خیر کر لے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

حفیظ الرحمان واصف
مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ - دہلی
صفر المظفر ۱۳۸۶ھ

آہ مفتی اعظم رح!

از مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط مدیر اخبار الجمعیۃ دہلی

(شمارہ ۳۰۶ جلد ۳۷ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۵۳ء)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!!

آہ مفتی اعظم حضرت علامہ محمد کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کئی ماہ کی طویل علالت کے بعد آج ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کی شب میں دس بج کر ۲۵ منٹ پر اس جہان فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حادثۂ جانکاہ پر ہم اپنے کن تاثرات کا اظہار کریں۔ مسلمانان ہند کو اتنا بڑا حادثہ ایک صدی کے بعد پیش آیا ہے، آہ وہ مفکر اسلام، وہ عالم بے بدل، وہ مفتی بے نظیر جس کے دم قدم سے اسلام اور علوم اسلامیہ کا گلشن ہرا بھرا تھا اور جس کا چراغِ ہستی پورے ہندوستان کو پچاس سال تک منور کرتا رہا وہ آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوا، قلم کو یارا نہیں کہ اس جانشین پیغمبر کی جدائی پر ماتم سرا ہو، دل مغموم ہے، رُوح بے چین ہے، آنکھیں اشکبار ہیں اور جذبات کی کل کائنات درہم برہم ہے، جگر کی بیماری کیا لاحق ہوئی کہ جان لے کر چھوڑی اور آپ چند ماہ کی علالت کے بعد ہم حرماں نصیبوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ اے خدا تو دلوں کو تھام لے، اے پروردگار تو قلب پر صبر کا القا فرما، یہ غم آنے والی نسلوں میں بھی تازہ رہیگا۔ اور یہ زخم جلدی بھلایا نہ جاسکے گا! حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ملک کی آزادی کے لئے جو قربانیاں دیں اور قوم کی خاطر جس طرح جیلوں کو لبیک کہا اور کانگریس کے مقاصد و اصول کے لئے جو شاندار خدمات انجام دیں انہیں انصاف کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں اگر آپ کا ہاتھ نہ ہوتا تو وہ یقیناً معنویت سے خالی رہتی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ راست، قائدین ملت کے بے خطا مشیر ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کے رکن اعظم، اسلامی علوم

کے آفتابِ منوّر، خلوص، ہمت، عزم، استقلال اور گہری بصیرت کے پیکرِ نورانی!!

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر امت مدتوں آنسو بہاتی رہے گی۔ اے خدا، مرحوم پر اپنی رحمتوں کی بارش فرما اور امت کو ان کا کوئی جانشین عطا کر اور اعزہ و متوسلین کے ساتھ تمام مسلمانوں کو صبر و شکر کی توفیق دے اور ان کے مشن کی بقاء کے لئے اپنی جناب سے کوئی سامان کر!

عجلت میں دلِ درد مند اور قلم ماتم سرا سے یہ چند الفاظ نکل گئے ہیں اور اس وقت قلم کو یارا بھی نہیں ہے کہ وہ داستانِ حیات کا کوئی باب مرتب کر سکے، ہم اس وقت مسلمانانِ عالم کو اس آیہ کریمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر مجمع صحابہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تلاوت فرمائی تھی۔ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل فان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم؟

پیغام تعزیت

از مسٹر شعیب قریشی

(اخبار الجمعیۃ شمارہ ۷ جلد ۲۸۔ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۵۳ء)

ہندوستان میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر شعیب قریشی نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ مسٹر شعیب قریشی کا پورا بیان حسب ذیل ہے:-

حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی غم انگیز خبر سن کر مجھے انتہائی رنج و الم ہوا۔ میں سالہا سال سے مفتی صاحب سے واقف رہا ہوں، مفتی صاحب کا غم نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں منایا جائیگا بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ان کی وفات پر ماتم کیا جائیگا۔ کیونکہ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک زبردست عالم فاضل مفتی تھے۔ ان کے جاری کردہ فتووں کی جو علم اور عقل کے اعتبار سے مستند ہوتے تھے۔ قدر کی جاتی تھی۔ اور انھیں اٹل سمجھا جاتا تھا۔ ایک مذہبی رہنما ہونے کے علاوہ مفتی صاحب نے ہندوستان کی قومی جدوجہد اور بین الاقوامی مسلم سیاست میں نمایاں کام کیا تھا۔ ہندوستان میں انھوں نے تحریک خلافت میں ایک اہم پارٹ انجام دیا اور عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔

ھندوستان سے باہر انھوں نے عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کی جو مکہ معظمہ میں شاہ ابن سعود نے بلائی تھی۔ بعد کو انھوں نے قاہرہ میں فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔ ؎

میں مفتی صاحب کے عزیزوں کے ساتھ رنج وغم میں دل سے شریک ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی روح کو سکون بخشے۔

مسٹر شعیب قریشی اور ان کے عملہ کے افسران نے مفتی صاحب کے جنازہ کی نماز میں شرکت کی۔ اسٹاف کے ممبران بھی جنازہ کے ساتھ رہے۔

یاد رہے کہ مسٹر شعیب قریشی اپنے عہدہ پر مامور ہو کر جب دہلی تشریف لائے تھے تو سب کاموں سے پہلے آپ مفتی صاحب کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے تھے۔

حضرت مفتی اعظم

(روزنامہ نئی دنیا دہلی شمارہ ۲ جلد ۷ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۵۳ء)

۱۹۵۳ء کی پہلی صبح ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ خبر وحشت اثر سنی کہ دنیائے اسلام کو منور کرنے والا منارۂ عرفان وہدایت بے نور ہو گیا۔ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا مفتی اعظم ہند حضرت حاج مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اس دنیا سے کوچ کر گئے اور جو شخصیت ستر سال تک مسلمانوں کے لئے مرکز رشد وہدایت بنی رہی تھی وہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی۔

حضرت مفتی اعظم شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کا شمار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کے مخصوص شاگردوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر ہی میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ دیوبند سے تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۹۲ء میں آپ شاہجہاں پور تشریف لے گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہاں سے مولانا امین الدین صاحب آپ کو مدرسہ امینیہ میں لے آئے جس سے آپ زندگی کے آخری سانس تک وابستہ رہے اور دہلی کے ۵۰ سالہ قیام میں ہزاروں بندگان خدا نے آپ سے علوم دینی کا درس حاصل کیا۔ اگرچہ آپ مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش اور

؎ فلسطین کانفرنس علی علوبہ پاشا کی صدارت میں ہوئی تھی۔ حضرت مفتی اعظم کے لئے کرسی صدارت کے دائیں طرف کرسی رکھی گئی تھی۔ (واصف)

صف اول کے رہنماؤں میں شامل رہے مگر نام ونمود اور شہرت سے ہمیشہ دور رہے۔ آپ انتہائی وضع دار قسم کے انسان تھے دہلی اور یو۔پی کی اعلیٰ روایات آپ کے اندر اس درجہ موجود تھیں کہ اس دور کے انسانوں کے لئے آپ کی سیرت وکردار ایک قابل تقلید مثال اور ایک یادگار سرمایہ تھا۔

جب آپ دہلی تشریف لائے تو دہلی کے لوگ آپ کے علم وفضل کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم ہمیشہ کھڑے ہوکر آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔

مختلف الخیال علماء کرام آپ کے فتووں کو تسلیم کرتے اور اہمیت دیا کرتے تھے۔ سیاسی دنیا میں آپ کا نام ۱۹۱۶ء میں ماٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے موقع پر سامنے آیا لیکن ۱۹۱۹ء میں آپ کے مشورے سے جب جمعیۃ علماء کا قیام عمل میں آیا تو پھر اس کے بعد سے آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیاسی دنیا میں آگیا۔ آپ ہی جمعیۃ علماء ہند کے سب سے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۳۸ء تک مستقل صدر رہے۔ حضرت مولانا احمد سعید آپ کے ہمراہ جمعیۃ علماء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

آہ شمع گُل ہو گئی

(روزنامہ نئی دنیا شمارہ ۳ جلد ۷ مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۳ء)

موت انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں ہر انسان قدرت خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے انسانوں۔ ہفت اقلیم کے شہنشاہوں، خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون ونمرود سکندر ودارا۔ قیصر وکسریٰ روما کے شہنشاہوں اور روس کے زاروں کو بھی مفر نہ ہوا۔ اور جب موت کے آہنی پنجہ نے آکر ان کا گلا دبایا تو شوکت وحشمت دولت و حکومت سطوت وثروت کوئی چیز کام نہ آئی۔ دنیا کے جلیل القدر انسانوں۔ پیغمبروں۔ ولیوں اور متقی وپرہیز گاروں کو موت کی آغوش میں جانا پڑا اور خداوند کائنات کا یہ فرمان پورا ہوا کہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ"

حضرت مفتی اعظم الحاج مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحؒ نے اس پیغام برحق کو گذشتہ شب لبیک کہا اور اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفتی صاحب کی وفات اسلامی دنیا کا ایک ایسا حادثۂ عظمیٰ ہے جس کے بعد دنیا کے ستر کروڑ انسانوں کے دل رنج وغم سے

معمور ہو گئے ہیں ان کی نظروں اور ان کے دل و دماغ پر ایک الم واندوہ کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ انسانوں کی دنیا و عقبیٰ کے لئے ایک مشعل راہ تھی جو بجھ گئی۔ علم و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہو گیا۔ دین و مذہب کا ایک مجسم پیغام تھا جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ حق و معرفت کی ایک آواز تھی جو اب کبھی نہ سنی جا سکے گی۔ بساط سیاست کا ایک رہنما تھا جو دنیا سے اٹھ گیا۔ اسلام کا ایک علمبردار تھا جو آج ہم سے جدا ہو گیا۔ ہندوستان کی تاریخ نو کا ایک باب تھا جو ختم ہو گیا۔ قصر حریت کا ایک معمار تھا جس نے تکمیل قصر میں حصہ لیا خشت آخر اپنے ہاتھوں رکھی لیکن رخصت اس حال میں ہوا کہ ساتھی قصر میں تھے اور وہ اپنے پرانے جھونپڑے میں۔ چمن آزادی کا وہ باغبان تھا جو آزادی کی بہاروں سے لطف اندوز نہ ہو سکا اور بچھڑ گیا۔ غرضیکہ ایک ایسا جلیل القدر انسان اٹھ گیا جس کے لئے کسی نے کہا ہے ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات ... تا زِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ملک و ملت کے لئے ایک سرمایہ تھی انہوں نے پوری زندگی ایک انتھک سپہ سالار کی حیثیت سے گذاری انھوں نے اپنی تمام بے لوثی کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت میں بسر کی۔ ان کا ایک ایک قدم اور ہر فعل تعلیمات اسلامی کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ انہوں نے استخلاص وطن کے لئے جو جدوجہد کی، قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کیں انکو جہاد فی سبیل اللہ سمجھ کر اور اسلام کا ایک مقدس فریضہ جانتے ہوئے وہ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر رہنما عظیم المرتبت پیشوا اور فقید المثال عالم دین تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دین و سیاست کے ایسے نازک ترین مسائل کو سلجھایا اور ایسی پیچیدہ گتھیوں کی عقدہ کشائی کی جن میں بڑے بڑے سیاسی رہنما اور مذہبی پیشوا الجھ کر رہ جاتے تھے ان کے ناخن تدبیر سے ہندوستان کی قسمت بدلنے والے بہت سے مسائل حل ہوئے ہیں وہ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں اور آزادی کی لڑائی لڑنے والی کانگریس کو اپنے خون سے سینچنے والے قابل عزت و احترام رہنماؤں میں سے تھے۔

آج مفتی اعظم کی جدائی پر عالم اسلام ماتم کناں ہے اور آنے والے زمانہ میں سالہا سال تک سوگوار رہے گا۔ کیونکہ موجودہ دور میں علوم اسلامیہ، دین متین اور بالخصوص فقہ کی جزئیات کا رمز آشنا ان سے بڑھ کر دنیائے اسلام میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ وہ عالم اسلام کی ایک مسلمہ شخصیت تھے اور اسلامی دنیا ہمیشہ اس منارۂ علم و عرفان سے رہنمائی حاصل کرتی رہی۔ وہ ایک ایسے انسان تھے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات ... ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

مفتی اعظم کے ماتم کے لئے اگر آج ہمارے پاس آنسوؤں کے سمندر ہوں تو ہم بہائے جائیں۔ خود روئیں اور آپ کو رلائیں۔ اور اپنے قلب و جگر کو چیر کر صفحۂ قرطاس پر پیش کردیں مگر اس ماتم کے لئے عمر پڑی ہے۔ آج وقت ہے کہ ہم سب مل کر اس مرد عظیم اور نائب رسول اللہ صلعم کی زندگی سے انسانیت۔ اخوت محبت۔ اخلاص۔ ایثار۔ قربانی۔ خدمت۔ ہمت۔ حوصلہ۔ عزم و استقامت کا درس لیں۔ اور خدا سے دعا کریں کہ وہ اس مرد جلیل کی قبر پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔ ہم سب کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے اور ہم صبر و استقلال کے ساتھ مسلمانان ہند کی زندگی کے لئے ایک ایسے شاندار مستقبل کی تعمیر کریں جس کے لئے مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ زندگی بھر کوشاں اور دعا کناں رہے ہے۔

مفتی کفایت اللہؒ

(روزنامہ امروز کراچی مورخہ ۴ رجنوری ۱۹۵۳ء)

مولانا مفتی کفایت اللہ کے انتقال کی خبر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام میں نہایت ہی غم واندوہ کے ساتھ سُنی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی حلقے کو اختلاف ہو لیکن مفتی صاحب کے علمی تبحر، اور دیانت داری و راست بازی سے اُن کا بدترین مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ان علمائے حق میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی حصول علم اور اشاعت علم کے لئے وقف کردی۔ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ غیر ملکی اقتدار کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ اور اس وقت تک سرگرم عمل رہے۔ جب تک فرنگی اقتدار کا قلع قمع نہ کرلیا۔ اُن کی زندگی اور اُن کا عمل مسلمانان ہند کے لئے ہمیشہ مشعل ہدایت ثابت ہوا۔ وہ محض مفتی دین نہ تھے بلکہ اپنے ذاتی اعمال اور نجی زندگی میں بھی دین کے احکامات کی پابندی اور شرع مبین پر عمل درآمد کے سلسلے میں ان کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا۔ ان کے قول و فعل میں بڑا تطابق تھا۔ اور یہ بات ان دنوں بڑی عنقا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ نکتہ بڑا اجاگر ہے کہ اُن کے مذہبی رہنما محض "کٹھ مُلا" کبھی نہیں تھے۔ بلکہ اس کے برعکس علمائے دین نے سیاست اور مذہب دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی سعی کی۔ چنانچہ وہ اگر ایک طرف فرنگی اقتدار کی بے دینی اور لامذہبیت کے خلاف صف آرا ہوئے تو دوسری طرف انھوں نے سیاسی اعتبار سے حق خود ارادیت اور آزادی و خود مختاری کی ہمیشہ حمایت کی۔ ان کی بغاوت محض ملائیت اور تنگ نظری کی مرہون نہ تھی۔ بلکہ اس کے پیچھے اسلام کی حریت پرور روایات اور آزادی

ترقی وخود مختاری کے زریں اصول اور اعلیٰ قدریں کارفرما ہیں۔ مفتی صاحب اُن صالحین میں سے تھے جن کا کردار اور جن کا عمل ہر اعتبار سے مکمل اور لائق تقلید تھا۔ وہ عالم دین تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے علماء کو تعلیم دی۔ وہ آزادی کے علمبردار تھے اور ہمیشہ آزادی کے لئے نبرد آزما رہے۔ ہندوستان خواہ ہندوؤں ہی کے قبضہ میں کیوں نہ آجائے۔ اور خواہ تنگ نظر لیڈر اور متعصب وزراء اس پر حکمرانی کیوں نہ کریں۔ یہ حقیقت بہر حال حقیقت ہے کہ اس ملک کو آزاد کراتے اور اس کے باشندوں کو آزادی کی نعمت سے متعارف کرانے میں مسلمان علماء کا بڑا دخل ہے۔ اور ان علماء میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کا نام سب سے نمایاں اور سب سے ممتاز ہے۔

ہم ایک ایسے دور میں رہتے ہیں جب ایک نسل اپنے متقدمین سے قطع تعلق کر رہی ہے اور کلچر یا تہذیب کی اُن قدروں کو روند رہی ہے۔ جو دراصل انسانیت اور تمدن کے ارتقاء کی روح رواں ہیں۔ ایسے زمانے میں مفتی صاحب جیسے بزرگوں کا اُٹھ جانا بڑا عذاب ہے۔ اُن کی موجودگی نئی نسل کی تربیت اور تعلیم کے لئے ضروری تھی۔ لیکن خدا کی مصلحتیں خدا ہی جانے۔ انسان یہاں بے بس ولاچار ہے۔ اور سوائے دعا کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ اور اُن کے متعلقین کو صبر جمیل دے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رح

(روزنامہ آزاد لاہور شمارہ ۲ جلد ۱۱ مورخہ ۴ رجنوری ۱۹۵۳ء)

ایک بجھا اور دیا اور بڑھی تاریکی

دُنیائے اسلام میں یہ خبر انتہائی رنج والم کے ساتھ سُنی گئی ہے کہ موجودہ دور کی عظیم شخصیت مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی کچھ عرصہ بیمار رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

آپ کی عمر ۷۵ [1] سال تھی، کل آپ قطب صاحب (مہرولی) کے قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے!

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ برصغیر پاک وہند کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے۔ آپ شیخ الہند

---

[1] تقریباً اسی سال عمر پائی۔ (واصف)

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اہل علم وفضل آپ کو "ابوحنیفہ وقت" کے لقب سے پکارتے تھے۔ طبیعت کی سادگی اور زہد واتقاء آپ کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی آپ ہند و پاک میں افتاء کے امام تھے۔ آپ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں جب کسی موضوع پر بحث ہوتی تو حضرت مفتی صاحب نہایت متانت اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ہر ایک رکن کی بحث سنتے، جب بات ختم کرنا ہوتی تو آپ لمبی چوڑی بحث کو ایسے سادہ جملوں میں سمو دیتے کہ اراکین حیران رہ جاتے، قرار دادیں مرتب کرنا ہوتیں تو بھی ایسے سہل، سادہ اور مختصر الفاظ استعمال کرتے کہ کسی ممبر کو پھر یہ ضرورت تک محسوس نہ ہوتی تھی کہ آپ کی تحریر کا کوئی جملہ کاٹا جائے یا کسی حرف کی جگہ دوسرا حرف استعمال کیا جائے۔

آپ اپنے آخری دم تک تمام فتاویٰ کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتے۔ آپ کا خط بے حد خوشنما تھا۔ تحریر یوں دکھائی دیتی گویا موتیوں کی لڑیاں ہیں، جو پورے سلیقے اور قرینے کے ساتھ پروئی گئی ہیں۔ اپنی تحریر میں زبان سادہ استعمال کرتے، علامۃ الدہر اور مفتی اعظم ہونے کے باوجود چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نہایت سہل زبان میں تعلیم الاسلام کے رسالے تحریر فرمائے، جو تعلیمی اداروں میں بے حد مقبول ہیں۔ اور پاکستان کے سرکاری اسکولوں میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

آپ نے اپنی زندگی کے ایام محض "حجرۂ تنہائی" میں چُھپ کر نہیں گذارے۔ بلکہ ہندوستان کو انگریزی سامراج سے نجات دلانے اور حصولِ آزادی کے لئے آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں! آپ کے نحیف و ناتوان جسم نے ملتان، منٹگمری[۱] کے علاوہ ہند و پاک کی کئی جیلوں کی سختیاں برداشت کی تھیں!

قیامِ پاکستان اور ملکی تقسیم کے بعد آپ اگرچہ ہندوستان میں رہ گئے تھے، مگر فتاویٰ کے حصول کے لئے مسلمانانِ پاکستان کو بالآخر آپ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔

آپ کی زندگی علم وفضل کا ایک سایہ تھی اور اب یہ سایہ اٹھ جانے کے بعد دُور تک تاریکی ہی دکھائی دیتی ہے

دُور تک کوئی ستارا ہے نہ جگنو باقی　　　مرگِ اُمید کے آثار نظر آتے ہیں!

حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے لئے تمام مسلمان بالعموم اور مجلسِ احرار اسلام سے تعلق رکھنے والے حضرات بالخصوص ختم قرآن مجید کر کے ایصالِ ثواب کریں اور آپ کے حق میں دعاء مغفرت کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے! آمین

---

[۱] منٹگمری نہیں۔ بلکہ گجرات اور ملتان۔ (واصف)

حضرت مفتی کفایت اللہ رح

از شریف جالندھری

(روزنامہ آزاد لاہور مورخہ ۴ جنوری ۱۹۵۳ء)

مفتی اعظم حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ العزیز کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر دنیائے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ تمام مدارس عربیہ اور دینی اداروں میں ختم قرآن مجید کر کے آپ کو ایصال ثواب کیا گیا۔ برادرم شریف جالندھری نے حضرت مفتی صاحب رح کے انتقال پُرملال پر یہ نظم ارتجالاً سپرد قلم کی ہے:- (مدیر)

علم و دانش کی تجلی کہیں رُوپوش ہوئی
وادیٔ علم میں ہر سمت فضا روئے گی
اے کفایت تیرے دامن سے جو اُلجھی اکثر
وہ معطر سی، وہ پاکیزہ ہوا روئے گی

زندگی تیری تقدس کا سراپا کہیے!
تیری ہر بات میں تھی فکر کی دُنیا آباد
شب آخر میں ترے دل کا تڑپنا معلوم
تیری آواز میں تھی ذکر کی دُنیا آباد

تو نے سوئے ہوئے انسان کو بیدار کیا
تیرا احسان ہے ملت کے نگہبانوں پر
تو نے بخشا ہمیں وہ جذبۂ خوش رنگِ نہاں
کیف طاری ہے ہر اک سمت گلستانوں پر

تو وہ درویش تھا جس کی نگہہ قہر کے ساتھ
تاج اُڑتے نظر آئے ہیں شہنشاہوں کے
تو وہ درویش تھا اُف جس کے دلِ زندہ سے
اُڑتے دیکھے گئے خوش رنگ شرر آہوں کے

تیرے افکار تخریبہ تھا قدا کاری کا!
تیری کوشش تھی کہ زندانوں کے در ٹوٹ گئے
جن کو افرنگ نے پابندِ قفس رکھا تھا
وہ اسیرانِ وطن قید سے سب چھوٹ گئے

تیری گفتار تھی یا مردِ مجاہد کا خروش
تو نے وہ درس دیا تھا کہ بھلایا نہ گیا
وقت کے ہاتھوں لٹا قوم کا سرمایۂ دل
تیرا پیغام مگر دل سے مٹایا نہ گیا

تو وہ رہبر تھا کہ صدیوں میں نہ پیدا ہوگا — ہے یقیں مجھ کو اندھیروں میں ضیا رو ئیگی
موت نے تجھ کو جدا ہم سے کیا ہے لیکن — "بال کھولے تری تربت پہ قضا روئے گی"

آہ مفتی اعظم رح

(روزنامہ خلافت بمبئی شمارہ ۷ جلد ۳۴ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۵۳ء)

آہ!..... دنیائے اسلام کا جلیل القدر فرزند موت کے ابدی آغوش میں آرام کی نیند سو گیا۔ فقیہہ وقت مفکر جلیل، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب؟ نہ صرف ہند و پاکستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے بلکہ ساری دنیائے اسلام ان کے علم و کمال کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھی۔ بڑے بڑے فقہی مسائل مرحوم اپنی معمولی جنبش قلم سے حل کر دیا کرتے تھے۔ جن مسائل و فتاویٰ کے جواب میں دیگر علماء ورق کا ورق سیاہ کر دیا کرتے تھے۔ ان کا جواب وہ بسا اوقات ایک جملہ اور ایک سطر میں دیدیا کرتے تھے۔ مرحوم کتنی باریک بین نظر کے مالک تھے اس کا اندازہ لگانا بجائے خود کچھ کم دشوار نہ تھا لیکن اس تبحر علمی کے باوجود مولانا کی سادگی پر قربان ہونے کو جی چاہتا تھا مولانا کے نیازمندوں نے اکثر یہ منظر دیکھا ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے۔ اور یہ جلیل القدر انسان اپنے دونوں ہاتھوں میں لکڑیوں کا ڈھیر لیئے ہوئے اپنے مکان کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ علم انسان پر حاوی ہے یا انسان علم پر۔ مولانا مرحوم کتنی جامع شخصیت کے مالک تھے اس کا کچھ وہی لوگ بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں جنہیں اکثر و بیشتر ان سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔

مولانا مرحوم فقیہہ و عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ کے سیاستداں بھی تھے۔ آپ نے تحریک خلافت و ملکی آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ برسوں جمعیۃ العلمائے ہند کی صدارت کے فرائض بھی انجام دئے ہیں۔ متعدد بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ لیکن صبر و شکر کا ہمیشہ یہ عالم رہا ہے کہ پبلک تقریر یا نجی گفتگو میں کہیں پر اور کبھی بھی حد سے بڑھی ہوئی مشقتوں کا گلہ و شکوہ نہیں کیا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ وہ اس عظیم المرتبت عالم کی گوناگوں خوبیوں کو سپرد تحریر کر سکے۔

مولانائے مرحوم کی رحلت سے علم و فقہ کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پر ہونا آسان نہیں خدا اس نیک سیرت انسان کی قبر کو انوار کی بارشوں سے معمور کر دے اور اس فرشتہ صفت انسان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین! ٭

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی

(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۵ جنوری ۵۳ء شمارہ ۵، جلد ۳۸)

حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ ہم یتیم ہو گئے ہوں۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم ہندوستان کے ایک مایہ ناز فرزند اور جدوجہد آزادی کے ایک بے باک سپہ سالار تھے جن سے ہم محروم ہو گئے۔ وہ عصر حاضر کے بے مثال مفکر و مدبر تھے جنھیں ہم اب کبھی نہ پا سکیں گے۔ وہ اپنے وقت کے ابو حنیفہ تھے جن سے اب ہم کوئی استفادہ نہ کر سکیں گے — یقیناً پوری ملت اسلامیہ یتیم ہو گئی۔ شاید ایک عرصہ تک یہ خلا پورا نہ ہو سکے گا۔

اللہ والوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ اپنی آخر عمر میں ان کا رُخ دار الآخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا رُخ بھی اسی طرف ہو گیا تھا اور انہیں احساس ہو چلا تھا کہ اب وہ جہانِ فانی سے دار البقاء کی طرف جانے والے ہیں۔ شروع ستمبر میں جب مفتی صاحب بیمار ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری آواز سُن کر آپ اوپر سے نیچے تشریف لے آئے اور نیچے آ کر برآمدے میں چٹائی پر لیٹ گئے۔ اس وقت آپ کو ۱۰۲ بخار تھا اور اُبکائی کی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نیچے کیوں تشریف لے آئے میں اوپر آ جاتا۔ اور آپ چارپائی پر لیٹئے زمین پر کیوں لیٹ رہے ہیں — فرمانے لگے — "اسّی سال کا ہو گیا ہوں پچاس برس دہلی میں گذار دیئے" — میں نے اس جملہ سے سمجھ لیا کہ اب رُخ آخرت کی طرف ہو گیا ہے۔

اس کے کچھ دن بعد مرحوم سے مجھے دوسری بار ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا اور اس بار میں نے ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت دیکھی — کمزوری اور نقاہت کے باوجود ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مدرسہ امینیہ دہلی میں بیٹھ کر ہزارہا انسانوں کو قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیا اور آپ کے شاگرد تمام عالم اسلام میں پھیل گئے۔ ان کے شاگرد بڑے بڑے نامور عالم ہیں۔ دار العلوم دیوبند میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب آپ کے قابلِ فخر شاگردوں میں ہیں۔

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے شاگرد خاص تھے۔ تمام زندگی تقویٰ اور دیانتداری سے بسر کی، غیبت، خیانت اور انتقام کا کبھی تصور بھی آپ کے دل میں نہ آیا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی نیکی کرنے کے عادی تھے، ہندوستان کے بڑے بڑے علماء مثلاً حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیری۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت مولانا سجاد بہاری انکے علم و تقوے کا اعتراف کرتے تھے۔

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جنھیں حضرت مفتی صاحب مرحوم کا قرب حاصل تھا۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں ۱۹۱۹ء ہی سے میں ان کے قریب ہو گیا تھا اور جب ۱۹۲۶ء میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ سفر حج کا موقع ملا اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ان کے ساتھ گجرات اور ملتان کی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھے انہیں سمجھنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مفتی صاحب نہ کسی سے خدمت لیتے ہیں اور نہ کسی کو ڈانٹتے ہیں۔ لیکن میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جس کو مفتی صاحب ڈانٹ بھی لیتے تھے اور خدمت بھی لیتے تھے اور میں اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا تھا ۔۔۔ وہ دراصل مجھے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔

جیل میں میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کس قدر بلند کردار کے مالک ہیں۔ ہم لوگوں کو وہاں اخلاقی قیدی بطور خدمت گار کے ملے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے بیٹھ کر سیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جواب دیا کہ "ان سے کام لینا ظلم ہے۔ وہ میرا جو کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ ادا کرتا ہوں۔ حکومت کو ان سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

گجرات جیل سے مفتی صاحب راقم الحروف سے کچھ قبل رہا ہو گئے تھے۔ انھوں نے جتنے خطوط لکھے ان میں اخلاقی قیدیوں کو سلام لکھتے تھے۔

۲۶ء کے دوران حج میں جب حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماء کا ایک وفد لے کر مؤتمر اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے جو اس موقع پر سلطان ابن سعود نے طلب کی تھی میں نے حضرت مفتی صاحب کی جو کیفیت دیکھی اس کا اثر تمام عمر میرے دل پر رہے گا۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان اونٹوں کا سفر تھا۔ جب سب ساتھی تھک کر سو جاتے تو حضرت مفتی صاحب سب کے لئے کھانا تیار کرایا کرتے تھے۔ خرچ میں اگر گڑبڑ ہوتی تو اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور جمعیۃ کے فنڈ پر بار نہ ڈالتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مختلف الخیال لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک بڑا فراخ دل پایا تھا جس کے ان کے مخالفین بھی معترف تھے۔ جب مؤتمر اسلامی کا اوپر ذکر آیا اس میں علی برادران بھی علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے، جمعیۃ علماء کے وفد سے ان حضرات کا اختلاف تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ علی برادران اپنی قراردادوں کی ترتیب و تدوین میں بھی جن سے حضرت مفتی صاحب کو اختلاف ہوتا تھا مشورہ کرتے تھے۔

یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بنا پر تمام طبقوں میں حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ حکیم

اجمل خاں صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ خود مفتی صاحبؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور کبھی اس بات کا موقع نہ دیتے کہ وہ خود حکیم صاحب کے مکان پر آنیکی تکلیف کریں

دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی میں ہوتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب حضرت مفتی صاحب سے عربی میں خط وکتابت کرتے تھے۔ کاش یہ عربی خط وکتابت کہیں سے دستیاب ہو سکتی اور ہم دو عظیم ہستیوں کے خیالات سے آگاہ ہو سکتے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ پہلے ایک معاملہ کی پوری طرح چھان بین کر لیتے تھے اور پھر کسی نتیجہ پر پہونچتے تھے۔

۱۹۲۹ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی تھے ایک سلسلہ میں لاہور جانے والے تھے۔ شاردا بل کی بحث چل رہی تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامع مسجد میں ایک پرزور تقریر کی اور جمعیۃ علماء اور مجلس تحفظ ناموس شریعت پر سخت نکتہ چینی کی اور اس وقت ہونیوالی ایک ہڑتال کی مخالفت کی۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی روانگی ملتوی ہوگئی اور حضرت مفتی صاحب مرحوم نے اس التوا کی وجہ سے خادم کو مطلع کیا اور ساتھ میں تاکید کردی کہ اس تفصیل کی اطلاع میں مولانا ظفر علی خاں، غلام رسول مہر اور مولانا سالک کو جو اس وقت جمعیۃ علماء کے ہمنوا تھے ان کو خبر نہ کروں تاکہ اختلافات زیادہ نہ بڑھیں۔ دراصل حضرت مفتی صاحب پہلے مولانا محمد علی کے خیالات پرکھنا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ بعض سطحی اختلافات اتنی شدت اختیار نہ کرجائیں کہ اصل مقصد کو نقصان پہنچے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی اصل خوبی بے نفسی اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سب سے زیادہ کام کیا اور اس وقت کیا جب لوگ اس طرف آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ گاندھی ارون پیکٹ کے وقت تمام سیاسی قیدی رہا کردیئے گئے تھے لیکن مجھے نہیں چھوڑا گیا تھا۔ میری قید میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مجھے لکھا کہ آپ کے لئے وائسرائے سے کیا کہا جائے دو ماہ باقی رہ گئے ہیں اور آپ کے لئے اتنا عرصہ گذارنا مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ جب میں جیل کاٹ کر باہر آیا تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت مفتی صاحب کے بہت سے کام زندگی میں باقی رہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ نمایاں نہ ہونا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جن سے انکی بے لوث زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک مجموعہ کمالات تھے اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ انھیں قلمبند کرسکوں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اللہ تعالےٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

چند آنسو

از جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر

(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۵ رجنوری ۵۳ء شمارہ نمبر ۵ جلد نمبر ۳۸)

مفتیٔ اعظم ہوئے جنت مکاں
بس کہ اصلِ خلد ہے حسنِ عمل

مگر ایسا جدائی کا قلق — اس خبر سے جی گیا اپنا دہل
چھین لی ہم سے متاعِ بے بہا — آہ آہ از دستِ بیدادِ اجل
رہ گئے سر پیٹتے اہلِ زمیں — وہ قضائے آسمانی تھی اٹل
علمِ دیں کہتا ہے با قلبِ حزیں — اب کہاں وہ رونقِ بزمِ عمل
یہ تو اس ذہنِ رسا کا وصف تھا — عقدۂ مشکل کرے اب کون حل
خلق سے تھا آپ کے برتاؤ میں — رنگِ اخلاقِ خدائے عزّ و جل
ناصیہ میں آپ کے تھا جلوہ گر — چہرۂ نورانیٔ صبحِ ازل
آپ یوں تھے بے ہمہ اور با ہمہ — جیسے سطحِ آبِ صافی پر کنول
ربط ایسا عالمانِ دیں سے تھا — جیسے وابستہ ہے جمعیۃ سے "آل"
قوم کی گڈری یہ حسنِ ظن سہی — کون یہ اس سے کہیگا لعل اُگل
آپ ہی کے نعرۂ حق سے پڑا — ٹامیوں کے خوابِ راحت میں خلل
آپ کے آگے تمردِ سلطنت — تھا۔ مگر کیا اک جلی رسی کا بل
عزم سے مردانہ کی وہ راہ طے — جس میں اکثر پاؤں جاتے تھے پھسل

عقل کہتی ہے اُٹھا دستِ دعاء
ہوش سے راہِ عبودیت پہ چل
رحمتِ حق ہم کو ارزانی کرے
صبر اور مرحوم کا نعم البدل (آمین)

قطعاتِ تاریخِ وفات

از حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند
(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۵ رجنوری ۵۳ء شمارہ ۵ جلد ۳۸)

مفتیٔ اعظم فقیہہ بے نظیر — آج رخصت دارِ فانی سے ہوئے
موت کس کی، مفتیٔ اعظم کی موت — ہے قیامت ساری دنیا کے لئے
آج صدرِ منصبِ افتا کہاں — فقہ وعلم وفضل وتقویٰ چل بسے
انور و شبیر و منصور و عبید — پاس شیخ الہند کے پہلے گئے
خلد میں تھے منتظران کے یہ سب — اس لئے وہ بھی روانہ ہو گئے

ان کا یہ سالِ وصال آزاد ہے
وہ بھی اپنے شیخ سے آکر ملے
۱۳۷۲ھ

حشر زا وہ ہے وفاتِ مفتیٔ ہندستاں — جس سے سینے چاک ہیں کیا ذکرِ دامانِ وجیوب
محفلیں دنیائے اسلامی کی سب بے نور ہیں — ہیں اسیرِ غم شمال ومشرق ومغرب جنوب

ارتحالِ مفتیٔ اعظم کا سالِ عیسوی
حرفِ منقوطی سے لکھدو مہرِ رخشاں کا غروب
۱۹۵۲ء

میں نے پوچھا مفتیٔ اعظم کہاں — بولا رضواں ہیں وہ جنت میں مقیم
مجھ سے ہاتف نے کہا سالِ وفات — لکھدے، اب ہیں ساکنِ باغِ نعیم
۱۳۷۲ھ

ہدیۂ نیاز

از جناب مشہود احمد صاحب بہاریبی

(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۵ رجنوری ۵۳ء شمارہ ۵ جلد ۳۸)

انقلابِ آسماں نے کر دیا سینہ فگار
زندگی بے کیف ہو کر رہ گئی پھر ایک بار

صدمۂ جانکاہ سن کر قلبِ انساں رو اُٹھا
آنکھ خوں نابہ فشاں دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا
ہر مکاں تاریک ہر گھر بن گیا ماتم سرا
آہ دُنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا

رنگ کلیوں کا اڑا، گل آبدیدہ ہو گئے
اور خوش الحانِ چمن مصروفِ گریہ ہو گئے

محرمِ اسرارِ دین و پیکرِ خلقِ حسیں
رہنمائے ملک و ملت رونقِ بزمِ زمیں
رہبرِ دیں جانشینِ رحمۃ للعالمیں
مفتیٔ اعظم امیرِ ملت و سالارِ دیں

اب کہاں سے پائیں گے ہم آہ ایسا سربراہ
کون اب گم کردۂ منزل کو بتلائے گا راہ

ایک مفتی عالمِ قرآں ہم نے کھو دیا
اک مفکر صاحبِ ایماں ہم نے کھو دیا
اک چھلکتا ساغرِ عرفاں ہم نے کھو دیا
آہ دُنیا کا عظیم انسان ہم نے کھو دیا

ایک دو غم ہوں اگر تو ماتم و گریا کریں
پے بہ پے صدمے مقدر ہو چکے ہیں کیا کریں

آہ! تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب

از مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی

(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۶ جنوری ۵۳ء شمارہ ۶ جلد ۳۸)

جامع مسجد کے پلیٹ فارم پر ملک کے ممتاز علماء و مشائخ کا اجتماع تھا اور ہر شخص حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اپنے احساسات رنج و الم کا اظہار کر رہا تھا۔

اس اجتماع میں مفتی اعظم کی علمی اور دینی خدمات پر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی روح پر فتوح کے لئے زیادہ سے زیادہ مالی اور بدنی ایصالِ ثواب کریں۔

جو حضرات خود علوم اسلامی کے ماہر تھے، حدیث و فقہ کے فاضل تھے، ادب و کلام کے استاد تھے، تصوف و احسان کے امام تھے، جنگِ آزادی کے جاں باز مجاہد تھے، ان کا مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر یہ کہنا کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات سے ہم خدام علم کی کمر ٹوٹ گئی، کچھ کم اثر انگیز نہ تھا۔

مجمع پر سکوت طاری تھا، لوگوں کی آنکھیں نمناک تھیں، ہر شخص غم میں سر جھکائے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔

جلسہ کے بعد جب میں جامع مسجد سے باہر نکلا تو دو نوعمر لڑکے آپس میں یہ گفتگو کرتے سنائی دیئے :۔

"تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے نا! یہ اس کا جلسہ تھا"

ان الفاظ نے میرے دل و دماغ پر وہ اثر کیا جو جلسہ کی پُرسوز تقریریں بھی نہ کر سکیں ۔۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ حضرت مفتی اعظم کی وفات سے خواص و عوام کا ہر طبقہ متاثر ہوا ہے۔ اور حضرت مفتی اعظم اُن گنے چنے اکابر علم و فضل میں سے ہیں جن کی جدائی نے صرف بڑوں کو ہی مبتلائے غم نہیں کیا بلکہ چھوٹے بھی انکی جدائی میں سوگوار ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا :۔

سنا جناب نے! اگر محدثین ایک بے بدل محدث پر آنسو بہا رہے ہیں۔ اگر ارباب فقہ، فقہ اسلامی کے ایک مجتہد کی رحلت پر ماتم کناں ہیں، اگر اربابِ سیاست ایک سیاسی مدبر کے انتقال پر اظہارِ رنج و غم کر رہے ہیں، اگر جنگِ آزادی کے سپاہی ایک مجاہدِ وطن کی محرومی پر کف افسوس مل رہے ہیں تو ملت کے نونہال بھی یہ کہتے ہوئے جا رہے ہیں :۔

"تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا"

آج جس طرح فقہ و حدیث کے حلقوں اور تفسیر و کلام کی محفلوں پر حضرت مفتی اعظم کی وفات حسرت آیات سے رنج و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں تو اسی طرح ان مدرسوں اور مکتبوں میں بھی مفتی اعظم کا سوگ منایا جا رہا ہے، جہاں ملت کے نونہال تعلیم الاسلام جیسی بے مثال کتاب پڑھ کر اپنے دین و ایمان کو استوار کر رہے ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات

از مولانا قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی

(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۶ جنوری ۵۳ء شمارہ ۶ جلد ۳۸)

سدھارے خلد کو مفتی اعظم — جو تھے مقبول و منظور الٰہی

ہوئی مجھ کو جو فکر سال رحلت — کہا ہاتف نے ۔ مغفور الٰہی

۱۳۷۲ھ

وما کان قیس هلکہ هلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تهدما

(سہ روزہ جمہور علی گڈھ مورخہ ۶ و ۱۶ جنوری ۵۳ء شمارہ ۲۹۱ جلد ۴)

مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا حادثہ رحلت مذکورہ بالا شعر کا صحیح مصداق ہے ۔ مفتی صاحبؒ صرف ایک عالم و مفتی ہی ہوتے تو صبر کیا جا سکتا تھا کہ ابھی ہندوستان عالموں اور مفتیوں سے خالی نہیں ۔ وہ صرف سیاستداں اور میدان آزادی کے مجاہد ہوتے تب بھی کوئی زیادہ افسوس نہ تھا کہ ملک میں ابھی بہت بڑے بڑے مجاہد و بہادر موجود ہیں جو اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گذار چکے ہیں ۔ مفتی صاحب صحیح طور پر

لیس علی اللہ بمستبعدٍ — ان یجمع العالم فی واحدٍ

کے مصداق تھے ۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو جوانی ہی میں ملک کے مشاہیر کی صف اول میں شمار ہونے لگے تھے ۔ وہ جہاں عالم و مفتی تھے وہاں مقنن و سیاست داں اور کاروانِ آزادی کے قافلہ سالار بھی تھے ۔ ان کی زندگی سیاست کی "ابجد" سے نہیں بلکہ "ضظغ" سے شروع ہوئی تھی ۔ وہ سیاست میں قدم رکھتے ہی اپنی فطری صلاحیت و لیاقت کی بنا پر اس کے ذروۂ اعلیٰ پر پہنچ چکے تھے ۔

ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں کے تاثرات سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب کیا تھے ۔ اور ملک کے اعلیٰ سیاستدانوں اور رہنماؤں کے دل میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی ۔ ہندوستان و پاکستان میں جس طرح مرحوم کا ماتم کیا گیا ہے اس سے بھی انکی ہمہ گیر شخصیت کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے ، اللہ تعالیٰ انکو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے ۔ آمین ۔

آہ! مفتی اعظم

از مولانا محمد عمر خاں صاحب ثمر چھتاروی مدیر جمہور علی گڑھ

(روزنامہ جمہور علی گڑھ مورخہ ۶ و ۱۶ جنوری ۵۳ء شمارہ ۱ و ۲ جلد ۴)

اک شریعت کا مبلغ اک فقیہہ باکمال
ناخن تدبیر سے کرتا تھا حل مشکل سوال

پیکرِ حق و صداقت، حریت کا پیشوا
جنگِ آزادی کا ہیرو اور وطن کا ناخدا

مسند و منبر کی زینت شارحِ عالیجناب
درحقیقت جس کو کہیئے اک درخشاں آفتاب

آہ وہ مفتیٔ اعظم وہ محدث بے مثال
آہ عالم باعمل اور مخزنِ علم و کمال

ملت اسلامیہ کا آہ روشن ماہتاب
علم و دانش میں نہ تھا جس کا زمانے میں جواب

ظاہر و باطن تھا جس کا مشعل راہ ھدی
درس دیں جس کا ہمیشہ سے رہا اک مشغلہ

صورت و سیرت میں یکتا تھا جو صد رشک ملک
جس کا ثانی مل نہیں سکتا زمیں سے تا فلک

جس کی حق گوئی کی شہرت از زمین تا آسماں
مضطرب اس کیلئے ہے آج یہ سارا جہاں

جس کے دم سے تھی منور مجلس علم و ہنر
چھوڑ کر دنیا کو جنت میں ہوا وہ جلوہ گر

ناز کرتا تھا زمانہ جس کی ذاتِ پاک پر
سوگیا مرقد میں جاکر اب وہ فرشِ خاک پر

عظمتِ اسلاف کی زندہ نشانی بجھ گئی
زہد و تقویٰ اور شرافت کی جوانی بجھ گئی

آج میدانِ سیاست ہے بغیر اس کے اداس
زلزلہ نے مرگ کے ڈھادی تدبر کی اساس

کیوں نہ ہو جمعیۃ خاطر ملول و بے قرار
ہر کس و ناکس وطن کا ہے بچشم اشکبار

رنج و غم حد سے زیادہ اے ثمر بے فائدہ
بس مقامِ صبر ہے کیسا گلہ کس کا گلہ

مفتی اعظم کی وفات

(نقیب پھلواری شریف مورخہ ۳ جنوری ۵۳ء شمارہ ۵ جلد ۲۱)

مفتی اعظم ہند حضرت علامہ محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تین چار مہینے علیل رہ کر ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو رات کے دس بج کر ۲۵ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی اعظم کا حادثہ انتقال ایک عظیم ترین حادثہ ہے، جو مسلمانوں کو پیش آیا ہے ۔ حضرت مفتی اعظم کتاب و سنت کے ماہر، فقیہہ اعظم اور ابوحنیفہ وقت تھے ۔ علوم دینیہ کے ساتھ سیاست حاضرہ کے بڑے ماہر نہایت جلیل القدر مفکر اور صائب الرائے تھے ۔ آزادی ہند کے مجاہدین کی صف اول سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے لئے کئی بار جیل بھی گئے ۔ اس وقت تو سیاست سے کنارہ کش تھے ۔

آزادی ہند کے موقعہ پر جب سیاسیئین کسی تجویز پر متفق نہیں ہوتے تھے، اور کانفرنسوں کے افتراق کے ساتھ ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا اس وقت حضرت مفتی صاحب ہی کی اصابت رائے اور تدبر عقدہ کو حل کیا کرتی تھی اور سیاسیئین کا مختلف گروپ حضرت مفتی صاحب کی تجویزوں کو خوشی کے ساتھ منظور کر لیا کرتا تھا ۔ اب ایسی مجلسوں کے شرکا کم ہی رہ گئے ہیں لیکن جو ہیں وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں ۔

حضرت مفتی اعظم ۱۹۱۹ء سے بیس سال تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے اور آپ ہی کی صدارت میں جمعیۃ علماء نے منازل ترقی طے کئے ۔

حضرت مفتی صاحب نے تقریباً ساٹھ سال قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم دی اور فتوے دیئے ۔ آپ کے فتاوے کی تعداد کئی لاکھ ہوگی ۔ حضرت مفتی صاحب نے پوری زندگی علوم دینیہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں گذاری ۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے افسوس ہے کہ اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا ۔ اور حضرت مفتی صاحب کا حادثہ وفات ملت کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ عزوجل سے دعاء ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے ۔ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس عطا فرمائے ۔ مسلمانوں کو حضرت مفتی صاحب کا کوئی جانشین عطا فرمائے اور حضرت کے متعلقین اور تمام مسلمانوں کو صبر جمیل کی توفیق دے ۔

خانۂ علم بے چراغ ہوا

از سید عزیز حسن بقائی مدیر ہفتہ وار حریت، دہلی

(مورخہ ۷ جنوری ۵۳ء شمارہ ۱ جلد ۲۸)

۳۱ دسمبر کی رات کو حضرت علامہ محمد کفایت اللہ مفتی اعظم ہند نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

یہ دنیا فانی ہے۔ جو آیا ہے اسے جلد یا بدیر جانا ہی پڑتا ہے۔ اسلئے حضرت مفتی اعظم بھی اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔ لیکن بعض افراد کی موت طبعی ہونے کے باوجود اسقدر اندوہناک ہوتی ہے کہ اس کا اثر مرنے والے کی چہار دیواری سے نکل کر محلہ، حلقہ، شہر اور پوری اسلامی دنیا پر پڑتا ہے۔ اور حضرت مفتی اعظم مرحوم کی آہ کہ ان کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم لرزتا ہے، بھی اسی قسم کی موت تھی۔

حضرت مفتی اعظم کی موت علم کی موت ہے۔ شرافت کی موت ہے۔ دیانت کی موت ہے۔ جرأت و بے باکی، سنجیدگی و علم کی موت ہے۔ اخلاص و رواداری، محبت و درگذر کی موت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ موت کی خبر سنتے ہی سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ بغیر کسی تحریک کے مسلم علاقوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ اور غم واندوہ کی گھٹا چھا گئی۔ ہر شخص نے خواہ وہ جمعیۃ علماء کا مخالف ہو یا موافق، حضرت مفتی اعظم کا غم منایا۔ اور اس کمی کو محسوس کیا جو حضرت مفتی اعظم کے رحلت فرمانے سے پیش آگئی۔

اس دہلی نے حضرت خواجہ قطب الدینؒ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت خواجہ باقی باللہؒ حضرت شیخ کلیم اللہؒ حضرت شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ جیسے آفتاب طریقت اور ماہتاب شریعت کے جنازے دیکھے ہوں گے۔ مگر یکم جنوری ۵۳ءکو مٹی ہوئی دلّی، لٹی ہوئی دلّی کی سوگوار سڑکوں پر جس شاہانہ عظمت وشان سے مفتی اعظم ہند کا مثالی جنازہ دیکھا اس کی نظیر تاریخ میں ناپید ہے۔

دہلی شاہوں کی نگری ہے۔ اس نے سینکڑوں بادشاہوں کے جلوس دیکھے ہوں گے۔ مگر جو عوامی شان، علمی عظمت حضرت مفتی اعظم کے جنازہ کی تھی وہ شاید ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آئی ہو۔

حضرت مفتی اعظمؒ شاہجہاں پور کے باشندے تھے۔ لیکن پچاس سال سے دہلی میں مقیم ہو کر دہلوی بن گئے تھے وہ دہلی کی سماجی زندگی میں ایک خاص مقام کے مالک تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں تھے اور بڑے قوم پرور تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کے شاگرد اور صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ فقہ اسلامی پر اتنا ہی عبور تھا جتنا حضرت امام اعظمؒ کو ہوگا۔ حدیث کے اتنے ہی ماہر تھے جتنے اب سے ہزار سال پہلے کے عالم ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیانت علمی میں ضرب المثل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب صدر جمعیۃ علماء ہند کی حیثیت سے مصر کی موتمر اسلامی میں شریک ہونے کے لئے مصر تشریف لے گئے تو شیخ ازہر اور مفتی مصر حضرت علامہ مصطفیٰ المراغی خود ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر آئے۔ اور ایک ہزار روپے ماہوار پر جامعہ ازہر میں پوسٹ کی پیش کش کی[۱] کیونکہ حضرت مفتی اعظم کی علمی شہرت ان سے پہلے مصر پہنچ چکی تھی لیکن حضرتؒ نے اس پیش کش کو بصد شکریہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مدرسہ امینیہ کے ۶۰ روپے ماہوار کو ایک ہزار روپے پر ترجیح دی۔ اور

---

[۱] یہ بات ثبوت طلب ہے۔ (واصف)

پوری زندگی اس قلیل تنخواہ میں اس شان سے گذار دی کہ کبھی جمعیتہ کا پانی بھی نہیں پیا۔ جمعیتہ کے دفتر کا کھانا نہ کھایا۔ اگر کھانے کا وقت ہوگیا۔ تو اپنی جیب سے روپیہ نکال کر بازار سے کھانا منگوا کر اپنے ساتھ ایک دو کو کھلا دیا۔ مگر آپ کے عہدہ صدارت کے بعد جمعیتہ کے مہمان خانہ کی وسعت کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ ایرا غیرا نتھو خیرا مال مفت دل بے رحم پر ہاتھ دبتا ہے۔

ان کے ہاں کبھی بازاری آدمی لفنگے جمع نہیں ہوئے۔ پارٹی بازی سے سخت نفرت تھی۔ ان کے ہاں آنے والوں کے تین درجے تھے۔ ایک تو وہ جن کو دروازے کے کواڑ بھیڑ کر کے چلتا کر دیا۔ دوسرے جن کو ڈیوڑھی میں بچھے ہوئے بنچ پر بٹھا کر بات چیت کی۔ تیسرے وہ لوگ تھے جن کو اپنے ساتھ اوپر لے جا کر دل جمعی سے بات کرتے تھے۔ میرا شمار ان لوگوں میں تھا جن کو وہ اپنے بالاخانہ پہلے جا کر بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی چائے بھی پلایا کرتے تھے۔ (میں چائے نہیں پیتا مگر حضرت کی چائے سے کبھی انکار ہی نہیں کیا)

ایک روز مجھے میرے آفس سے بلایا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولوی احمد سعید، مسٹر ہلال احمد زبیری ایڈیٹر انصاری اور مسٹر جعفری اڈیٹر ملت بھی موجود ہیں۔

اس زمانہ میں ایک روزانہ اخبار میں حضرت کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے جس میں مدرسہ امینیہ کے حسابات کو مشتبہ بنایا جا رہا تھا۔ حضرت نے حسابات کے رجسٹر سامنے رکھے۔ اور خواہش کی کہ حساب سمجھ لو۔ کیونکہ اس سے مدرسہ کی شہرت کو اور میری دیانت کو نقصان پہونچتا ہے۔ میں نے کہا:-

"حضرت! حسابات تو وہ دیکھے جس کو شبہ ہو۔ کیا آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں سے کسی کو آپ کی دیانت پر شبہ ہے"

نیچی نظر کر کے مسکرائے اور فرمایا:-

"تو پھر جو صاحب مخالفانہ مضامین لکھ رہے ہیں ان کو لاکر دکھا دیجئے"

میں نے عرض کیا:-

"میری رائے اگر آپ قبول فرمالیں تو یہ قصہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کر لوں گا۔ ان میں یہ ہمت نہیں کہ وہ میرے کہنے کو ٹالیں۔ آپ بالکل مطمئن رہئے۔ ہم میں سے کسی کو اس پر لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ میں صفائی سے کہدوں گا کہ یا تو لکھنا بند کرو۔ ورنہ مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ان میں یہ دم نہیں ہے کہ وہ مجھ سے لڑ سکیں"

سب نے میری تجویز کو پسند کیا۔ میں نے گھر پر آتے ہی ایڈیٹر صاحب کو بلایا۔ اور ان سے کہا:-

"عزیزم! حضرت مفتی صاحب کے خلاف لکھنا بند کر دو۔ ورنہ کل سے میں جواب دینا شروع کروں گا۔

اگر حضرت کی دیانت پر کچھ بھی شبہ ہے تو میرے ساتھ چلو۔ حساب دیکھ لو۔ یہ ہرگز گوارا نہیں کیا جائے گا کہ حضرت مفتی صاحب اور مدرسہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے۔"

ایڈیٹر صاحب بھوچکا رہ گئے۔ اور انہوں نے ایک لمبی تقریر معذرت کی کر ڈالی۔ اور حقیقت حال بیان کر کے لکھے ہوئے مضمون کو روک دینے کا وعدہ کیا۔

میں دوسرے روز حاضر خدمت ہوا۔ اور عرض کیا :۔

"میرا گمان ٹھیک نکلا، ان کو ورغلایا گیا تھا۔ آپ کے مدرسہ کے ایک مدرس کی جانب سے مگر جو مضامین چھپ گئے۔ ان پر ان کو ندامت ہے۔ آئندہ ایک لفظ نہیں چھپے گا۔ بالکل مطمئن رہیئے"

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا :۔ "کہیں دھوکہ نہ ہو"۔ میں نے عرض کیا :۔ "وہ میری دوستی اور دشمنی دونوں سے واقف ہیں۔ ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ میری دشمنی مول لیں"

اس کے بعد میں رخصت ہوا۔ میرے لئے یہ معمولی بات تھی۔ میں اس کو بھول گیا۔ مگر حضرت مفتی اعظمؒ اس کو نہ بھولے۔

نہایت صفائی پسند تھے۔ بہت صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ ہر بات میں سلیقہ تھا۔ سادہ غذا استعمال کرتے تھے۔ اور ان تمام برائیوں سے علیحدہ تھے۔ جو چودھویں صدی کے ملاؤں کی خصوصیات ہیں۔ اپنی علمی شان کے منافی کوئی حرکت نہ کرتے تھے۔

ان کے صحیح قدر شناس حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ اور حضرت ڈاکٹر انصاریؒ تھے۔ وہی ان کو خلافت کی تحریک میں سیاست میں لائے۔ اصابت رائے پر اتنا اعتماد تھا کہ جو رائے قائم کر لی۔ اس سے دنیا کی کوئی طاقت انکو ہلا نہیں سکتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد علیؒ سے رائے کا اختلاف ہوا۔ پوری دیانت اور جرأت سے آپ نے مولانا محمد علیؒ کی بے پناہ خطابت اور لا انتہا اثر و رسوخ کا مقابلہ کیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اور کسی کا خوف ان کو جھکا نہیں سکتا تھا۔ وہ ڈبل روٹی نہ تھے۔ آہنی عزم اور استقامت کے مالک تھے۔ پوری زندگی کسی کے روپے، علم، اثر سے مرعوب نہ ہوئے۔

دو مرتبہ کانگریس کی تحریک میں قید ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے بے حد متاثر تھے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا ایسا صدمہ تھا کہ منہ کو چپ لگ گئی تھی لیکن دماغ سو فیصدی درست کام کرتا رہا۔

امرت بازار پتریکا کے جلسہ کی صدارت کے لئے مولوی حفظ الرحمٰن اور مولوی احمد سعید ان کو اپنی دوکان چمکانے کے لئے لائے تو انھوں نے صفائی سے کہا :۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہی خطبہ صدارت میں کہوں گا۔ چاہے وہ تمہاری مصلحتوں کے

موافق ہو یا مخالف "

دہلی والوں نے عرصہ سے مفتی صاحب کو نہ سنا تھا۔ فسادات کے زمانہ میں بھی وہ خاموش رہے مگر اس مرتبہ بکثرت جمع ہوئے لیکن حضرت مفتی صاحب سے بہت التجا کی گئی کہ

"آپ خدا کے لئے خاموش رہیں ورنہ دیوبند کو نقصان پہنچ جائے گا" لے

ان کو دیوبند کا مفاد بہت عزیز تھا تقسیم کے بعد پاکستان میں ان کو ایک بڑے سرکاری منصب پر بلایا گیا مگر آپ نے انکار کر دیا۔

بہر حال ایک عظیم المرتبت شخصیت جس کا کوئی بیک گراونڈ نہ تھا۔ ایک بہت بلند مرتبہ علمی کا کوئی۔ اس نے اپنی زندگی خود بنائی۔ اور اپنے لئے اعلیٰ علمی طبقوں میں جگہ پیدا کی۔ اور اس کی حفاظت بھی کی اور انتہائی عسرت کی حالت میں زندگی گذار دی۔ اور دنیا سے سرخ رو اپنے رب کے پاس پہنچ گئے۔ اور افسوس ہے کہ اپنی خصوصیات اپنے ساتھ لے گئے۔ کوئی ان کا جانشین نہیں۔

۱۲ بجے جنازہ گھر سے چلا۔ ایک بجے پریڈ گراؤنڈ میں پہونچا۔ دو بجے ایک لاکھ مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی، اور میت درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بلند دروازہ کے پاس دفن کی گئی۔ مرحوم نے اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ اپنے یادگار ۲ بیٹیاں، ۲ بیٹے چھوڑے ہیں۔

میں مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی حفیظ الرحمان اور چھوٹے صاحبزادے خلیل الرحمٰن صاحب اور محترمہ بیگم صاحبہ سے اور مرحوم کی بچیوں سے صمیم قلب کے ساتھ تعزیت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق جل مجدہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ❋

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(ہفتہ وار بیباک سہارنپور مورخہ ۷ جنوری ۵۳ء شمارہ ۳۹ جلد ۹)

عین اُس وقت جب کہ نئے سال کے آغاز میں پورے دو گھنٹے بھی باقی نہ تھے، دہلی کی فضاؤں سے ایک آفتاب علم و حکمت غائب ہو گیا۔ اور وہ روشنی جو نصف صدی سے زائد مدت تک زندگی کے بہترین گوشوں کو منور کر رہی تھی۔ دفعتہً نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی! آہ! وہ علم و دانائی تدبر و تفکر اور تقویٰ و پرہیز گاری کا پیکر مثالی، جسے مفتی اعظم علامہ محمد کفایت اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے پوری دنیا اسلام

لے مجھے اس گفتگو کا علم نہیں۔ (واصف)

اور ہندوستان کے تمام نمائندگان اخلاق وسیاست کی بصیرت کی نگاہیں بخوبی جانتی اور سمجھتی ہیں۔ اور جس کی صداقت شعاری وایثار پیشگی پر دیانت وامانت کا ضمیر ہمیشہ بے لاگ شہادتیں پیش کرتا رہا ہے۔

حضرت مفتئ اعظم جہاں علوم دینیہ میں پوری دنیائے اسلام کے لئے ایک ممتاز اور قائدانہ حیثیت رکھتے تھے، وہاں ان کی ذاتِ گرامی پر حریت واستقلال کی تحریکات کو بھی انتہائی فخر تھا، وہ ہندوستان میں علم و اخلاق کے بھی بلند مرتبہ ترجمان تھے۔ اور اس کی تحریکِ آزادی کے بھی بیدار مغز، بہادر اور بیباک سپہ سالار تھے۔ ان کے سینے میں ہندوستان کی غلامی کے خلاف جذبات کا جو دریا موجزن رہتا تھا اس کا محرک سیاسی اقتدار کے حصول کی خواہشیں اور اقتصادی برتری کی تمنائیں نہ تھیں۔ وہ انسانیت کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھنا چاہتے تھے، ان کا پاک ضمیر انسانوں کے لئے انسانوں کی غلامی کی گندگی کا تصور بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اور انھیں پاکیزہ ترین محرکات نے انھیں عمل و کردار کے میدانوں میں ہمیشہ فائز و کامیاب رکھا، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی جدوجہد آزادی کے نتائج کو صورتاً بھی نمایاں دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور یہ انسانی فطرت کے منافی بھی نہیں لیکن ایک انتہائی حق پرست اور مخلص انسان کی حیثیت سے اعلاء کلمۃ الحق ہی اُن کا حقیقی مقصد تھا۔ اور اس مقصد کے حصول میں وہ کبھی اور کسی مرحلہ پر بھی ناکام نہیں رہے۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

کانگریس کی تاسیس[۱] میں ان کی زندگی کا بہترین سرمایہ صرف ہوا، اُن کے منحنی اور انتہائی ضعیف ولاغر جسم کو متعدد بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید وبند کے فرائض ادا کرنا پڑے، اس لئے نہیں کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہوگا، تو مسندِ اقتدار پر انھیں بھی جلوہ آرائیوں کے مواقع نصیب ہونگے بلکہ محض اس لئے کہ غلامی کی لعنت کی موجودگی ان کے نزدیک انسانیت کی ایک ناقابلِ برداشت توہین تھی، اور اُن کی روح کی یہ خواہش تھی کہ بلا امتیاز مذہب وملت ہندوستان کا ہر باشندہ بجز خدائے بزرگ و برتر کی بندگی وغلامی کے اور کسی طاقت کا غلام نہ رہے۔ اور ہندوستان میں انسانی مجد وشرف کا پرچم ہر سمت اور ہر مذہب وملت کے سروں پر لہراتا ہوا نظر آئے۔ مرحوم اپنے ان بلند وبالا مقاصد میں از اول تا آخر یقیناً کامیاب رہے۔ اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے صورتاً بھی اپنی قربانیوں کے ثمرات کا مشاہدہ کرلیا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل اس موقع پر نہ پوچھئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو خون میں نہاتا ہوا آفتابِ آزادی اُن کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا اور انھوں نے دہلی ہی کے گلی کوچوں، میدانوں اور بڑے بڑے بازاروں میں اس "انسانیت" کا مشاہدہ کرلیا جس کی تمنا ؤں میں اُن کی زندگی ہمیشہ وقف رہی!

---

[۱] تاسیس کا لفظ یہاں بے موقع ہے۔ (واصف)

آزادی کی مسرتیں کانگریسی ہندوستان کے چپہ چپہ پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُسے حصول آزادی کے بعد تحریک آزادی کے اس مردِ مجاہد کے چہرے پر بھی کوئی حقیقی مسکراہٹ نظر آئی؟ کیوں نہیں آئی؟ یہ ضمیرِ انسانی ہی بتا سکتا ہے۔

بہرحال ہم بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کی قبر کو اپنی نوازشوں اور انوار و برکات سے بھرپور فرما دے۔ اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اُن کے بتائے ہوئے صداقت و حق پرستی کے راستے پر پورے یقین کے ساتھ چلتے رہیں۔

مفتی کفایت اللہ مرحوم

(آفاق لاہور مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۵۳ء)

ہندوستان کے معزز عالم مفتی کفایت اللہ کی وفات کی خبر پاکستان کے مختلف حلقوں میں رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی ہے۔ مولانا موصوف جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر تھے[1]، اور اس حیثیت سے انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ مفتی کفایت اللہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اس برعظیم کے علماء میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے فقہ، حدیث اور تفسیر کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اس برعظیم کی گذشتہ سیاسی تحریکات میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اپنی زندگی انگریزی سامراج کے خلاف جارحہ جہاد کے لئے وقف کردی، اس سلسلہ میں انہیں بارہا قید و بند کے مصائب سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

ایک عالم دین کی رحلت بڑا سانحہ ہوا کرتی ہے۔ ہم اس سانحہ پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں مشیت ایزدی بہرصورت اٹل ہے۔

مولانا مفتی کفایت اللہ کا انتقال

(تسنیم کراچی مورخہ ۹ رجنوری ۱۹۵۳ء)

یہ خبر پاکستان اور بھارت بلکہ پوری دنیائے اسلام میں عمیق رنج و اندوہ کے سنی گئی ہوگی کہ متحدہ ہند کے مشہور عالم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جوارِ رحمت الٰہی میں پناہ لے لی۔

---

[1] وفات کے وقت صدر نہیں تھے۔ (واصف)

مفتی صاحب مرحوم علم وتقویٰ کے اعتبار سے پوری دنیائے اسلام کے دینی حلقوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی نظر علوم فقہ میں نہایت وسیع تھی۔ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ بعد میں دہلی چلے آئے اور اپنے علم تقویٰ اور اصابت رائے کے باعث طبقہ علماء میں ممتاز ترین مقام پر فائز ہوگئے جرأت و ہمت کے اعتبار سے بھی وہ صف اول میں تھے اور زندگی بھر جب تک کہ ان کی صحت نے مساعدت کی وہ جمعیتہ العلمائے ہند کے صدر رہے[1]

مفتی صاحب مرحوم نے خلافت اور آزادیٔ ہند کی تحریک میں پورا حصہ لیا۔ اور قید و بند کی صعوبتیں بھی ان کی راہ نہ روک سکیں۔ نہایت سادہ مزاج، مرنجاں مرنج اور بے غرض آدمی تھے۔ ان کے انتقال سے علم کی جو مسند خالی ہوئی ہے۔ اس کو پُر کرنا مدتوں تک مشکل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور انکو صالحین امت میں شمار فرمائے۔

مفتی اعظمؒ

(سہ روزہ مدینہ بجنور مورخہ ۹ جنوری ۵۳ءشمارہ ۳ جلد ۴۲)

ایسی ہستیاں شاذونادر ہی پیدا ہوتی ہیں جن کی موت کے بعد دنیا اپنے آپ کو یتیم تصور کرنے لگتی ہے۔ ایسی شخصیتیں نہ معلوم کس مٹی سے ڈھالی جاتی ہیں کہ علم وعمل کی مسند پر شمع روشن بن کر جگمگاتی ہیں۔ اور جب یہ شمعیں گل ہوجاتی ہیں تو ایک عالم کی آنکھوں کے سامنے اندھیاریاں پھیل جاتی ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حقیقت یہ ہے کہ حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ کی وفات حسرت آیات نے خادمان علم کی کمر توڑدی ہے۔ آج دنیائے اسلام اپنے آپ کو یتیم پاتی ہے اور فقہ وشریعت کی مسند سونی ہوگئی ہے۔

حضرت العلامہ کی موت ایک ایسی موت ہے جس کے ماتم کے لئے الفاظ نہیں، جس کو رونے کے لئے آنسو نہیں اور جس کے غم واندوہ کے اظہار کے لئے قلم کو یارا نہیں۔ موت ایک حقیقت ابدی ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ جس نے وجود کا جامہ پہنا ایک نہ ایک دن اس کا یہ جامہ چاک ہوا۔ البتہ کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی جدائی کا صدمہ ان کے گھر والوں سے زیادہ باہر کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ

---

[1] وفات کے وقت صدر نہیں تھے۔ (واصف)

ایسوں ہی کی زندگی زندگی اور موت موت ہوتی ہے ؎

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

جنگ آزادی کا رہنما، آئینی ودستوری سیاسیات کا مدبر ومفکر، علم کے بحر ناپیدا کنار کا شناور، رسم و راہ عمل کا رمز آشنا۔ تقوٰی وتقدس کا پیکر روحانی، اس جامع الصفات کا دوسرا نام تھا کفایت اللہ! وہ کفایت اللہ جس کی علمی وفقہی بصیرت نے صرف ہندوستان کے حدود ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان حدود سے باہر نکل کر اسلامی دنیا سے خراج عقیدت وصول کیا۔ اور قاہرہ میں علماء وفضلاء کے ایک بین الاقوامی علمی وسیاسی مجمع کی رہنمائی کی — آہ! وہ کفایت اللہ، وہ فقیہ بے مثال، حق وصداقت کا وہ پیکر، حریت کا وہ پیشوا، حب الوطنی کا وہ جذبۂ مجسم آج ہم میں نہیں ہے۔ آج ساری دنیائے اسلام میں ماتم بپا ہے ——— یہ ماتم یقینی اور ناگزیر ہے۔ دین مبین کا ہر پیرو اس میں شریک ہے۔ دنیائے علم وعمل میں آہ ونالہ کا شور ہے، قوم پرستوں کی محفل میں اُداسی چھائی ہوئی ہے، کیونکہ علم وکمال کا خزانہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے لوٹ لیا، جنگ آزادی کے سورما پر صیاد اجل نے تیر چلایا، اور عظمت اسلاف کی زندہ نشانی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سوگئی ——— لیکن کیا ان کی زندگی ہمارے سامنے نہیں، کیا ان کی حق پسندی اور صداقت دوستی ہمارے لئے پیغام عمل نہیں، کیا ان کا مشن بھی ان کی زندگی مستعار کی طرح عارضی تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندۂ جاوید ہیں۔ ان کا مقصد اب بھی زندہ ہے اور ان کی اسپرٹ غیر فانی ہے۔ اس لئے ہمیں ان کے ماتم سے جلد از جلد فارغ ہو کر علم ودین کی اشاعت وتبلیغ کا بیڑا اٹھانا چاہئے۔ یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جس خدا کے دین وشریعت کے وہ مبلغ تھے وہ خدا ہمیں اپنی طرف بُلا رہا ہے، وہ دین قیّم آج بھی ہماری تغافل شعاریوں پر نوحہ کناں ہے۔ کوچہ چیلاں (دہلی) میں جس خدا کے چھوٹے سے گھر کے منبر کی وہ زینت تھے[1] اسی خدا کی ہزاروں مسجدیں ہماری بے عملی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں جس علم دین کے ایک چھوٹے سے مدرسے (مدرسۂ امینیہ) سے وہ نبی خاتمؐ کی شریعت کا پیغام دیا کرتے تھے۔ اسی علم دین کے سینکڑوں گہوارے آج نزع کے عالم میں ہیں پس ماتم کرنے والوں کو اگر واقعی مفتی اعظم کی جدائی کا صدمہ ہے تو اُن کی یادگار اسی صورت میں قائم کی جاسکتی ہے کہ اُنکے مقصد اور اُن کے مشن کو سمجھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اسکو آگے بڑھایا جائے۔ اسی ایک بات میں مفتی صاحب سے ہمارے تعلق اور ہماری محبت کی آزمائش ہے۔

---

[1] اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کوچہ چیلاں کی مسجد میں خطیب یا امام تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ (واصف)

مفتی کفایت اللہ مرحوم

از مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح

(ہفتہ وار پیام مشرق دہلی مورخہ ۲۸ جون ۱۹۵۵ء بحوالہ اخبار چٹان لاہور)

ہندوستان کے علمائے کرام میں حضرت شیخ الہند کے بعد سیاسی ذکاوت اور نکتہ رسی میں مفتی صاحب مرحوم کا کوئی دوسرا حریف نہ تھا۔ اصابت رائے۔ معاملہ فہمی۔ آئینی موشگافیوں اور سیاسی تحریکات کی نبض شناسی میں مفتی صاحب گاندھی جی، موتی لال نہرو، قائد اعظم، پنڈت مالویہ۔ آزاد و انصاری اور پریذیڈنٹ پٹیل کی صف کے آدمی تھے۔ اسی صف اور انہی لوگوں میں بیٹھ کر انھوں نے بارہا اپنی بات منوائی۔ وہ انگریزی زبان اور اُس کے علوم سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی انگریز اور ہندو ذہنیت کا مکمل جواب تھے۔ اور ان کی ذہنی و فکری سطح اس معیار پر تھی جو ایک ماہر آئین کی ہو سکتی ہے۔ مفتی صاحب کانگریس کے صدر بھی بن سکتے تھے اور مسلم لیگ کے بھی۔ بشرطیکہ وہ شہرت پسندی، پارٹی بازی اور سیاست میں تھوڑی سی گندگی کی آمیزش کو قبول کر لیتے اور مصلحت کی چادر میں ضمیر کو لپیٹ سکتے۔ مفتی صاحب نے ہندوستانی سیاست کی اہم تحریکات اور معرکہ کے مسائل میں قائدانہ شرکت کرکے اور نہرو رپورٹ اور فارنگ کی رپورٹ تیار کرکے اپنی شخصیت کا کمال دنیا سے تسلیم کرا لیا تھا۔ مگر تھے وہ ایک پرانی وضع کے عالم دین ہی۔ یعنی مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس جس پر وہ ساری زندگی فائز رہے۔ ان کا لباس، ان کا رہن سہن۔ ان کا طرز زیست اور عادات و خصائل سب کچھ مجاہدانہ تھا۔ کوچہ چیلان کے ایک مکان میں رہنا۔ روزانہ بازار سے اپنے اور دوسروں کا سودا سلف خرید لانا۔ عربی کی مدرسانہ اور دینیات کی کتابوں کا درس دینا بس یہی ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ عربی ادب اور فقہ میں ان کو امام فن کا درجہ حاصل تھا۔ ان جیسا مفتی اب شاید ہی دنیا کو میسر آئے۔ مفتی صاحب کی بعض تصانیف ناشروں کے لئے گراں قدر آمدنی کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ مگر خدمت دین کے جذبے کے پیش نظر خود مفتی صاحب نے اپنی تصانیف کو اپنے لئے محفوظ نہیں کیا اور اس طرح لاکھوں روپے کی آمدنی سے دستبردار ہو گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے وہ دماغ بھی تھے اور سا کھ بھی۔ وہ سیاسی تعصب اور انتہا پسندی دونوں سے خالی تھے۔ اس لئے ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں بلکہ خود انگریز حکمرانوں تک کو ان کی سنجیدگی اور معقولیت کا اعتراف تھا۔

زندگی کے آخری برسوں میں وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا نقطۂ نظر نہ انتہا پسند، ہندو لیڈرشپ کو قبول تھا اور نہ علیحدگی پسند مسلم سیاستدانوں کو۔ وہ اگرچہ مشکل سے مشکل آئینی اور سیاسی اختلافات میں مصالحتی فارمولا پیش کرتے ہیں سند مانے جاتے تھے۔ مگر ۱۹۳۸ء کے بعد ایسی کوششوں کا زمانہ ختم

ہو چکا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد علماء میں سے وہ شخص جاتا رہا جس نے مدرسہ و مکتب کی تخلیق کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے معیار پہ پہنچا دیا تھا۔

قطعہ تاریخ وفات

از مولانا مفتی سید حفیظ الدین صاحب امام مسجد رنگریزاں - دہلی

(الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹؍جنوری ۱۹۵۳ء شمارہ ۱۹ ۔ جلد ۲۸)

آہ اے مفتی اعظم آہ - آہ　　گشت عالم از غمت در اضطراب

آہ اے علامۂ فرخندہ بخت　　آہ اے فہامۂ عالی جناب

آہ اے علامۂ فخرِ جہاں　　در غمت گریہ کناں ہر شیخ و شاب

موتِ عالم موت عالم راست شد　　مَاتَ خَیْرُ الْخَلْقِ ذُو فَصْلِ الْخِطَابْ

کُلُّ حَیٍّ ذَائِقٌ کَاسَ الْفَنَاء　　ھٰکَذَا الْمَسْطُوْرُ فِیْ اُمِّ الْکِتَابْ

قَدْ جَرَی الدَّمْعُ عَلٰی قَدْرِ الْاَذیٰ　　شَابَهَتْ اَجْفَانُنَا سَحَّ السَّحَابْ

اِنْ یَّکُنْ غَابَ عَنِ الدُّنْیَا فَفِیْ　　جَنَّۃِ الْمَاْوٰی لَهٗ اَعْلَی الْمَنَابْ

جملہ عالم تیرہ و تاریک شد　　شَمْسُنَا حَقًّا تَوَارَتْ بِالْحِجَابْ

ہاں سرِ بلد گو بہ پُر تائب بگو
مفتی ہندوستاں زعفراں مآب
۱۳ ۷۲ ھ

مفتی کفایت اللہ

(اداریہ ہندوستان ٹائمز مورخہ ۳؍جنوری ۱۹۵۳ء)

(ترجمہ از انگریزی)

سال گزشتہ کے آخری دن دہلی میں اپنی قدیم سکونت گاہ پر مفتی کفایت اللہ کی وفات ایک بہت بڑا المیہ ہے کیونکہ وہ اپنے اُس مُلک کو جس سے انھیں انتہائی محبت تھی اور جس کی انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں حسرت کے ساتھ خیرباد کہہ رہے تھے۔ مفتی صاحب مرحوم ایک جید عالم تھے۔ ان کی اعلیٰ علمی و

دینی قابلیت اور تفقہ فی الدین کی وجہ سے ان کے ارشادات اس قدر وزنی اور مستند تھے کہ مشرق وسطیٰ تک آپ کی شہرت پھیل گئی تھی مسلم رہنماؤں کے ایک عالمی اجتماع کی صدارت جو قاہرہ میں ہوا تھا آپ ہی نے کی تھی[1]۔ آپ کے علم و فضل اور تدبر سے صرف آپ کے ہم مذہب ہی فیضیاب نہیں ہوئے بلکہ اپنے وطن کی اعلیٰ اور ناقابل فراموش خدمات کی وجہ سے محبان وطن میں آپ کو وہ ممتاز اور درخشندہ مقام حاصل ہوا کہ اس کی روشنی سے دوسرے بھی مستفید ہوئے۔ آپ نے سیاست سے اجتناب کیا لیکن اُن ضروری سیاسی فرائض کو جو ہندوستانی شہری ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتے تھے کبھی پس پشت نہیں ڈالا انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے[2] ایک ہندوستانی سمجھا۔ نیز کبھی ان کے اس یقین میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہندوستانی قومیت کے لئے ایک بنیادی اصول ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے وقت سے دہلی میں آپ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے اگلے مورچوں پر لڑنے والے مرد مجاہد تھے۔ اور اسی شہر دہلی میں سنہ ۱۹۴۰ء میں آزاد مسلم کانفرنس کے پہلے اجلاس میں حضرت مفتی صاحب نے وہ مشہور قرارداد پیش کی تھی جس کا مقصد اس الزام کی تردید کرنا تھا کہ مسلمان آزادی کے خلاف ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ذات بابرکات ہی اُس دو قومی نظریہ کی ایک واضح تردید تھی جس کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم ہوا۔

سیاسی درجہ کے لحاظ سے آپ مرحوم حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے ہم پایہ تھے اور دینی طور پر مولانا آزاد کے۔ سیاسی اور روحانی ہر دو حیثیت سے مرحوم مفتی صاحب نے جو شہرت اور مقام حاصل کیا اور ملکی و قومی مفاد کے لئے جو خدمات حسنہ انھوں نے انجام دیں ان کے پیش نظر وہ اپنے پیچھے کئی ایک ناقابل فراموش یادیں چھوڑ گئے ہیں اور وہ نام پیدا کر گئے ہیں کہ ان کی یاد آتے ہی ہر ہندوستانی کا سر تعظیم و احترام میں جھک جایا کرے گا۔

---

[1] وہ اجتماع علی علوبہ پاشا کی صدارت میں ہوا تھا۔ مفتی صاحب کی کرسی صدر کانفرنس کے دائیں ہاتھ کی طرف رکھی گئی تھی۔ (واصف)

[2] حضرت مفتی صاحب کی کسی تحریر یا تقریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ برخلاف اس کے ان کا یہ نظریہ تھا کہ "مسلم پبلک کا اولین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے۔ اور پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی، یا عربی ایرانی چینی وغیرہ کے اصول کو لازم سمجھیں۔" (مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۱۷ء) اور آخر عمر تک آپ اسی نظریہ پر قائم رہے۔ (واصف)

نوحۂ غم

(از بشیر الدین صاحب عنبرؔ دہلوی)

رورہے ہیں مسلمان سارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

مومنوں کے دلوں کے سہارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

سیکڑوں سال کے بعد ایسا
دیدہ ور کوئی ہوتا ہے پیدا

جیسے تھے مفتی اعظم ہمارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

جو کہ رکھتے ہیں اُن سے عقیدت
آج ہے اُن کے دل پر قیامت

کیوں نہ ہوں لب پہ غم کے شرارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

خدمتِ خلق سے منھ نہ موڑا
دامنِ صبر بالکل نہ چھوڑا

دن غریبی کے ہنس کر گزارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

کیا کہوں مفتی اعظم کو کیا تھے
خاص پابندِ صبر و رضا تھے

تھے توکل پہ اُن کے گزارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

علم کا شمس بدلی میں آیا
اور اندھیرا زمانے میں چھایا

رہ گئے جھلملاتے ستارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

جب نمازِ جنازہ پڑھا کر
اور چلے لوگ میت اُٹھا کر

رو کے افسوس سے سب پکارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

کوئی بھی بیٹھے اُن کی جگہ پر
پر وہ خوبی نہ ہوگی میسّر

یاد آئیں گے جب یہ نظارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

یا خدا واسطہ آلِ حضرت
دیجو مرحوم ملت کو جنّت

بھیجو رحمتوں کے اشارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

جب وہ دُنیا سے رخصت ہوئے تھے
بدھ کا دن رات کے دس بجے تھے

رشتے ناطے ہوئے ختم سارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

چودہ تاریخ تو چاند کی تھی
سن ترپن یکم جنوری تھی

جب گئے قبر میں وہ اُتارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

خوش ہو جس سے کہ روحِ منور ۔ پڑھ کے تم مفتی اعظم کو عنبر
بخشو قرآن کے تیس پارے
مفتی اعظم جہاں سے سدھارے

آہ مفتی اعظم ہند!

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدیر رسالہ برہان دہلی

(بابت جنوری ۵۳ء)

وا حسرتا! ۳۱ دسمبر ۵۲ء کو شب کے ساڑھے دس بجے یعنی ٹھیک اس وقت جبکہ ایک سال شمسی اپنی حیاتِ دوازدہ ماہ کی مقررہ مدت پوری کر کے ہمیشہ کے لئے گوشۂ عدم میں آسودۂ سکون ہو جانے کی تیاری کر رہا تھا علم و عمل کے آسمان کا ایک آفتابِ عالم تاب غروب ہو گیا۔ یعنی حضرتنا الاستاذ مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ دہلوی نے اسی سال کی لگ بھگ عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر جان جان آفرین کے سپرد کی! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کا وجودِ گرامی اپنی چند در چند علمی و عملی خوبیوں اور گوناگوں دماغی و اخلاقی کمالات کے باعث صرف ہندوستان اور پاکستان کا نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کا ایک ایسا متاعِ گراں مایہ اور سرمایہ بلند پایہ تھا کہ آج اس کے اٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم اور اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضرت مرحوم خود جلیل القدر بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی صحبت میں دو چار لمحے گزار کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قدرت نے ان میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور ان کے فضائل و کمالات کچھ اس طرح بیک وقت جمع کر دئے تھے کہ ان کی ہستی "اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم" کا مصداق بن گئی تھی۔ وہ ایک طرف بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہہ تھے تو دوسری جانب علوم عربیہ کے جامع تھے اور ان میں بہت ٹھوس استعداد رکھتے تھے پھر معاملات میں سمجھ بوجھ اور سیاسی اور دنیوی امور و مسائل میں ان کی فرزانگی و دانشمندی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح علماء کی بزم کے وہ صدر نشین تھے اسی طرح اربابِ سیاست و تدبر کی محفل میں بھی اپنا مقام خاص رکھتے تھے "وہ جو بات کہتے تھے" اور جو لفظ ان کے قلم سے نکلتا تھا وہ اس قدر جچا تلا اور نپا تلا ہوتا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے نکتہ چیں کے لئے بھی اس پر حرف گیری آسان نہ ہوتی تھی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے آں مرحوم کو سب ہی علوم اسلامیہ میں غیر معمولی درک و بصیرت اور فہم و

فراست عطا فرمائی تھی۔ تاہم آپ کا اصل طغرائے امتیاز تفقہ فی الدین تھا۔ بڑے سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا اور وہ قرآن و حدیث اور احکام فقہ کی روشنی میں اس کا صحیح حل اس طرح علیٰ وجہ البصیرت معلوم کر لیتے تھے کہ پھر کسی کے لئے اس کا خلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ صفت تھی جس کے باعث ملّتِ بیضاء نے ان کو مفتی اعظم کا خطاب دیا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب کا جامہ ان کے تفقہ کے قامتِ موزوں پر بالکل چست آتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کافی غور و خوض اور تفکّر و تدبّر کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتے تھے اور اس تفکر کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی نظرِ توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ اور پھر ان کا فیصلہ ایسا اٹل اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوا دینا ممکن نہ تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اسرار و غوامضِ شریعت کے بڑے محرم اور احکام و تعلیماتِ اسلام کے ایک دیدہ ور نباض تھے۔ ان کے فتوےٰ مختصر مگر نہایت جامع اور مدلل ہوتے تھے۔ وہ عام اربابِ افتا کی طرح اپنی تحریروں میں کتب فقہ کی طول طویل عبارتوں اور مختلف اقوالِ ائمہ کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ مگر جتنا کچھ لکھتے تھے مسئلہ کی اصل روح اور اس کے اصل مغز کا حامل ہوتا تھا اسی بنا پر ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ کی مؤتمر عالم اسلام میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر وفد کی حیثیت سے انہوں نے شرکت کی اور اس کے بعد قاہرہ کی موتمر میں تشریف لے گئے تو ہر جگہ حجاز و مصر اور عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء و فضلا نے آپ کے غیر معمولی تفقہ فی الدین اور اصابت رائے کو تسلیم کیا۔ اور آپ کی علمی عظمت و برتری کا علانیہ اعتراف کیا۔ قاہرہ کے دورانِ قیام میں آپ کی علمی سیادت کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ شیخ جامعہ ازہر علامہ مراغی جو اپنے عہدہ کی حیثیت سے شاہ مصر کے محل میں جانے کے علاوہ اور کسی کے مکان پر جا نہیں سکتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مزاج پرسی کے لئے دو مرتبہ آپ کے قیام گاہ پر تشریف لائے، نہ صرف علماء مصر بلکہ پوری مصری قوم کی طرف سے یہ سب سے بڑا خراجِ عقیدت تھا جو عالم اسلام کی کسی عظیم المرتبت ہستی کو پیش کیا جا سکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ طبعًا نہایت ٹھنڈے دماغ۔ سنجیدہ فکر متین طبیعت۔ اور مرنج و مرنجاں مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ آفرینی یا انقلاب پسندی سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ جدوجہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انہوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تو اب وقت آیا کہ اُن کی قوتِ عمل اور کیرکٹر کی پوشیدہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریک آزادی اور جمعیۃ علماء ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبر۔ فراست۔ عزم و ہمت۔ استقلال و

پامردی اور راہ حق میں بے خوفی و بیباکی کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔"

حضرت مفتی صاحبؒ کو اگر رئیس العلماء یا امیر العلماء کہا جائے تو ایسا کہنا صورۃً و معنیً۔ ظاہراً و باطناً دونوں طرح بالکل موزوں ہوگا۔ کیونکہ وہ جس طرح علم و فضل کے اعتبار سے سرخیلِ علماء تھے۔ معاشی خوشحالی اور مالی رفاہیت کے لحاظ سے بھی علماء میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ انھوں نے ایک کتب خانہ قائم کر کے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی۔ پھر ان کی کتاب تعلیم الاسلام کے مختلف حصے گھر گھر اس قدر مقبول ہوئے کہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں انکی اشاعت ہو چکی ہے اور ان کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کا انکو فائدہ ہوا۔ اس مالی رفاہیت اور معاشی فارغ البالی کے باعث وہ نہایت خودداری اور صاحب رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے تھے۔ خرچ کرنے کے موقع پر بے دریغ خرچ کرتے تھے اور اس معاملہ میں بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ اونچا اور اربابِ تموّل کی امداد سے بے نیاز و مستغنی رہتا تھا۔

مجموعی حیثیت سے حضرت مفتی صاحبؒ کا سب سے بڑا جوہرِ کمال یہ تھا کہ انھوں نے قدرت کی بخشی ہوئی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اپنی خاص توجہ اور محنت سے اس طرح ابھارا اور انھیں پروان چڑھا کر اپنی شخصیت کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ علم و فضل کے علاوہ اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی کے کسی کام میں عاجز اور تہی مایہ نہ تھے۔ انھوں نے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کی تھی جو دینی حیثیت سے جس طرح مکمل تھی دنیوی حیثیت سے بھی کہیں سے تشنہ اور خام نہیں تھی چنانچہ گوناگوں علمی و عملی اور روحانی و معنوی کمالات و فضائل کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے اور خیاط بھی سا ایک بہترین انجینیر بھی تھے اور طباخ بھی، خوش لباس خوش غذا تھے اور ورزشی جسم رکھتے تھے۔ رمانان جیل میں بیڈ منٹن کھیلنا شروع کیا تو چند روز کی مشق میں ہی سب ساتھیوں پر بازی لے گئے۔

حساب دانی میں مشکل سے کوئی عالم اُن کا حریف ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی عربی، فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ بات چونکہ جچی تلی کہنے کے خوگر تھے اس بنا پر ان کی تقریر اگرچہ پر مغز اور مدلّل ہوتی تھی۔ لیکن ہنگامہ آفریں اور ولولہ انگیز نہیں ہوتی تھی، بزمِ احباب میں ایک بذلہ سنج مگر باوقار و متین یا رشاطر اور اربابِ معاملہ کی مجلس میں ایک غائر النظر مدبر و مفکر تھے۔ اس حیثیت سے ان کی زندگی بے شبہ علوم دینیہ کے علماء و طلبا کے لئے ایک کامیاب نمونہ عمل اور اس بات کی شہادت تھی کہ علوم عربیہ و اسلامیہ کا ایک بوریہ نشین طالب علم اگر چاہے اور کوشش کرے تو قوم کے عطیات اور چندوں سے، سرکاری ملازمت وغیرہ کی غلامی سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیوی زندگی بھی ایک معیاری اور خوشحال زندگی بنا سکتا ہے۔

صد حیف! کہ اب یہ بزرگ صورتیں - یہ علم وعمل کی جیتی جاگتی شکلیں، اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل وعلم بردار یہ شخصیتیں اپنوں اور پرایوں کا غم کھانے والی اور بنی نوع انسان کی ہمدرد وغم گسار یہ ہستیاں روز بروز عنقا ہوتی جا رہی ہیں - اور ایک وقت آئے گا کہ لوگ ان صورتوں کے دیکھنے کو ترسیں گے۔ بطنِ ارضی کا خزانہ ان سے مالامال ہوگا لیکن مادرِ گیتی کی کوک ان سے خالی ہوگی۔ آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں ان کے تذکرے پڑھیں گی لیکن ظہر ارض پر ان کی سی ایک صورت وسیرت بھی نہ ملے گی - اللّٰهم اغفره وارحمه رحمة واسعة وامطر عليه شآبيب لطفك السني وكرمك الهني تامةً وكاملةً"۔

مفتی اعظم کی خصوصیات

از مولانا محمد منظور نعمانی مدیر رسالہ الفرقان لکھنؤ

(بابتہ دسمبر ۵۲ء وجنوری وفروری ۵۳ء)

قارئین الفرقان اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبر وفات پڑھ چکے ہوں گے۔ اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دُنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہی ہے، اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے - لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے۔ اور دُور ونزدیک والے اس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات وحوادث سے متاثر ہوا کرتے ہیں ——— علم دین میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بلند مقامی اور خاص کر فقہ وفتویٰ میں اُن کی مرجعیت اور سیاسیات میں ان کی خاص بصیرت اور ذہن وفکر کا سلجھاؤ یہ تو وہ چیزیں ہیں جن سے کسی درجے میں وہ لوگ بھی واقف ہوں گے جن کی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی حضرات واقف ہوں گے جنہیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہوگا ——— یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی عظمت کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود اُنکے دوسرے قسم کے کمالات سے ہمیشہ زیادہ متاثر رہا ——— ان میں سے اُن کے جس کمال کا نقش میرے دل پر سب سے زیادہ گہرا ہے وہ اُن کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے، اس بارے میں اس عاجز کا جو تاثر اور احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے اُن کو جتنی بلندیاں

عطا فرمائی تھیں وہ اُتنے ہی متواضع اور بے نفس تھے، اُن سے ملنے والے اُن کے کسی نیاز مند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہو گا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے بہت چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انہیں شرم آتی، اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا ——

دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سیکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی اُنکی زبان سے، نہ نجی گفتگو میں، اور نہ مجلسی بحثوں اور گفتگوؤں میں، کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں سُنا — اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ سُننا یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق آتا ہے کہ: "کَانَ یَخْدِمُ نَفْسَہٗ" (آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) حضرت مفتی صاحبؒ اس اسوۂ نبیؐ کے خاص نمونہ تھے، اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے بہت سے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا —— واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متاثر ہے کہ اگر اُن کے ہاتھ پر کھلی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اُن اکابر دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور اُن کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دور فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ وَاغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

وفات حسرت آیات

از جناب ماسٹر شفیع الدین صاحب نیّر جامعی

مفتی ہند جو رخصت ہوئے اِس دنیا سے
باغِ فردوس کی لی حضرتِ مرحوم نے راہ

آپ کی روح کو کافی ہوئی حق کی نصرت
کیوں نہ ہوتا یہ، کہ تھا نام کفایت اللہ

بچھ گئی آپ کے غم میں صفِ ماتم ہر سو
ہو گیا بلدۂ دہلی کا تو بس حال تباہ

نوحہ خوانی میں ہیں مصروف سب اہلِ دہلی
واقعی اُن کے لئے روز ہے یہ روزِ سیاہ

غم زمیں کا یہ بنا وجہ نشاطِ گردوں
خیر مقدم کی صدا آئی فلک سے ناگاہ

پیشوائی کو جو آئے تھے ملک بول اُٹھے
پُر ضیا چہرہ ہے کیا خوب یہ ماشاءاللہ

چہرہ ایمان کی برکت سے مثالِ خورشید
ہے جبیں نورِ سعادت سے منوّر جوں ماہ

حور و غلمان نے آمد کا ترانہ گایا
بولے مشتاقِ زیارت تھیں یہ آنکھیں واللہ

کیا کہیں حضرتِ والا کہ عجب حالت تھی
عرش والوں میں سبھی کو تھی بڑی آپ کی چاہ

آپ کا علم وہ اور آپ کا اعلیٰ اخلاق
یہ بھی تھا صلِّ علیٰ وہ بھی تھا سبحان اللہ

مسندِ درس و ہدایت سے رہا آپ کو کام
حرص نے مال کی، نے تھی ہوس دولت و جاہ

نہ نمائش سے غرض، اور نہ طلب شہرت کی
"نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ"

انکسار آپ کا شیوہ تھا، طریق آپ کا علم
مگر اظہارِ عقائد میں جری حق ہے گواہ

یوں تو ہیں راہِ شریعت کے بہت سے رہبر
ایسے کم ہیں کہ جو دکھلائیں سدا صدق کی راہ

خیر مقدم کی خبر تھی یہ خوشی کا موجب
باوجود اس کے نکل ہی گئی منہ سے اک آہ

چند روز اور ابھی آپ جو زندہ رہتے
کیا عجب تھا کہ رہِ راست پہ آتے گمراہ

کیا عجب تھا کہ اس اُمّت کے بھی دن پھر جاتے
کیا عجب ہوتی نئے عہد کی پھر بسم اللہ

کیا عجب قوّتِ ایمان اثر دکھلاتی
کیا عجب ہوتے مسلمان حقیقت آگاہ

پر مشیّت سے ہیں مجبور یہاں سب انسان
ہو کے رہتا ہے وہی کرتی ہے جو ذاتِ اِلٰہ

ہاتھ اُٹھا دستِ دعا کو تو بعجز و الحاح
مغفرت حق سے تو اِس بندۂ مومن کی چاہ

ہے دعا تیرؔ دل خستہ کی تجھ سے یارب!
ہو عطا حضرتِ مغفور کو رحمت کی پناہ

مفتی کفایت اللہ مرحوم

(سہ روزہ کوثر لاہور شمارہ ۲ جلد ۱۲ مورخہ ۱۴ر جنوری ۱۹۵۳ء)

مولانا مفتی کفایت اللہ کو مرحوم لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے قد کے منحنی شخص کے علم و تفقہ سے برصغیر ہند و پاکستان کی پر خروش زندگی کے ۵۰ برس متاثر ہوتے رہے۔ ان کا علم و تفقہ کا تعلق تو حضرات علماء سے تھا۔ جو دینی مسائل میں ان کو اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی اصابت رائے۔ ان کا عزم

تحمل۔ان کا صبر و توکل، ان کی جرأت و ہمت اور استقلال و استقامت ایسے اوصاف تھے جن سے اس ملک کی پوری زندگی متاثر ہوئی۔

تحریک خلافت کے زمانے سے لے کر تقسیم ملک اور اس کے بعد تک وہ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے۔ اور اس کی پالیسی کو معتدل اور متوازن رکھنے میں ان کے شخصی اوصاف کافی حد تک کارفرما رہے۔ مسلمانوں کے قانونی حقوق ہوں یا دینی۔ آزادئ وطن کی تحریک ہو یا فرقہ وارانہ قضیے وہ جمعیۃ علمائے ہند کو انتہا پسندی اور رجعت دونوں سے روکتے رہے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء ان سے فقہی مسائل میں خم کھاتے تھے۔ ان کی نظر نہایت وسیع اور دقیق تھی۔ تقسیم کے بعد بھی انہوں نے بھارت کے مسلمانوں کو سنبھالنے میں غیر معمولی جرأت و ہمت سے کام لیا۔ آخری چند سالوں سے وہ خرابیٔ صحت کے باعث تمام سیاسی اور دوسری سرگرمیوں سے الگ ہو گئے تھے۔ افسوس کہ حال ہی میں ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ اور عالم اسلام ایک بلند پایہ عالم دین کے وجود سے خالی ہو گیا۔

اللہ تعالےٰ مفتی صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں ان کو جگہ بخشے۔ ہم مرحوم کے اعزہ کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کو صبر جمیل عطا کرے۔

مفتی اعظم کی زندگی کا ایک ورق

از جناب فتح چند صاحب نسیم

(الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن شمارہ ۵۸ جلد ۳۸ مورخہ ۲ مارچ ۵۳ء)

حیاتِ انساں ہے شمع صورت ابھی ہے روشن ابھی فسردہ
نہ جانے کتنے چراغ یونہی جلا کریں گے بجھا کریں گے

اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں ہندوستان کو پنجۂ اغیار سے چھٹکارہ دلانے میں اللہ والے علمائے کرام کی قربانیاں مستقل اور سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ اس وقت عوام کی بے حسی اور سرد مہری نے شمع وطن کے پروانوں کی جاں نثاریوں کو عروسِ کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقعہ نہ دیا اور ان کی بیل منڈھے نہ چڑھنے دی۔ لیکن اس ارضِ مقدس کے لئے ان کا بہایا ہوا خون رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اور ان کی جدوجہد بیکار ثابت نہ ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب دوسری جنگِ آزادی چھڑی اور تحریک خلافت کی بھی ابتدا کی گئی، تو لاکھوں برادرانِ ملت کے دلوں میں محکومیتِ غیر کے خلاف ان کے احساسات، جذبات بیدار ہونے میں دیر نہ لگی۔ اور وہ ایک دم مادرِ وطن

کو برطانوی اقتدار سے نجات دلانے کے لئے کمربستہ و مستعد ہو گئے۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند کی قائمی بھی اسی سلسلہ کی ایک شاندار کڑی ہے۔ جس کی بے غرضانہ خدمات اور بے لوث قربانیاں تاریخ آزادی کا ایک عدیم النظیر اور قابلِ فخر حصہ ہیں۔ یقیناً یہ جماعت ہر دل عزیز و مقبولِ عام ہرگز نہ ہو سکتی اگر شیخ الہند (قدس سرہ) شیخ الاسلام کی مساعی جمیلہ اور مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم ایسے بلند پایہ حضرات کی مخلصانہ سرگرمیاں اور انہماک شامل حال نہ ہوتا۔

قید و بند کے مرحلے

ہندوستان بھر کی تمام قومی جماعتوں میں یہ امر خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ مفتی اعظم صاحب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک متواتر اور مستقل صاحب صدر رہے۔ اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب بھی بیس سال لگاتار ان کے ہمرکاب ناظم اعلیٰ رہے اور پھر طرفہ یہ کہ قید و بند کی مصیبتوں میں ایک دوسرے کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یعنی جب ۱۹۳۰ء میں قانون شکنی کے سلسلہ میں مفتی اعظم صاحب گرفتار ہو کر چھ ماہ کے لئے گجرات (پنجاب) جیل میں بند کئے گئے تو سحبان الہند صاحب بھی گجرات جیل میں آپ کے ساتھ رہے۔ اسی طرح جب ۱۹۳۲ء میں آپ دوسری بار ملتان جیل بھجوائے گئے تو یہاں بھی سحبان الہند آپ کی رفاقت کا دم برابر بھرتے رہے۔ بلاشبہ قید و بند کے یہ تمام مرحلے بخندہ پیشانی طے کئے۔ اور ان سختیوں نے متحدہ قومیت کی پرورش اور وطن عزیز کی آزادی کے جذبہ میں آپ کو زیادہ استواریت اور استحکام بخشا۔ بقولے کسے :-

ہزاروں سختیاں سنگِ مزاحم بن کے آتی ہیں
مگر مردانِ حق اس بات کی پروا نہیں کرتے
مصائب جھیلتے ہیں اور طوفانوں سے لڑتے ہیں
صداقت کیش بندے حق کی خاطر کیا نہیں کرتے

انیس ۱۹ کا زمانہ

۱۹۱۹ء میں جب جمعیۃ العلمائے ہند کی پہلی کانفرنس آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر کے شانہ بشانہ ہوئی۔ تو یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان نے ہوم رول دیئے جانے کے وعدہ پر اتحادیوں کی امداد میں اپنے ملک کی اجناس اور قومی سرمایہ کے علاوہ لاکھوں نونہالانِ وطن بھینٹ کئے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے ہوم رول کی بجائے رولٹ ایکٹ دے دیا تھا جس سے ہندوستان کی رہی سہی آزادی کا گلا گھٹ گیا۔ تمام خوشگوار امیدیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ خودمختاری کے سہانے خواب مٹی میں مل گئے۔ انگریزوں کی اس طوطا چشمی، وعدہ شکنی خلاف توقع کجروی اور ریاکارانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سخت غصہ اور

ناراضگی کی لہر پھیل گئی۔ چنانچہ اسی ماحول میں کانگریس اور جمعیتہ کے سالانہ اجلاس امرتسر ایسے قدیمی اور تاریخی شہر میں خوب جوش و خروش سے ہوئے۔ جلیانوالہ باغ اپنے واقعہ خونیں سے جلتی بھٹی پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ مگر یہ فضا ہندوستانیوں کے حق میں نہایت سازگار تھی۔ اس موقعہ پر ہندوستان کے علمائے کرام اور کانگریس کے سیاسی لیڈروں نے مشترکہ اور متحدہ طور پر فرنگی استعماریت کو بیخ و بُن سے اکھیڑنے کے لئے پروگرام طے کئے۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس کے پریزیڈنٹ پنڈت موتی لال نہرو (پردھان منتری کے والد محترم) اور جمعیتہ العلمائے ہند کے صدر مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی تھے۔ (دوسری نشست کے لئے آپ کا ہاتھ مفتی اعظم صاحب نے بھی بٹایا تھا) دونوں جماعتوں نے ملک کے سامنے ہر شعبہ میں ٹکر لینے کا لائحہ عمل رکھا جس پر عمل کرتے ہوئے فرزندان وطن ایک ساتھ غیر ملکی حکومت کا نشانہ عتاب بنتے رہے۔

ان دنوں مسلم لیگ نے بھی ہر دو جماعتوں کا پورا پورا ثبوت یگانگت دیا تھا چنانچہ اس کا سالانہ اجلاس بھی امرتسر ہی میں بزیر صدارت حکیم اجمل خاں صاحب منعقد ہوا تھا۔ حکیم صاحب موصوف نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پہلی بار ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے اپنے خطبہ صدارت میں آنے والی بقرعید کے "موقعہ پر گائے کی بجائے بکرے کی قربانی دینے کی اپیل کی تھی۔ حکیم صاحب کی اس تحریک کا اثر آپس کے تعلقات پر بہت خوشگوار پڑا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندوؤں نے خلافت کے اسلامی سلسلے میں بیش بہا قربانیاں پیش کی تھیں۔ اور مسلمانوں نے بھی قربانی گاؤ ترک کر کے ہندوؤں کے دلوں اور آنکھوں میں جگہ حاصل کی تھی۔ مگر غیر ملکی حکمرانوں نے ہندو مسلمانوں کے اس بڑھتے ہوئے اتحاد سے خوفزدہ ہو کر اپنی قدیم عیاریوں کو بروئے کار لانا اپنا فرض مقدس سمجھا۔ اور مسلمانوں کی سرکار پرست جماعتوں کے افراد نے تعصبات کو بھڑکانے میں سرتاپا کوششیں کیں۔ تاکہ مندرجہ بالا تین قومی جماعتوں کے نصب کئے ہوئے سنگ بنیاد پر قومی اتحاد کی پھر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر نہ ہونے پائے۔

یہی وہ زمانہ تھا جسے سیاسی زندگی کا نصف النہار کہہ سکتے ہیں۔ مفتی اعظم صاحب کی دوراندیشانہ کارگزاریوں کی بدولت یہ اظہار کم قابل فخر نہیں کہ کانگریس نے تو کامل آزادی کا ریزولیوشن ۱۹۳۰ء میں لاہور برلب راوی پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں پاس کیا تھا۔ مگر جمعیتہ العلمائے ہند نے روز پیدائش سے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جمعیتہ کا یہ اقدام بھی نہایت مستحسن تھا۔ کہ جب کانگریس نے تمام سرکاری خطابات چھوڑ دینے کا اعلان کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب نے (اپریل ۱۹۲۰ء میں) اپنا خطاب "حاذق الملک" اور تمغہ قیصر ہند گورنمنٹ آف انڈیا کو واپس کر کے حکومت وقت کے جبر و تشدد کے خلاف اپنے

رنج و بیزاری کا عملی ثبوت دیا تھا۔ اس کے چند روز بعد جمعیۃ العلماء نے اپنے کانپور کے اجلاس میں حکیم صاحب موصوف کو اپنے متفقہ فیصلہ سے مسیح الملک کا قومی خطاب دے کر ان کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے۔

مسلم لیگ تو چند ہی سالوں بعد انگریزوں کے دام فریب کا شکار ہو گئی۔ مگر جمعیۃ العلمائے ہند نے کسی قیمت پر بھی انگریزوں کی چال میں آنا قبول نہ کیا۔ کیونکہ اس کے صاحب صدر مفتی اعظمؒ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند تھے۔ جو فولادی دل و گردہ کے مالک اور ان ہر دو حضرات میں انگریزی اقتدار پر کاری چوٹیں لگانے کی سچی تڑپ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کبھی چرچل پارٹی یا اس کے مریدان کرام کی طرف سے آل انڈیا نیشنل کانگریس کو ایک ہندو جماعت قرار دینے کا غوغا بلند ہوتا۔ تو کانگریس ان کی تردید میں مولانا آزاد شیخ الاسلام۔ مفتی اعظم۔ حکیم اجمل خاں صاحب۔ ڈاکٹر انصاری صاحب۔ علی برادران۔ فخر افاغنہ عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) اور سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے نام نامی کا اظہار کرتی ہوئی جمعیۃ العلماء ہند جرگہ خدائی خدمتگاران۔ انجمن احرار اور دوسری مسلم قومی جماعتوں کے دلی تعاون کا ثبوت پیش کرتی مگر یہ نہایت رنجدہ بات ہے کہ ہندوستان کی جبری تقسیم سے خدائی خدمتگاروں اور انجمن احرار کے مقتدر رہنمایان اور کارکنان سے پاکستان کی مسلم لیگی حکومت انگریزوں سے بدتر بن سلوک روا رکھ رہی ہے۔ جو آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خان برادران تو خصوصیت سے ان کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔

۱۹۳۰ء کا زمانہ

سرحدی گاندھی کے دیش یعنی پشاور میں جمعیۃ العلماء کے ایک ناقابل فراموش اور عظیم الشان جلسہ کے بعد سرحد کے غیور پٹھانوں اور خدائی خدمتگاروں نے شراب اور بدیشی کپڑوں کی دوکانوں پر زبردست پکٹنگ کی جس پر انگریزی حکومت نے کھسیانا ہو کر بے تحاشا گولی چلادی اور قصہ خوانی بازار میں نہتے اور پُرامن لوگوں کو اندھا دھند موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شہید ہونے والے لوگ جمعیۃ کی شمع ہدایت کے پروانے اور کانگریس کے سرچشمہ سے آب حیات پئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ جانباز اور سرفروش سامراجی ظلم و ستم کی آتش فشانی اور خونریزی کا جام شہادت بصد شوق و ذوق لنڈھاتے رہے۔ اور مرتے مرتے بھی "انقلاب زندہ باد" اور "بادشاہ خاں زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے رہے۔ اس روح فرسا اور خونچکاں واقعات کی تحقیقات کے لئے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کے ارکان صدر پٹیل اور مفتی اعظم صاحب تھے۔ صوبہ سرحد کے فرعون مزاج گورنر نے اس کمیٹی کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ راولپنڈی میں بیٹھ کر تحقیقات مکمل کی گئی۔ یہ رپورٹ ہر پہلو سے مستند اور انگریزوں کے اخلاق و انصاف کی ننگی تصویر تھی۔ اس لئے گورنمنٹ آف انڈیا نے رپورٹ مذکور ضبط قرار دیدی۔ لیکن جو حصے بھی عوام کے سامنے آسکے۔ ان حصوں پر مفتی صاحب کی قابلیت اور فضیلت کا اعتراف ہر ایک نے کیا۔

ہندوستان مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کے تبحر علمی اصابت رائے۔ خداداد قوت حافظہ، بلند فکری اور

دور اندیشی کا تو گرویدہ تھا ہی۔ مگر بیرونی اسلامی ممالک بھی ان کے کم مداح نہیں تھے۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کی مؤتمر اسلامی اور پھر مصر کی مؤتمر اسلامی میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

مصر کی مؤتمر اسلامی میں صدہا علماء اور فضلاء کے شریک ہونے کے باوجود اس کی کرسی صدارت[1] آپ ہی کو سونپی گئی۔ مگر آپ اتفاقاً بیمار ہو گئے۔ اور ازہر یونیورسٹی قاہرہ کے شیخ الجامعہ بنفس نفیس آپ کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ الغرض آپ کی ذات گرامی کے اوصاف آپ کی بیش بہا خدمات مادر وطن کے پاؤں سے بیڑیاں کاٹنے کی مساعی جمیلہ اور تہائی صدی سے زائد عرصہ تک یعنی مرتے دم تک حب الوطنی اور قوم پرستی کا دم بھرتے رہنا کیونکر بھلایا جا سکتا ہے۔ آپ کے طویل ترین کارناموں کو ان چند سطور میں بیان کیا جا سکے۔ یہ از حد ناممکن ہے اسلئے میں اپنے قلم کو یہیں روکتا ہوں۔ اور بدرگاہ ایزدی دست بدعا ہوں۔

تیری رحمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لئے

مفتی اعظم کی یاد میں

از جناب آسیر صاحب ادروی

(الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن شمارہ ۵۸ جلد ۳۵ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۵۳ء)

وہ مفتی و فقیہہ شریعت نہیں رہا | وہ آفتاب رشد و ہدایت نہیں رہا
وہ قامع اساس ضلالت نہیں رہا | وہ واقف رموز سیاست نہیں رہا

خورشید زندگی ابھی برج محن میں ہے
تنویر چھن گئی، ابھی سورج گہن میں ہے

بے تاب کارواں ہے ابھی رہگزار میں | الجھا ہوا سفینہ ہے موج شرار میں
کلیاں نہ کھل سکیں چمن روزگار میں | گلشن میں آگ لگ گئی فصل بہار میں

پژمردہ ہو رہا ہے چمن، باغباں نہیں
جائیں کدھر؟ کہ راہبر کارواں نہیں

شمع خرد سے جس کی ہمیں روشنی ملی | ملت کو جس کے دم سے نئی زندگی ملی
جس کے ثبات و عزم سے خود آگہی ملی | ظلمت فروش راہوں کو تابندگی ملی

---

[1] وہ کانفرنس علمی علویہ پاشا کی صدارت میں ہوئی تھی مفتی صاحب کی کرسی کرسی صدارت کے داہنی طرف تھی۔ (واصف)

جس کا دماغ دہر میں وہ کام کر گیا
ہر مرحلہ سے آگے مسلماں گزر گیا

بزمِ وطن کی شمعِ شبستاں اُداس ہے — کلیاں فسردہ ہیں تو گلستاں اُداس ہے
آبادیاں اُداس بیاباں اُداس ہے — ہندوستاں کا آج مسلماں اُداس ہے

ہر آنکھ اشک ریز ہے، دل بے قرار ہے
ماتم کناں جہاں ہے، فضا سوگوار ہے

تقریر سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب

(الجمعیۃ شمارہ ۲۶ جلد ۳۸ مورخہ ۶ جنوری ۵۳ء)

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے مخصوص انداز میں مرحوم مفتی صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالی اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا مولانا اور مفتی صاحب کا بہت عرصہ تک ساتھ رہا اس لئے مولانا کی تقریر ایسا اثر لئے ہوئے تھی۔ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سحبان الہند نے فرمایا مفتی صاحب اپنے تبحر علوم اسلامی کے باعث عالم اسلام میں تو مشہور تھے ہی لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری پچاس سال میں ملک اور وطن کی ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ غیر مسلم حلقوں میں بھی ان کا نام نہ بھلایا جا سکے گا۔ وہ عدیم المثال مدبر مفکر اور جنگ آزادی کے سپہ سالار تھے۔ اتحاد اور آزادی کی جدوجہد میں وہ اپنے استاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سچے پیرو تھے۔ ابتداء ہی سے وہ تحریک آزادی میں شامل رہے اور پورا پورا حصہ لیتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں جب پہلی بار مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو مفتی صاحب نے اس میں پورا پورا حصہ لیا۔ اور خطبہ صدارت کی ترتیب میں اہم مشورہ اور امداد دی۔ تحریک خلافت میں مفتی صاحب مرحوم برابر حصہ لیتے رہے۔ لیکن اپنی علمی اور مذہبی سرگرمیوں کو کبھی منقطع نہ ہونے دیا۔

نمک سازی کی تحریک

نمک سازی کی تحریک کے زمانے میں وہ بہت چاہتے تھے کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد خود نمک بنانے والے ایک دستہ کی قیادت کریں لیکن دوسرے بزرگوں نے ان کو روک دیا۔

حضرت سحبان الہند نے جو مفتی صاحب کے ساتھ بہت عرصہ تک رہے اس دور کے متعدد واقعات

بیان کرنے کے بعد فرمایا کسی شخص کی سیرت اور کردار کا صحیح اندازہ اس کے ساتھ سفر کر کے یا جیل میں رہ کر ہو سکتا ہے۔ میرا اور ان کا جیل میں بھی ساتھ رہا اور سفر میں بھی۔ سفر کیا سفر حج جو اس زمانے میں ہر قسم کی مشکلات اور مصائب سے بھرپور تھا۔

جیل میں حضرت مفتی صاحب کا سلوک تمام قیدیوں کے ساتھ خواہ وہ کسی کلاس سے تعلق رکھتے ہوں ایسا تھا کہ جب وہ گجرات جیل سے رہا ہوئے تو تمام قیدی ان کی جدائی میں رونے تھے اور کہتے تھے کہ ہم سے ایک بڑی نعمت علیحدہ کی جارہی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کو عالم اسلام میں جو مقبولیت حاصل تھی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، وہ ایک عزم کے انسان تھے۔ اس میں کبھی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ تقسیم کے بعد جب مجسٹریٹ کے ذریعہ انھیں یہ پیغام دیا گیا کہ انھیں اور ان کے متعلقین کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن مفتی صاحب مرحوم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جواب دیا کہ جو عام مسلمانوں کا حشر ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔ میں اپنا مکان نہیں چھوڑ سکتا۔

تقریر ڈاکٹر سیّد محمود صاحب

(الجمعیۃ شمارہ ۱۰۶ جلد ۳۲ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۵۳ء)

ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اپنی تقریر میں مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مفتی صاحب نے جس بہادری سے اپنی ساری زندگی بسر کی اسی بہادری کے ساتھ انہوں نے اپنی موت کا بھی مقابلہ کیا۔ چنانچہ آخر وقت میں انہوں نے دوائیں استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں ہر شخص کو زندہ رہنے کی کتنی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن مفتی صاحب کی ذات اس کے بالکل برعکس تھی، وہ عرصہ تک جمعیۃ علماء کے صدر رہے تھے اور اپنی انتھک کوششوں سے انہوں نے جمعیۃ کو قائم کیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک کے سلسلہ میں پانسو علماء سے فتویٰ حاصل کرنا صرف مفتی صاحب ہی کا کام تھا جو تاریخ میں یاد رہے گا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ حضرت مفتی صاحب کے لئے اس سے بہتر اور کوئی دعا نہیں ہو سکتی کہ اپنی آزادی کو قائم رکھیں جس کے وہ ایک ہیرو تھے۔

روزنامہ تیج دہلی

(منقول از الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۵ جنوری ۱۹۵۳ء)

جمعیۃ علماء ہند کے (سابق) صدر مفتی کفایت اللہ کا انتقال نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کبھی نہیں ہوگی۔ مفتی کفایت اللہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے چوٹی کے مذہبی رہنما تھے۔ بلکہ قوم پرستوں کی صفوں میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی ہر ایک جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا۔ برسوں کانگریس کے ایک سرگرم رہنما رہے۔ فرقہ وارکشیدگی کے کسی دور میں ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔ مسلم لیگ نے ان کے خلاف کیا کچھ پراپیگنڈہ نہیں کیا۔ لیکن وہ کبھی خوف زدہ نہ ہوئے۔ اور بڑے سے بڑا لالچ انہیں اپنے اعتقاد سے گرا نہیں سکا۔ مفتی صاحب کچھ دنوں سے گوشہ تنہائی اختیار کر چکے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو عمر کا تقاضہ تھا۔ دوسرے وہ کچھ عرصہ سے بیمار رہے تھے۔ اسی بیماری نے انھیں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا کر دیا۔ دہلی والوں کے لئے لالہ دیش بندھو گپتا کے بعد یہ ایک دوسرا صدمہ ہے۔ جن لوگوں سے دہلی کی تہذیب کی صدق دلی، محبت اور خلوص کی روایات وابستہ تھیں وہ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور اس لحاظ سے دہلی غریب ہوتی جا رہی ہے۔ تیج کو مفتی صاحب کے پریوار سے اس صدمۂ جانکاہ میں دلی ہمدردی ہے۔

تاریخ اشکِ غم

از جناب مجاز الاعظمی صاحب

بے سپر دستِ حامیِ اسلام — بازوئے امن و صلح بے صمصام
بے رُواں گشت کالبدِ ملت — بے نشاں گشت تاجِ فرقِ انام
روحِ انسانیت بسا نالید — از غمِ ہجرِ مفتیٔ اسلام
نالہ زد اہلِ مشرق و مغرب — ہند و ترک و حجاز و مصر و شام
گرسنہ کلیاتِ دین از و — تشنہ بر جزئیاتِ دین، کلام
آنچناں کرد جنگ با افرنگ — قید ملتان گفت الف سلام
سنگ آمد ز منجنیقِ اجل — تبر آمد ز ترکشِ آلام

بس کہ بہرِ جنازۂ مفتیؒ | خاکِ ہندی ز ہر سو بخرام
مہر از روزہائے ملک برفت | شد ز شبہائے ہند ماہِ تمام
چشم دارد بہجر تش تفصیل | زانکہ دل داشتہ بسے ابہام

قدسیاں گفتہ اند در تاریخ
عرش فردوس، مفتیِ اسلام
۱۳۷۲ھ

آہ مفتیِ اعظم

از میر مشتاق احمد صاحب

(ہفتہ وار ایشیا دہلی مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۵۳ء)

در مقام لا نیاساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

سال نو (۱۹۵۳ء) کی آمد میں ۱/۲ گھنٹہ باقی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی اعظم کی روح پاک کو اپنی طرف بلا لیا۔ علم کا چراغ گل ہوگیا۔ عالم اسلام کے علمی خزانے کا دریے بہا ہمارے درمیان نہ رہا۔ فقیہہ زماں نکتہ داں عالم بے بدل چل بسے اور ایک شاندار تاریخ یادگار کے طور پر چھوڑ گئے۔ وہ عالم باعمل تھے۔ ان کی ذات میں بے حد خوبیاں تھیں۔ وہ جامعِ صفات تھے۔ علم و حلم، انکساری، مروت و شفقت و محبت۔ اتقا و پرہیزگاری۔ حق گوئی و بے باکی کا مجسمہ تھے۔ لیکن نمود و نمائش کی خواہش نہ تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے دین کو سیاست کے تابع نہیں کیا۔ بلکہ سیاست اور مادی دنیا کو دینِ حق کے تابع رکھا۔ وہ حکومت اور درباری ضرورتوں سے بے نیاز تھے۔ اللہ کی امانت تھے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ حضرت العلامہ ہندوستان کی جدو جہد آزادی کے راہ نما تھے۔ آپ نے ملک کو برطانوی پنجۂ اقتدار سے نجات دلانے کے لئے میدانِ عمل میں آکر نہ صرف راہ نمائی کی بلکہ خود جیل کی زندگی کو لبیک کہا اور خطرناک موڑوں پر استقلال و استقامت کا ثبوت دیا۔ آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ قصہ خوانی بازار کے خونی واقعہ پر جو انکوائری کمیٹی کانگریس نے مقرر کی تھی۔ آپ اس کے ممبر تھے۔ آپ ہمیشہ قومی یک جہتی اور قومی ایکتا کے علمبردار رہے۔ آپ نے کبھی فرقہ پرستی کی طاقتوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔ آپ کی سیاسی فراست اور دیانت کی تعریف ہر موافق اور مخالف تسلیم کرتا تھا۔ آج کے بہت سے سیاست داں اور وزیر حضرت مفتی صاحب کے سامنے

طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ایک سچے اور پکے محبِ وطن تھے۔

ایک سانحہ عظیم سالِ نو کی آمد سے ۱½ گھنٹے پہلے واقع ہوا۔ اللہ کی مرضی یونہی تھی۔ گذشتہ نصف صدی سے یہ شمع ہدایت دہلی کو معرفت کی شعاعوں سے منور کر رہی تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن وہ دینِ حق جس کا وہ مبلغ تھا وہ ہے اور رہے گا۔ اگرچہ وہ پاک اور مقدس روح نہ رہی۔ لیکن اس کا پاک اور مقدس مقصد ہمارے سامنے ہے۔ آؤ ارادہ کرو۔ یقین کو عمل کا جامہ پہناؤ۔ آؤ دینِ حق کو اپنی زندگی کا عملی جزو بناؤ۔ آؤ عمل کرو۔ آؤ اس پاک مقدس مقصد کو اپناؤ۔ اللہ کے رسول کو بھی اسی راہ جانا پڑا۔ ہر شخص کو موت کی آغوش میں سونا ہے۔ آؤ موت آنے سے پہلے کچھ نیکی کریں، کچھ خدمتِ مخلوقِ خدا کریں۔ خداوند کریم اس پاک مقدس روح کے صدقے میں انسانوں کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تا چند ناداں غافل نشینی
بینی جہاں را خود را نہ بینی

مفتی صاحب

(اداریہ صدق جدید مورخہ ۹ رجنوری ۱۹۵۳ء)

دہلی کی خبر ہے کہ عین جس وقت سال عیسوی رخصت ہو رہا تھا۔ ۳۱ ردسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب میں (شب پنجشنبہ) مفتی صاحب نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کون مفتی صاحب؟ مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ العلماء آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل جب خلافت کمیٹی کا دور عروج تھا۔ مطلق مفتی صاحب سے مراد یہی مفتی صاحب ہوتے تھے نام لینے کی حاجت بھی نہ تھی اور اس کے بعد بھی مدتوں یہی حال رہا۔

علالت اور نازک علالت کی خبریں بھی ہفتوں سے آرہی تھیں اس لئے دل اس آخری خبر کے سننے کے لئے بھی تیار تھا۔ لیکن اس تیاری سے بھی واقعہ کی اہمیت اور صدمہ کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔

فقیہہ آج ہر وہ شخص سمجھا جاتا ہے جسے عالمگیری، شامی وغیرہ کے جزئیات حفظ ہوں۔ مفتی صاحب مرحوم اس علمیانہ مفہوم میں نہیں بلکہ واقعتہً فقیہہ تھے یعنی شریعت کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر تفقہ سے کام لینے والے۔ اور ان کی ذہانت ایسی تھی جیسے امام ابو حنیفہؒ کے ایک شاگرد رشید کی ہونی چاہیئے۔ باریک مسائل کی تہ تک وہ بات کی بات میں پہنچ جاتے۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں بارہا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کسی مسئلہ میں شدید اختلاف ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ مفتی صاحب نے ادھر توجہ فرمائی اور چند منٹ کے اندر ایسا آسان حل نکال دیا جس پر فریقین بخوشی متحد ہو گئے۔

ان کے رسالے تعلیم الاسلام گو نام سے گو بظاہر صرف مبتدیوں کے لئے ہیں۔ لیکن درحقیقت متوسطوں اور منتہیوں سب کے کام کے ہیں۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ باوجود پختہ نیشنلسٹ اور قوم پرور ہونے کے وہ دینی اسلامیت اور اپنے عقائد میں بھی متشدد آخر تک رہے۔ یہ نہ ہونے پایا کہ سیاست کی رو میں بہ کر اپنے مقتضیات و مطالبات ایمانی میں کسی قسم کا ڈھیلا پن آجانے دیا ہو۔ اور یہ وصف ایسا ہے۔ جو ان کے معاصرین میں کمتر ہی کسی میں پایا جاتا ہے۔ جوش اور ہوش اور فہم و فراست و تدبر کا اتنا خوشگوار امتزاج بھی نادر ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے۔ تواضع و انکسار، خوش خلقی، مہمان نوازی وغیرہ کے اوصاف حسنہ اس پر مستزاد۔

حالات سے بددل ہو کر ایک عرصے سے گوشہ نشین سے ہو گئے تھے۔ عمر ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان تھی۔ بحیثیت مجموعی اپنے کمالات کے لحاظ سے اپنی نظیر بس آپ تھے۔ اللہ بلند سے بلند مراتب سے سرفراز فرمائے۔"

بشکریہ حکیم عبدالقوی صاحب
منیجر صدق جدید

سچی باتیں

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

(صدق جدید ۲۴ جنوری ۵۳ء)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم الدہلوی نوراللہ مرقدہٗ کی وفات کو کئی ہفتے ہو چکے اور ملک کا گوشہ گوشہ اب تک ان کے ماتم و شیون سے گونجا ہوا ہے۔ خود پاکستان تک، سیاسی اختلاف کے باوجود تعزیت میں پیچھے نہیں۔ زندگی بھر مسلمانوں کے مکرم و محترم رہے، سالہا سال جمعیۃ علماء کے صدر، ایک بڑی دینی درسگاہ کے روح رواں، اور مجلس خلافت کے اہم رکن و کارکن۔ لیکن آپ کو علم ہے کہ اتنے بڑے مقتدا، جید عالم اور شیخ وقت کیا تھے؟ نہ سید نہ شیخ نہ حسنی نہ حسینی نہ صدیقی نہ فاروقی نہ علوی نہ عثمانی باوجود اس کے آپ نے دیکھا کہ بڑے بڑے عالی نسب شیخ اور سید ان کے علم و فضل۔ تقویٰ اور تدین کے آگے جھکتے رہے۔ بڑے سے بڑے علماء اور مشائخ ان کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ان کے دینی فتوے سب پر

چلتے رہے۔ مخالفوں اور معاندوں میں بھی کبھی کسی کو انگشت نمائی کرنے بلکہ اُدھر اشارہ کرنے کی بھی جرأت نہ پڑی۔ یہ فیض اگر اسلام اور شارع اسلام کا نہ تھا تو اور کس کا تھا؟ اس بیسویں صدی کے گئے گزرے ہوئے اسلام کا بھی!

امتیازات نسب را پاک سوخت — آتش او این خس وخاشاک سوخت
بر نسب نازاں شدن نادانی است — حکم او اندر تن و تن فانی است

اور خود اقبال جنھوں نے یہ ترانہ گایا ہے وہی کونسے سید زادے یا شیخ زادے تھے؟ اور اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں یہ مثالیں نئی اور انوکھی کب ہیں؟

بشکریہ حکیم عبد القوی صاحب
بیچ صدق جدید

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ

(شمارہ ۲ جلد ۷۱ فروری ۱۹۵۳ء)

از شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے ہماری دینی و ملی عمارت کا ایک بڑا ستون گر گیا۔ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کی شب کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے انتقال فرمایا۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے فضل و کمال، دین و تقویٰ اور فہم و فراست کے لحاظ سے طبقہ علماء میں نہایت ممتاز اور منفرد شخصیت رکھتے تھے۔ دینی علوم خصوصاً فقہ و فتاویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری۔ اور وہ نصف صدی سے زیادہ درس و افتا کی مسند پر فائز رہے۔ دہلی کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس بلکہ اس کے جزو کل تھے اور یہ مدرسہ انھیں سے عبارت تھا۔ اس علم و تقویٰ کے ساتھ وہ ایک مجاہد کا دل اور مدبر کا دماغ رکھتے تھے۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانے سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک تمام مذہبی و ملی اور قومی و سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ ایک زمانے تک جمعیۃ العلماء کے صدر اور کانگریس کے رُکن رکین رہے اور ان دونوں کو ان کی رہنمائی سے بڑا فائدہ پہنچا۔

مرحوم کا دماغ بڑا نکتہ رس اور سلجھا ہوا تھا۔ اور ان کی رائے نہایت متین اور صائب ہوتی تھی۔ پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو اپنی فراست سے سلجھا دیتے تھے۔ اس لئے مذہبی اور ملکی و سیاسی دونوں جماعتوں

میں ان کا بڑا وزن تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا خاص حصہ ہے۔ ملکی سیاست میں وہ اخیر تک کانگریس کے ہم خیال رہے لیکن جب سے اس پر فرقہ پرستوں کا غلبہ ہوگیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت اور ان کی قربانیوں کی کوئی قدر باقی نہ رہ گئی تھی، عملاً اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ طبعاً نہایت سنجیدہ و متین تھے۔

اگرچہ مرحوم عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ انتقال کے وقت ۷۹ سال کی عمر تھی۔ مگر اب طبقۂ علماء میں ایسی جامع الحیثیات شخصیت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے ان کی موت ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا قومی حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پیکر علم و عمل کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

تجاویز و خطوط تعزیت

مجلس عاملہ جمعیۃ علمائے ہند کی منظور کردہ تجویز تعزیت۔ باجلاس منعقدہ ۲۸ فروری ۵۳ء بمقام بمبئی :-

"مجلس عاملہ جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس مفتی اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی وفات کو نہ صرف کسی ایک جماعت یا کسی ایک فرقے کے لئے بلکہ پورے عالم اسلام اور جمیع انسانیت کے لئے حادثہ جانکاہ اور ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو خداوند عالم نے علم و عمل۔ زہد و تقویٰ۔ اتباع سنت اور تفقہ فی الدین کی جامع صفات کے ساتھ حسن اخلاق، اعلیٰ کردار، بہترین تفکر اور اعلیٰ تدبر کا مقدس پیکر بنایا تھا۔ مذہبی اور دینی خدمات کے ساتھ ہندوستانی سیاست اور آزادی ہند کی جدوجہد میں آپ کی مساعی جمیلہ، آپ کی بار بار کی اسارت اور آپ کی قربانیاں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمعیۃ علمائے ہند، آپ کے حسن تدبر کا زندہ کارنامہ ہے۔ آپ اس کے بانی اور معمار اول ہیں۔ بیس سال تک آپ کے دور صدارت میں جمعیۃ علمائے ہند نے وہ عظیم الشان تاریخ مرتب کی جو آج نہ صرف جمعیۃ علمائے ہند بلکہ ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر ہے۔ آپ کی یہی خدمات اور یہی عظیم الشان قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک حلقہ آپ کی وفات سے متاثر ہے۔ اور موت العالِم موت العالَم کا صحیح نقشہ سامنے ہے۔

یہ اجلاس آپ کی وفات پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ خداوند عالم آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے۔ اور آپ کے پسماندگان کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی

از دفتر جمعیۃ علمائے صوبہ بہار (پٹنہ)

یکم جنوری ۱۹۵۳ء

مولانا حفیظ الرحمان ۔ دکھے دل کی تعزیت قبول کیجئے۔ مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی موت مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ کا صحیح مصداق ہے ۔ دل کا سہارا ٹوٹ گیا ، بتایئے ! اب ہماری جہالت کم مائگی ، بے بصیرتی ، کہاں رجوع کرے گی ؟

فقہی ، علمی ، ملی الجھنوں کی سلجھی تعبیر کہاں ملے گی ؟ کس کی نکتہ رسی اور فطانت گہرائی میں ڈوب کر معاملے کے پس منظر کی ہو بہو تصویر کو ہم کور بصروں کے لئے چند سادہ لفظوں میں ابھار کر اور محسوس بنا کر سامنے کھڑی کردے گی ؟

اے اللہ ! رحمت کی بارش برسا ! اس نیک نہاد ہستی پر جو سادہ ، بے تصنع ، فراخ حوصلہ ، غیور ، بے طمع ، دین وملت کا مخلص خادم ، کوہ وقار ، علم کا منار ، تقویٰ وورع کا پیکر ، اسلامی اخلاق کا نمونہ و مجسمہ ، فقیہ ، ادیب اور ایوان جمعیۃ علماء ہند کے بنیان مرصوص کی پہلی آہنی اینٹ تھی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالےٰ آپ کو اور آپ کے ساتھ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جمیع وابستگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے ۔ آمین

عبد الصمد رحمانی

دار العلوم دیوبند

باجلاس منعقدہ ۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۷۲ھ

مجلس انتظامیہ دار العلوم دیوبند کا یہ اجلاس مفتی بے بدل عالم ربانی حضرت مولانا محمد کفایت اللہ رح رکن مجلس شوریٰ دار العلوم کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے غم والم کا اظہار کرتا ہے ۔ حضرت مرحوم اپنے علم و فضل تقویٰ وطہارت اور اخلاق وکمالات کے لحاظ سے طبقۂ علماء کے ایک بے نظیر شخصیت تھے ۔ آپ دار العلوم کے ایک ممتاز فاضل اور اس کی انتظامی مجالس کے ایک فہیم اور مدبر رکن تھے ۔ مجلس حضرت ممدوح کی وفات کو امت اسلامیہ ، ملت ہندوستان اور دار العلوم کے ذمہ دار انتظامی حلقوں کا ایک ایسا خلا محسوس کررہی ہے جو بظاہر اسباب جلد بھرنے والا نہیں ہے ۔ مجلس کے تمام اراکین بارگاہ حق میں دست بدعا ہیں کہ حق تعالےٰ انہیں اعلیٰ علیین میں مقام بلند عطا فرمائے اور امت میں ان کا خلف صالح پیدا فرمائے ۔

اس صدمۂ جانکاہ میں مجلس کو حضرت مرحوم کے پس ماندگان اور تمام اعزہ واقربا سے دلی ہمدردی ہے ۔

خدا تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(مرسلہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ مہتمم دار العلوم دیو بند)

حضرت قطب المشائخ مولانا شاہ عبد القادر رائپوری رح

از ڈھوڈھی ڈاک خانہ جھاوریاں ضلع سرگودھا

مکرم و محترم بندہ جناب مولانا مولوی حفیظ الرحمان صاحب دامت فیوضکم۔ از احقر عبد القادر رائے پوری
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے انتقال پُر ملال کی خبر سُنی۔ بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ حضرت رح کے بہت ہی درجے بلند فرمائے اور ترقیات سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے۔ ہم سے ایک بہت بڑی نعمت چھن گئی۔ اللہ جل شانہٗ اس کا نعم البدل نصیب فرماوے۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں فقط۔ ۱۳؍ جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

از بربیگھا ضلع پورنیہ

۸؍ جنوری ۱۹۵۳ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الی الاخ المصاب مولانا حفیظ الرحمان کفی اللہ لکم کفایتہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ علالت کی خبر سب سے پہلے آپ ہی کے ذریعے ملی۔ اور اردو انگریزی اخباروں نے ما تحن سامنہ اقد و قعا کی خبر جان گسل سنائی۔ وہ جو ابوالامت کی حیثیت حاصل کر چکا تھا اس کی تعزیت شخصی طور پر کیا کی جائے۔

عمت فواضلہ فعم مصابہ — فالناس فیہ کلھم ماجور

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝

کی یافت تو ان ہی کو ہو سکتی ہے۔ جو اس راہ کے راہی ہیں۔ کم از کم اندھوں سے اتنی حقیقت تو بہر حال مخفی نہیں رکھی گئی کہ

ردت صنائعہ الیہ حیاتہ — فکانہ من نشرھا منشور

اللہ اللہ! فقیہ جلیل جس کے متعلق واقعی خیال آتا ہے کہ وہ:۔

عجبًا لاربع اذرع فی خمسۃ — فی جوفھا جبل اشم کبیر

یاد آتا ہے خان بہادر رشید احمد مرحوم کا مہمان تھا۔ میں ذکر ہی حاضری کی کر رہا تھا کہ کنواں خود پیاسے

کے سامنے کھڑا تھا۔ ندامت وخجالت کی حد نہ تھی۔ اور وہ سمجھاتے جاتے تھے کہ آپ میرے یہاں مہمان ہیں میرا فرض تھا کہ اگر ملاقات کرتا۔

دین کا وہ اعتدالی ذائقہ جو سیدنا الامام الکبیر النانوتوی کے صدقے میں تقسیم ہوا ہے اس کے بہترین نمونے اٹھتے چلے جا رہے ہیں یعنی جزئیات کے ناقد بصیر کو اب دنیا کہاں ڈھونڈھے گی۔

کل شیٔ ھالک الا وجھہ — فرحمہ اللہ ونور ضریحہ۔ فقط

خاکسار مناظر احسن گیلانی

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی

از دار الافتائے علمائے لدھیانہ منڈی بہاؤ الدین (پنجاب)

مکرم ومحترم دام لطفکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آج اخبارات میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پُر ملال کی خبر پڑھ کر انتہائی صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔

مرحوم کی رحلت سے دنیائے اسلام کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار تھے۔ آخری سانس تک ان کے نقش قدم پر چلنے میں مصروف رہے۔ جہاں تک عالم اسباب کا تعلق ہے مسلمانان ہند کو جن حضرات پر ہر طرح اعتماد تھا ان میں آپ کی شخصیت ایک نمایاں مقام رکھتی تھی۔ اسلام کے ہر شعبے میں آپ کا فیضان جاری وساری تھا۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں حضرت شیخ الہندؒ کے بعد انہیں کے نظریوں کے مطابق آپ نے جو نمایاں خدمات انجام دے کر منزل مقصود کو حاصل کیا وہ تاریخ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ میری یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ انقلاب کے بعد ان کی ملاقات اور زیارت سے محروم کر دیا گیا۔ امید ہے کہ آپ مرحوم کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

سب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ فقط والسلام

بندہ محمد نعیم عفا اللہ عنہ از منڈی بہاؤ الدین
۵ر جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب

صدر مفتی دار العلوم دیوبند

۵ر جنوری ۱۹۵۳ء۔ عزیزم مولوی حفیظ الرحمان وخلیل الرحمن سلمہما اللہ تعالیٰ !

سلام ودعائے مسنون۔

میں ۱۹ر دسمبر ۵۲ء سے راجپور روڈ کے شفاخانہ میں بستر علالت پر پڑا ہوں۔ آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ ایسی حالت میں حادثۂ فاجعہ کی خبر کانوں میں پڑی کہ ۳۱ر دسمبر ۵۲ء کی شب میں حضرت مفتی اعظم، علامۂ زماں فقیہ بے نظیر، دنیائے علم وعمل، آفتاب فضل وکمال، علوم کا دریائے ناپیدا کنار، دین ومذہب کا درشہوار، جنگ آزادی کا زبردست جری جرنیل وشہسوار میدان سیاست کا یکہ تاز، ثابت قدمی واولوالعزمی کا طود عظیم، زمانے کا نباض ونبض شناس، طوفانی موجوں کی حرکات کا واقفکار، دنیا کا رہنما، عالم اسلامی کا پیشوا و مقتدا مفتی محمد کفایت اللہ نور اللہ مرقدہٗ کا وصال ہو گیا۔ اس حادثہ سے جو صدمہ آپ لوگوں کو پہنچا ہے وہ اپنی جگہ پر بالکل بجا اور درست ہے لیکن ساتھ ہی اس کے دہلی ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی بلکہ ساری دنیا کو مفتی اعظم کے ارتحال سے جو ناقابل تلافی زبردست نقصان پہنچا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر بجا اور درست ہے۔ آہ! ہمیشہ کے لئے یہ علم وفضل کا آفتاب غروب ہو کر ہم سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لکل اجل مسمّیٰ والصبر عند الصدمۃ الاولیٰ

اب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے مزار پر انوار وبرکات کی بارش کرے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے اور مفتی صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے اور ان کے بعد کسی فتنے میں مبتلا نہ کرے۔ آمین!

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہٗ ولا تفتنا بعدہٗ واغفر لنا ولہٗ برحمتک یا ارحم الراحمین

خادم ناکارہ سید مہدی حسن غفرلہٗ شاہجہاں پوری

۵ر جنوری ۵۳ء

۱۸ر ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ

راقم الحروف خادم ناکارہ محمد میاں بھی دلی رنج وغم میں شریک ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند و ممبر پارلیمنٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم مولانا حفیظ الرحمٰن و خلیل الرحمٰن صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی! دلی سے دورسی پی بیں کامٹی سے واپس آیا تو رات کے ایک بجے لطیف غنی صاحب نے پرچہ بھیج کر حادثۂ عظیم کی اطلاع دی اور یہ کہ دہلی سے بذریعہ ٹیلیفون مجھ کو مطلع کیا گیا ہے۔ جب سفر کے لئے روانہ ہوا تھا تو دل تو جب ہی خطرہ محسوس کررہا تھا۔ مگر حکیم صاحب کے اطمینان دلانے پر ارادہ کرلیا۔ وائے بدقسمتی کہ جس روز بد کا خوف تھا وہ سر پر آکر رہا۔ اور دنیا اس مقدس وجود سے محروم ہوگئی جس کے علم و تقدس کی روشنی دنیائے اسلام کو منور کررہی تھی۔ موت العالِم موت العالَم کا صحیح مصداق یہی سانحۂ عظمیٰ ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات حسرت آیات پر صرف آپ ہی کے آنسو نہیں نکلے دنیائے اسلام کی آنکھیں اشکبار ہیں۔ آج دنیائے علم و تقدس میں وہ حادثہ پیش آگیا جو ناقابل تلافی ہے۔ حضرت اقدس آپ ہی کے باپ نہیں تھے امت مرحومہ کے باپ تھے علم دین کی پناہ تھے۔ تقدس کی روح تھے۔ اور اعلائے کلمۃ الحق کے مژدہ اور اسوہ تھے۔

آہ ثم آہ کہ آج یہ دولت بے بہا ہم سے چھن گئی اور میں جس کی آنکھیں اس ہستی کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوتی تھیں آخری دیدار سے بھی محروم رہ گیا۔ تاہم محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد زخمی دلوں کے لئے مرہم ہے الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ۔

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کو فردوس اعلیٰ عطا فرمائے اور آپ کو اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب بہنوں اور بھائیوں کو رہتی دنیا تک قائم رکھے اور حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کا صحیح جانشین بنائے۔ آمین۔

اطلاع ملنے پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہوائی جہاز سے ہی پہنچ جاؤں اور آخری دید سے فیضیاب ہوسکوں لیکن افسوس کا بیاب نہ ہوسکا۔ کیونکہ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ تجہیز و تکفین دس گیارہ بجے دوپہر تک ہوجائے گی۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔ ان اللہ مع الصابرین۔

دعاگو محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ   یکم جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

پروفیسر ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکرمی ومحترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اخبارات سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارتحال کی اطلاع ملی۔ میں سفر میں تھا۔ اب واپس ہوا ہوں۔ اس حادثہ میں ہندوستان کے تمام مسلمان مستحق تعزیت و ہمدردی ہیں۔ ایک اہم دینی وعلمی ستون اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد

یہ ایک قومی وملی حادثہ ہے اور ایک عظیم الشان خسارہ۔ مفتی صاحب کا بدل ملنا آسان نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس بات پر قادر ہے کہ امت مسلمہ کو پھر وہی دل ودماغ عطا فرمائے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ سے ذاتی نیازمندی کی بنا پر یہ دو سطریں لکھ دیں ورنہ حادثہ ہم جیسوں کے اظہار تعزیت سے بالاتر ہے اللہ تعالیٰ آپ کے خاندان پر اپنا فضل رکھے۔ اور اسلاف کرام کے راستے پر چلائے کہ اس کی زندگی اور موت قابل رشک ہے۔

والسلام نیازمند ابوالحسن علی

۳۷ گوئن روڈ۔ لکھنؤ۔

مولانا مولوی سید عابد وجدی الحسینی بھوپالی (فاضل دیوبند)

سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ کھولاپور ضلع امراوتی

حال قاضی ریاست بھوپال

ذوالمجد والکرم حضرت اخی المحترم زیدت الطافکم۔ سلام مسنون!

مخدوم العالم علامۃ العرب والعجم حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ سابقۃ کے حادثۂ ارتحال پرملال کی خبر اخبار کے ذریعے سے ابھی ملی۔ دل دھک سے ہوگیا۔ قلبی صدمہ ہوا۔ ارشاد وہدایت، درس وفتوی کا آفتاب جو ہمارے سروں پر ضوفگن تھا بحکم ربی غروب ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

موت العالم موت العالم کے مصداق آج ہمارا ملک یتیم ہوگیا۔ حالانکہ عرصہ دراز سے حضرت مرحوم ومغفور کے فیوض و برکات اور زیارت سے دوری کی وجہ سے محرومی تھی لیکن قلب معمور معلوم ہوتا تھا۔ آخری زیارت ولقاء حیدرآباد میں جلسۂ جمعیۃ میں ہوئی۔ اب وہ صورت مبارکہ اس دنیا میں کہاں نظر آسکے گی، ایسے متبحر وپاکباز نفوس دوبارہ

کہاں پیدا ہوں گے ؟

فیا اسفا ! واحسرتا ! ایک مجبور و رنجور انسان کے قلب پر جو کیفیت و حالت ہے تو آپ کے رنج و غم کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ پروردگار عالم ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آپ سے ایک شفیق و بزرگ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا لیکن یہاں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرجع علم و ادب مرکز فتوی و تقوی سے سارا عالم محروم ہوگیا۔ بہرحال پروردگار عالم کی مرضی یہی ہے۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اس کا قانون یہی ہے جو ہم کو اباً عن جدٍّ ورثہ میں ملا ہے۔

سبقتا الی اللہ نیا ولو عاش اھلھا ۔ متعنا بھا عن جیئہ وذھابہ

میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کی تعزیت کر سکوں بجز اس کے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے واقعہ کو تازہ کر کے صبر کیا جا سکے۔

وللواجد المکروب من زفراتہ سکون عزاء او سکون لغوب

بارگاہ حق سے دست بدعا ہوں کہ وہ آپ کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین !

دو تین سال سے احقر بھوپال سے ترک وطن کر کے یہاں برابر مقیم ہے اور اسلامی مدرسہ چلا رہا ہے بحمدہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں سے مع اہل و عیال بخیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ مع جملہ متعلقین بھابھی صاحبہ و عزیزان سلمہم اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں گے۔ سب کو سلام و دعا و مکرر تعزیت۔

خوید کم سید عابد وجدی الحسینی بھوپالی

۵ر جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت مرحوم و مغفور کی روح پاک کو قرآن پاک پڑھا کر ایصال ثواب مدرسے کی جانب سے کیا گیا۔ اور جماعتی طور پر بھی۔ اللہ تعالیٰ مقبول فرمائے۔ وجدی

جناب فاضل اکرم مالک رام صاحب

نمائندہ شعبہ صنعت و حرفت حکومت ہند

از اسکندریہ (مصر)

۲ر جنوری ۱۹۵۳ء

میرے کرم فرما۔ سلام نیاز قبول فرمایئے۔

کل ریڈیو سے حضرت علامہ مفتی صاحب مرحوم و مغفور کی سنانی سُنی۔ آخر جس بات کا دھڑکا اتنے دن

سے لگا ہوا تھا وہ ہو کر ہی رہی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

میرے بھائی جو نقصان آپ کا ذاتی اور علمی اور مذہبی دنیا کا خاص طور پر ہوا ہے اس کی تلافی تو اب ممکن نہیں لیکن اس بات کی تسکین ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی پوری عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ ایسی عمر جس کا ہر ہر لمحہ دینی خدمت سے مملو ہے۔ خدا ایسی خدمت کا موقعہ اور ایسی موت ہر ایک کو دے۔ آمین!

جو مرتا ہے اس کی جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہو جاتی ہے۔ خلف اپنے سلف سے ہر پہلو سے کم تر ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی طرف سے ان کے کاموں کو جاری رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں جن سے ان کے نیک نام پر دھبہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

آپ کو صبر و شکر کی تلقین کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان سے رحم و کرم اور چشم پوشی کا سلوک کریں۔ اور انھیں اعلیٰ علیین میں اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

والسلام والاکرام　　　　　　　　خاکسار مالک رام

حضرت مولانا محمد کفیل صاحب فاروقی استاد مدرسہ عالیہ کلکتہ

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

۳۱ دسمبر ۵۲ء اور یکم جنوری ۵۳ء کو میں مکان سے کلکتہ آتے ہوئے ریلوے سفر میں تھا۔ یہاں پہنچ کر دفعتہً حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کے حادثہ فاجعہ کا علم ہوا۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ میری کیا کیفیت اس وقت ہوئی۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ باوجود عزم کے دہلی عیادت کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔

میری آخری ملاقات حضرت مفتی صاحب سے غالباً ۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی۔ میں اس زمانے میں وہاں مدرس تھا۔ مجھے بار بار وہ علمی مجلس جس میں حضرت مفتی صاحب، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ اور یہ ناچیز تینوں جمع تھے یاد آتی ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اثنائے گفتگو میں ایک جملہ مدحیہ حضرت شیخ الادب کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا وہ بھی یاد آتا ہے۔ فرمایا تھا کہ مولوی کفیل صاحب جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ شیخ الادب ہی نہیں شیخ الفقہ بھی ہیں۔ میں اس وقت اس کا مطلب یہی سمجھا تھا کہ اہم مسائل میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی طرف رجوع کیا کرو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت شیخ الادب صاحب حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ مجھے

مفتی صاحب کے فقہی تعارف سے اس امر کا احساس ہوا تھا کہ ہمارے یہ بزرگ کس طرح اپنے متوسلین اور شاگردوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اظہارِ حق میں اپنی بے نفسی اور پاکبازی کا ثبوت دیتے ہیں۔

آہ! میں مفتی صاحب کو کہاں تلاش کروں اور علم و عمل میں ایسی جامع ہستی کو کس جگہ دیکھوں۔ یقین فرمائیے کہ بعض حیثیات سے میرے لئے یہ صدمہ اپنے باپ کے صدمے سے بڑھا ہوا ہے۔ میرے والد مرحوم نے جو کہ حضرت مولانا گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کے مخصوص مریدین میں سے تھے۔ جب رحلت فرمائی تو میرے لئے یہ صدمہ نہایت روح فرسا تھا۔ بہت سے تعزیتی خطوط اعزا و احباب اور بزرگوں کے آئے تھے۔ مگر جملہ خطوط میں سے دو خطوں نے میرے صدمہ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ ایک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کا تعزیتی خط تھا اور دوسرا حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صاحب مدظلہٗ کا نینی جیل الہ آباد سے لکھا ہوا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ارقام فرمایا تھا کہ "آپ کے والد ماجد صاحب کا خاتمہ ایمان پر ہوا" خدا جانے یہ الہامی جملہ کیا اثر رکھتا تھا کہ میرے غم کی کیفیت ہی بدل گئی۔ میں اسی جملے کو اپنے ایقان و اذعان کی بنا پر آپ کے لئے دہراتا ہوں۔ مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب "آپ کے والد ماجد صاحبؒ کا خاتمہ ایمان پر ہوا"۔ میں اسی جملے پر اپنا تعزیت نامہ ختم کرتا ہوں۔ اور حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جناب احدیت عز اسمہٗ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور آپ کو حضرت مفتی صاحب کا صحیح جانشین ثابت کرے۔ میری طرف سے اپنے جملہ اعزا و اقربا کی خدمت میں اظہارِ تعزیت فرمائیے گا اور یہ خراج عقیدت حضرت مفتی صاحب کی یاد میں بعنوان "یادِ مفتی اعظم" اس کو الجمعیۃ میں بغرض اشاعت دیدیجئے۔

۸ رجنوری ۱۹۵۳ء

یادِ مفتی اعظم (نور اللہ مرقدہٗ)

(اثر خامہ حضرت مولانا محمد کفیل صاحب فاروقی مدظلہٗ)

سکونِ دیدۂ پُرنم کجائی؟ — قرارِ نالۂ پیہم کجائی؟
غم آگیں را علاجِ غم کجائی — برائے زخمِ دل مرہم کجائی
شمیمِ گلشنِ آدم کجائی — نسیمِ رحمتِ عالم کجائی
نیازِ سجدۂ پیہم کجائی — نمازِ بندۂ اکرم کجائی
فروغِ شمعِ ایمانم کجائی — بہارِ جلوۂ روحم کجائی
تہی سجادۂ فضل و کمال است — کجائی مفتیٔ اعظم کجائی؟

کنوں آئینۂ معنی و صورت — فرشتہ زادۂ آدم کجائی
غزالی بوعلی طوسی و رازی — جنید و شبلی و ادہم کجائی
بہائے تربتِ آں مرقدِ پاک — سلیماں مہر و جامِ جم کجائی
نثارِ عارضِ آزادیٔ ہند — اسیرِ کاکلِ برہم کجائی
سلامم بیکراں بر رُوحِ اقدس — فدائے فخرِ دو عالم کجائی
زمضرابِ قضا بشکست تارے — خدارا نغمۂ سازم کجائی

کفیلؔ از صبر و اجرش بے خبر نے
امیرِ کارواں! تاہم کجائی؟

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی

از پانی پت

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۷ رجنوری ۱۹۵۳ء)

حضرت مفتی اعظمؒ کی وفات سے دنیائے اسلام کے علمائے کرام کی صف میں جو جگہ خالی ہوگئی ہے بظاہر اس کے پُر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور اس اعتبار سے اس حادثہ پر رنج اور غم کا جس قدر بھی اظہار کیا جائے کم ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر ایک مخلص اور مشفق بزرگ کے سایہ سے محروم ہوگیا ہوں۔ آج سے ۴۴ سال قبل ۱۹۰۹ء میں مجھے پہلی بار حضرت مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ اور اس صدی کی دوسری دہائی کے آغاز ہی سے ملک کی آزادی کی تحریک کے ساتھ وابستگی کے باعث یہ تعلق روز بروز استوار تر ہوتا گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طویل مدت میں میں نے ایک ملاقات میں بھی یہ بات محسوس نہیں کی کہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک ممتاز رہنما اور دنیائے اسلام کے ایک متقدر عالم باعمل کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس کے برعکس میرے ساتھ حضرتؒ کا طرز عمل ہمیشہ ایک مشفق اور مخلص دوست جیسا رہا۔ اور آج جب حضرت مفتی صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر اپنے ایک بزرگ اور سرتاپا اخلاص و شفقت دوست سے محروم ہوگیا ہوں۔ اللہ تعالےٰ حضرت کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کے علاوہ مجھ ایسے خدام کو بھی صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

(نوٹ) تعزیتی جلسوں اور تجاویز و پیغامات کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ ہندوستان پاکستان کے تمام دینی، ملی، اصلاحی، ادبی، قومی اور سیاسی اداروں میں تعزیتی جلسے ہوئے اور تجویزیں پاس کی گئیں۔ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے دیہات و قصبات میں اور شہروں کے ہر ہر محلے میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ایصال ثواب کیا گیا۔ انفرادی طور پر بھی تعزیتی خطوط کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ افسوس کہ اس مختصر مجموعے میں ان تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے۔ (واصف)

اکابر اور اعزاء و احباب کی تعزیت کا شکریہ

(الجمعیۃ مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۳ء)

آخر وہ وقت آپہنچا جس کا اندیشہ تھا۔ یعنی چار ماہ کی صبر آزما علالت کے بعد حضرت والد محترم مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب (قدس سرہٗ) ہم سب کو مضطرب چھوڑ کر ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ بوقت ۱۰½ بجے شب عازم ملک بقا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شدت غم سے آنکھیں اشکبار اور حواس پراگندہ ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایسے سفینہ کا مسافر محسوس کر رہا ہوں جس کا بادبان ٹوٹ گیا ہو اور وہ طوفان میں گھر کر تھپیڑے کھا رہا ہو۔

خود بخود دل ہے کہ افسردہ ہوا جاتا ہے	کیا بتاؤں تمہیں کیا مجھ پہ پڑی ہے افتاد
آہ کچھ ایسا مرے دل کو اجاڑا غم نے	جیسے دلی کو زمانے نے کیا تھا برباد
اشک آنکھوں میں نہیں طاقت فریاد نہیں	کون اب ان کو سنائے گا ہماری روداد
میری غیرت پہ کوئی حرف نہ آئے یارب	ہے اُدھر تاک میں بجلی تو اِدھر ہے صیاد

صورت موج صبا تو نے کیا رم ہم سے
تیری منزل نہ تھی یہ کارگہ کون و فساد

حضرت مفتی اعظم کی ذات والا صفات ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا مشترک سرمایہ اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان دولت تھی۔ میرے محترم اکابر اور عزیز احباب نے جن تاثرات کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے باعث فخر اور موجب مباہات ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے احباب اور مرحوم کے تلامذہ اور ان سے نیازمندانہ و محبانہ تعلق رکھنے والے حضرات کے بے شمار خطوط و پیغامات آچکے ہیں، اور آرہے ہیں۔ میں ان سب حضرات کی حوصلہ افزائی اور ہمدردی کا بے انتہا ممنون ہوں اور ان کی مخلصانہ

توجہات کا با چشم تر وآہ سرد شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ اور درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایصال ثواب کی مسنون صورتوں کے ساتھ حضرت مرحوم کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ان کے عظیم الشان حقوق کا بدلہ اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے ۔

(حفیظ الرحمٰن واصف)

جنازہ کا منظر

(ماخوذ از اخبار نئی دنیا وغیرہ مورخہ ۲، و۳ جنوری ۱۹۵۳ء)

یکم جنوری ۱۹۵۳ء ۔ ستر کروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا حضرت مفتی اعظم کی وفات کی خبر رات کو جونہی شہر میں پھیلی ہر طرف سناٹا چھا گیا ۔ شہر کے تمام مسلم علاقوں میں کاروبار بند ہو گئے ۔ اور ہر قسم کی دوکانیں مفتی صاحب کے غم میں آج بند ہیں ۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کی بھی دوکانیں بند ہیں ۔ شہر میں بعض جگہ ماتمی سیاہ جھنڈیاں بھی اظہار غم کے طور پر لگا دی گئی ہیں ۔ ہر طرف سناٹا ہے اور اداسی چھائی ہوئی ہے ۔ آج مذبح بھی بند ہے ۔

نماز فجر کے بعد ہی مفتی صاحب کے مکان کے باہر لوگوں کا ہجوم ہو گیا تھا ۔ اور بڑھتا جا رہا تھا ۔ ایک طرف بازار چتلی قبر تک اور دوسری طرف دریا گنج تک سڑکیں بھر گئی تھیں ۔ مجمع کی طرف سے آخری دیدار کی خواہش کی جا رہی تھی ۔ زنانہ مکان خواتین سے بھر گیا تھا اور اس طرف کی گلی میں بھی خواتین کا ہجوم تھا ۔ غرضکہ ۷ بجے زیارت شروع ہوئی ۔ چہرۂ مبارک سے کفن ہٹا دیا گیا تھا ۔ مردانہ مکان کے چھوٹے سے صحن کے بیچ میں جنازہ رکھا تھا ۔ لوگ ایک قطار کی صورت میں آرہے تھے ۔ یہ قطار بازار چتلی قبر سے مکان تک مسلسل رواں تھی ۔ زیارت کے وقت منتظمین کی ہدایت تھی کہ کوئی صاحب ٹھہر کر زیارت نہ کریں برابر چلتے رہیں ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس لائن کو روک دیا جاتا تھا اور خواتین کو اسی طریقے سے زیارت کا موقع دیا جاتا تھا ۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ لائن میں زیادہ تر آدمیوں کے آنسو رواں تھے ۔ غرضکہ ایک عجیب سکون ووقار اور محیر العقول نظم وضبط کے ساتھ یہ لائن بارہ بجے تک مسلسل چلتی رہی ۔

اس کے بعد میت کو زینہ پر سے اتارا گیا ۔ اور گلی میں لاکر مسہری میں رکھا گیا ۔ تقریباً سوا بارہ بجے جنازہ اٹھا ۔ اس وقت ایک عجیب رقت انگیز منظر تھا ۔ کوچہ چیلاں سے جامع مسجد تک سڑکیں اور گلیاں ہزاروں روتے ہوئے انسانوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ کچھ تو بڑے زور زور سے رو رہے تھے اور بعض کے چہرے نہایت غمگین اور اداس تھے ۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں پر رو رہی تھیں ۔ مرحوم کے مکان سے

جامع مسجد تک آدمی ہی آدمی تھا۔ لوگ غم و یاس کے عالم میں اپنے مذہبی پیشوا کے آخری دیدار کے منتظر کھڑے تھے۔

جنازے کو جن چار حضرات نے پہلے اٹھایا ان میں آگے حضرت مفتی اعظم کے خلف اکبر مولوی حفیظ الرحمان واصف اور حکیم شریف الدین صاحب بقائی تھے۔ جب جنازہ چلا تو بارش شروع ہوگئی۔ تقریباً سوا بجے جنازہ پریڈ گراؤنڈ (میدان درمیان لال قلعہ و جامع مسجد) پہونچا۔ باوجود سخت سردی اور بارش کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جنازہ کی مسہری میں لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی کندھا نہیں دے سکے۔ جنازے کے مجمع میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہر فرقے کے لیڈر اور عوام شریک تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ مگر وہ وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے۔ شب گزشتہ کو دہلی کی مشہور درگاہ صابریہ کے سجادہ نشین شیخ طریقت پیر جی کرار حسین صاحب کی بھی وفات ہوگئی تھی۔ ان کا جنازہ بھی یہیں پہنچ چکا تھا۔ اور مفتی اعظم کے جنازہ کے برابر ہی رکھا ہوا تھا۔ ایک سالک طریقت کا اور ایک عالم شریعت کا دونوں جنازوں کی ایک نماز ہوئی جو حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ کے بالکل قریب اگلی صف میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور ان کے فرسٹ سکریٹری مسٹر عبد الرحمٰن اور اسٹاف کے کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔

نماز جنازہ ایک لاکھ آدمیوں نے پڑھی۔ اس کے بعد جس وقت جنازہ چلا تو دہلی دروازہ تک ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے۔ جنازہ کا فقید المثال منظر قابل دید تھا۔ ہر شخص اس ہستی کی عظیم الشان موت پر رشک کر رہا تھا جس کی عقیدت میں لوگ جوق در جوق دہلی اور بیرون دہلی سے چلے آرہے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ سے دہلی دروازہ تک کی وسیع سڑکیں انسانوں کا ایک سمندر معلوم ہوتی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف ہندو مسلمان سکھ عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ اور جامع مسجد کی سیڑھیوں اور مشرقی دروازہ اور دو طرفہ دالانوں میں ہزاروں مسلم خواتین اپنے مرحوم پیشوا کے جنازے کے آخری دیدار کے لئے بھری ہوئی تھیں۔ اتنے عظیم الشان ہجوم کا کنٹرول قدرت ہی کر رہی تھی۔ نہ فوج کی ضرورت پیش آئی نہ پولیس کی۔

دہلی دروازہ کے باہر پہنچ کر جنازہ ایک بڑی سی ایمبولنس کار میں رکھا گیا۔ اور مہرولی کی طرف چلا۔ گورنمنٹ کی طرف سے فری بسوں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ اپنے پیسے خرچ کر کے بسوں کاروں اور تانگوں میں مہرولی جا رہے تھے۔ (دہلی دروازے سے مہرولی کا فاصلہ گیارہ میل ہے) ساڑھے چار بجے جنازہ مہرولی پہنچا اور ظفر محل کے پاس جا کر رُکا۔ بعد نماز عصر میت کو قبر میں اتارا گیا۔ قبر میں اتارنے سے پہلے نماز عصر کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا قاری محمد طیب صاحب،

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جو دیو بند سے دہلی پہنچ چکے تھے آخری دید کے لئے تشریف لائے۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولوی حفیظ الرحمان واصف نے قبر میں اتر کر میت کو لحد میں رکھا۔ تقریباً مغرب کے وقت ہزاروں انسان اپنی اس جلیل القدر اور گراں مایہ دولت کو سپرد خاک کر کے واپس ہوئے۔

تجہیز و تکفین اور مہر دلی تک کے تمام انتظامات میں شہر کے تمام محلوں کے سرکردہ حضرات نے اور خاص کر پہاڑی بھوجلا کے جاں نثار اور عقیدتمند لوگوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہروں میں مفتی اعظم کی غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا کی گئی۔

اب مفتی اعظم نمبر کے مضامین شروع ہوتے ہیں:۔

تاثرات

از شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ ۔۔۔ وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

زمین ماتم ار سپہر بقانون گریستے ۔۔۔ از چشم اختران ہمہ شب خون گریستے

حضرت مولانا المفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اگرچہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے علوم عقلیہ و نقلیہ کا استفادہ کیا۔ مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی وہ بہت ہی کم کو نصیب ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتداء ہی سے نہایت ذکی، سمجھدار مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ آپ کو علوم عقلیہ اور نقلیہ سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ تقریر و تحریر کے میدانوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں بازی لے گئے۔

اخلاق فاضلہ میں خداوند عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر و تفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملہ کی گہرائی اور آخری تہہ تک پہونچنا آپ کی ذکاوت کا ہمیشہ شاہکار رہا ہے۔

جس طرح آپ بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، دوراندیش زیرک، دقیقہ رس سیاست داں تھے ایسے ہی

آپ بہترین مدرس اور استاد بھی تھے۔ دقیق وغامض مضامین کے سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔

علمی کمالات کے ساتھ حسن خط کی دولت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ خطاطی گویا فطری جوہر تھا۔ چنانچہ نسخ اور نستعلیق دونوں قسم کے خطوں پر آپ بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔

تحریک آزادی وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیۃ علماء ہند کی رہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال کا ثبوت ۱۹۱۸ء سے لے کر وفات کے وقت تک دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ قومی لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔

شہرت طلبی اور نام ونمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس سے ہو کر نہیں گذری تھی سفروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قدم بقدم اور آسمانِ تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ باوجود اعلیٰ قابلیتوں کے (جن کے ذریعہ وہ بڑی سے بڑی عزت، شہرت اور دولت حاصل کرسکتے تھے) آپ نے یکسوئی اور گمنامی کے گوشہ میں ساری زندگی گذار دی۔ بہرحال حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات اور جدائی نے ہم خدام جمعیۃ کی کمر توڑ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لَا يُدْرِكُ الْوَاصِفُ الْمُطْرِيْ خَصَائِصَهُ[۳] وَلَوْ سَابِقًا فِيْ كُلِّ مَا وَصَفَا

حَلَفَ الزَّمَانُ لَيَأْتِيَنَّ بِمِثْلِهِ[۴]

حَنِثَتْ يَمِيْنُكَ يَا زَمَانُ فَكَفِّرِ

فَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ وَخَلَفَ عَلَيْنَا بِخَيْرٍ۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

---

[۱] ترجمہ:۔ قیس کی وفات ایک آدمی کی وفات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قصرِ ملت کے ستون گر گئے ہیں۔

[۲] ترجمہ:۔ یہ ایک ایسا ماتم ہے کہ اگر آسمان بھی قاعدہ سے رونا چاہے تو تاروں کی آنکھوں سے تمام رات خون کے آنسو روئے۔

[۳] ترجمہ:۔ حد سے بڑھ کر تعریف کرنے والا (جو ہر ایک وصف کے بیان کرنے میں سب سے بڑھا ہوا اور بے نظیر ہو) آپ کی خصوصیات کے بیان کرنے سے قاصر رہے گا۔

[۴] ترجمہ:۔ زمانہ نے قسم کھائی کہ آپ کی مثال پیش کرے گا۔ اے زمانہ تیری قسم پوری نہیں ہوئی لہٰذا کفارہ ادا کر۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند

(تقریر باجلاس کانگریس کمیٹی منعقدہ ۴ر جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اردو پارک دہلی)

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر ڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عظیم مقصد دین علم اور ملک کی خدمت کرنا تھا۔ وہ ایک مستند عالم تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کا یہ فرض تھا کہ وہ دینی خدمات کرتے رہیں۔ چنانچہ تمام زندگی انہوں نے اس مقصد کے لئے گذار دی۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی شاہ جہاں پور میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد دیوبند میں انھوں نے اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہونچایا۔ دہلی آئے اور اپنی تمام زندگی علم دین کی خدمات کرنے میں بسر کر دی۔ مدرسہ امینیہ میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ بیس اور پچیس روپیہ کے درمیان تھی۔ اس وقت مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا۔ بعد میں جب مدرسہ امینیہ کشمیری دروازہ منتقل ہو گیا تو وہاں درس دینے لگے وہ ایک معمولی تنخواہ پر اپنا گذر کرتے رہے (درحقیقت حضرت مفتی صاحبؒ نے اُن علماء کی آنکھیں دیکھی تھیں جو اپنی خوشی سے غریبی کی حالت میں اپنی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے)۔

وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں، چنانچہ اس کام میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت سے برابر اُن کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ اُن کی ہمت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دور میں بہہ گئیں، لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی اُن پر نہیں پڑی۔ انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس راستہ سے قدم نہیں ہٹایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح ہم سے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، اور ہندوستان کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند

(تقریر با جلاس کانگریس کمیٹی منعقدہ ۴ جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اردو پارک دہلی)

آج سے ۳۳ سال پیشتر تحریک خلافت کے زمانہ میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ دہلی آیا تھا تو مفتی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وائسرائے کے پاس ایک وفد بھیجنے کے سلسلہ میں گاندھی جی کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس زمانہ میں خلافت کمیٹیوں کے جلسے بھی ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب ایک جلسہ میں گاندھی جی نے اپنی تحریک "ترک موالات" کا ذکر کیا تو کچھ لوگ پیچھے ہٹے، کچھ نوجوانوں نے قبول کیا اور کچھ سن رسیدہ بزرگوں نے اس سے اختلاف کیا کیونکہ یہ تجویز ایک انوکھی تجویز معلوم ہوتی تھی لیکن حضرت مفتی صاحب نے اس تحریک کی حمایت کی کیونکہ یہ ایک صاف اور سچی تجویز تھی۔ اس کے بعد کانگریس نے باضابطہ طور پر اس تحریک کو منظور کیا۔ جہاں اور لوگ اس تحریک کو قبول کرنے میں جھجکے وہاں حضرت مفتی صاحب کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک سیدھے، قابل، صاف اور ستھرے ذہن کے انسان تھے۔ ایسے آدمی کم ہوتے ہیں اور ایسے ہی آدمی کی قدر کی جاتی ہے۔ ان کے گزرنے کا افسوس ہے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک شان کے ساتھ گزاری، آزادی کے بعد سے اب تک کے زمانہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو بہت سی باتیں ایسی ہوئیں اور بہت سی تحریکیں ایسی چلیں جن سے دکھ ہوا۔ اور جو ناگوار گذریں۔ ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک گرہ کھولتے ہیں تو دو گرہیں بندھ جاتی ہیں۔ اگرچہ دنیا کی حالت ہندوستان سے بہت زیادہ خراب ہے۔ پھر ہم یہ سوچتے ہیں کہ جن خیالوں کو ہم لے کر چلے تھے آج کے مسائل کو حل کرنے میں وہ کہاں تک موزوں ہیں۔ تیس برس کی تعلیم جو معقول تعلیم ہے ذہن سے نہیں ہٹتی۔ وہ باتیں جو بظاہر ملک منظور کر چکا تھا بعض لوگ اب انہیں منظور نہیں کرتے اور ایسے راستہ نکالتے ہیں جن سے نفاق جھوٹ اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ملک کو آگے بڑھانا ہے وہ بھول گئے ہیں کہ آزادی کی نگرانی کے لئے صرف فوجیں کافی نہیں ہوتیں وہ تو صرف بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ بلکہ اس کے لئے ذہنی اخلاص کی ضرورت ہے، آزادی سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے تھا۔ وہ آزادی کے بعد آج بھی موجود ہے جو سبق ہم نے سیکھا اس پر عمل کیا اور جن لوگوں سے سبق حاصل کیا ان میں مفتی صاحب ایک خاص آدمی تھے۔

سیاسی میدان میں بہت سے لوگ آئے لیکن ایسی سادگی کی مثال نہیں ملتی۔ لوگ عہدوں کے بھوکے ہوتے ہیں مفتی صاحب اگر پسند فرماتے تو وہ ہر عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ افسوس وہ گذر گئے لیکن مجھے امید ہے کہ انکو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔

حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ

از مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف

مرے ہر سانس سے ہے کاوشِ ضبط فغاں پیدا
کہ گلشن میں نہیں ہے آج کوئی رازداں پیدا

یہ کس کا قصۂ غم صفحۂ فطرت پہ لکھا ہے
کہ ہر نقطے سے ہے اک لمحۂ شوقِ نہاں پیدا

رگِ خس میں دلِ بُلبُل کا خونِ گرم جاری ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے مزاجِ آشیاں پیدا

سکوتِ گل پہ کتنے چہچے قربان ہوتے ہیں
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے اک طرزِ بیاں پیدا

تری کوتاہ بینی دوسروں کی قدر کیا جانے
بانداز نظر ہوتا ہے اوجِ آسماں پیدا

ابھی اک اہلِ دل اس جادۂ ہستی سے گزرا ہے
بہر نقش قدم ہے گلستاں در گلستاں پیدا

خزانہ علم و حکمت کا چھپا کر لوگ آئے ہیں
ہوا ہے خاکِ مہرولی میں اک تازہ جہاں پیدا

اٹھا کر ایک مشتِ خاک دیکھو چشمِ باطن سے
تو ہوگا ایک اک ذرے سے گنج شائگاں پیدا

سکھایا اک فقیر رازداں کی موت نے واصف
کہ یوں مر کر کیا کرتے ہیں نامِ جاوداں پیدا

تاریخ وفات

نتیجہ فکر جناب حافظ عبید اللہ البصیر صاحب ٹونک

وَاعْفُ عَنَّا ، وَاغْفِرْ لَنَا ، وَارْحَمْنَا

۶   ۱۹   ۵ ۳

قطعۂ تاریخ

از جناب مولوی مظہر عبدالحق صاحب اشہر پیارم پیٹی مدراس

آہ حضرت مفتیٔ اعظم بنزدِ حق رسید
حاملِ عرفان و علم و سرِّ محمودؒ و رشیدؒ

اخترِ کامل ، ولادت عبدہٗ عمرش بود
ازولی مغفور - اشہر سالِ فوت آید پدید

۱۲۹۲   ۸۱   ۱۳۷۲ھ

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

(اداریہ مفتی اعظم نمبر اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۵۳ء)

از مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے جس خصوصی نمبر کا مژدہ آپ کو بار بار سنایا گیا تھا وہ آج آپ کی خدمت میں حاضر کیا جا رہا ہے۔ حضرت کی زندگی کے جن گوشوں کو نمایاں کرنے اور جن پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت تھی ان پر زیر نظر نمبر میں ایک حد تک روشنی ڈالی گئی ہے اور اہل قلم کے ذی علم طبقہ نے ان پر کافی توجہ فرمائی ہے۔ اس لئے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ یہاں ان کا اعادہ کریں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک الگ راہ سے ناظرین کرام کی توجہ چند خاص باتوں کی طرف مبذول کرائیں، اور دور اور نزدیک کے لوگوں کو بتائیں کہ اس خاص نمبر کی اشاعت کیوں ضروری سمجھی گئی؟ اور افادیت کے نقطۂ نظر سے اس کا پیش کرنا کیوں اہم قرار پایا! جو لوگ مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بلند پایہ اور عدیم النظیر شخصیت سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کی نظر میں ممکن ہے کہ اس خصوصی نمبر کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو اور وہ اسے بھی پروپیگنڈہ کی شکل دینے کی جرأت کر بیٹھیں۔ لیکن جو لوگ حضرت کی علمی جلالت اور اجتہادی منزلت سے واقف ہیں وہ اعتراف کریں گے کہ اس نمبر کی اشاعت نہ صرف وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے۔ بلکہ یہ ان خدمات کا کم سے کم اعتراف ہے جو مرحوم نے ساٹھ سال کے طویل و عریض عرصہ میں انجام دیں اور جن کا شاندار ریکارڈ ایک زندہ قوم کے لیے باعث فخر و مباہات ہونا چاہیئے۔ اگر ہم مشہور شعراء کی برسیاں منا کر اپنے آپ کو قابلِ فخر قرار دے سکتے ہیں۔ اگر ہم فاتحین عالم کی کچھ یادگاریں قائم کر کے اپنی سعادت مندی اور فرض شناسی کا ثبوت دے سکتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی عظیم و جلیل شخصیت کا تعارفی نمبر نکالنے میں کیوں تامل ہو، جس کی علمی بارگاہ کو ہندوستان اور بیرون ہند میں نصف صدی سے زائد تک مرجعیت اور مقبولیت حاصل رہی اور جس کی اسلامی بصیرت اور فقیہانہ دانشوری نے امت کی امامت اور قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ جو رنگ ہستی منصب شریعت اور مسند افتاء پر جلوہ افروز ہو کر عالم اسلام سے خراج عقیدت حاصل کرتی رہی اور جس نے ملک کے محاذ آزادی میں شریک ہو کر قومی سیاست کو تازہ روح بخشی کیا وہ اس بات کی مستحق نہ تھی کہ ایک خاص نمبر کے ذریعہ اس کی بے داغ علمی شہرت اور بے مثال ملی اور قومی خدمات کی یاد آوری ہو اور ان کی بے ریا اخلاص کے تذکار سے دلوں کو عقیدت و عرفان کی روشنی اور حرارت پہونچے؟

آج کے جمہوری اور لادینی دور میں دینی مآثر کے نقوش روز بروز مدھم پڑتے جا رہے ہیں اور اشخاص سے

گذر کر علمی نظریات تک کو گھن لگنا شروع ہوگیا ہے اور یہ وقت کا تقاضا اور سیاسی نظام کا قدرتی نتیجہ ہے جس کو بدلنے میں کوئی مزاحمت سود مند نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر ہم اپنے معتقدات اور انکے سرچشموں پر ماحول کو اثر انداز ہونے کی اجازت دیتے رہے اور ہم نے اپنے بزرگوں کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کا تحفظ نہ کیا اور اپنی بے حسی کی بدولت اپنے مشاہیر کو خود فراموش کر بیٹھے تو یہ امت کا اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کی تلافی حال اور مستقبل کے کسی دور میں نہیں ہوسکے گی۔ مسلمانوں کے دلوں سے یوں بھی دینی علوم کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اگر انھوں نے ان اعاظم رجال کو بھی نظرانداز کردیا جن کو ہمارے اسلامی احساس کی نمود کہنا چاہئے تو یہ ہمارے باطنی ارتداد کی ایک افسوسناک علامت ہوگی اور ہم ایمان کے اس قلعہ کی حفاظت نہ کرسکیں گے جس کو اب تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا رہا ہے!

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے ایک فقیہہ، ایک مفتی اور ایک دینی پیشوا ہی نہ تھے، بلکہ عقلی اور فکری اعتبار سے بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ انھیں جو چیز امتیاز بخشتی ہے وہ ان کی مجتہدانہ بصیرت، معاملہ فہمی، اصابت رائے اور قوت فیصلہ کی بے پناہ طاقت تھی۔ معاملہ خواہ کیسا ہی معمولی ہو اس پر پوری توجہ دینا آپ کی عادت میں داخل تھا۔ فہم کی رسائی اور دماغ کی کارفرمائی کا یہ عالم تھا کہ جن مسائل کو سطح پر لانا جماعتوں کے لئے مشکل تھا آپ انھیں بہت آسانی سے روشنی میں لے آتے تھے۔ ہم جس قوت کو تدبر اور تفقہ کے نام سے پکارتے ہیں اور جو کا مصداق صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کی زندگی کے ہر قدم پر ملتا ہے۔ فقیہانہ نکتہ سنجیوں اور متکلمانہ نکتہ آفرینیوں کا تو جواب نہیں رکھتے تھے اور پھر کوئی مسئلہ خواہ سیاسی ہو یا قومی ملکی ہو یا بین الاقوامی آپ کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ اور جب آپ اس پر کوئی فیصلہ دیتے تو ماہرین کو بھی اصابت رائے کا اعتراف کرنا پڑتا اور اس پر کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی۔

ادارہ الجمعیۃ نے خدا کے فضل اور ارباب قلم کے تعاون سے اس نمبر کو پیش کرنیکی سعادت حاصل کی ہے اور حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک ایسا خاکہ پیش کردیا ہے جو کام کرنیوالوں کیلئے مشعل راہ بن سکتا ہے۔ اب یہ ناظرین کرام کا کام ہے کہ وہ مفتی اعظم کے مشن کو سمجھیں اور اسے لیکر آگے بڑھیں اور انکے تذکار سے اپنے دلوں کو گرمائیں اور اپنی اسلامیت کو اجاگر کرکے مرحوم کی روح کے لئے تسکین کا سامان بہم پہنچائیں۔

مادۂ تاریخ

از جناب مولانا بدر صاحب سنبھلی

محی الملۃ والدین مفتی کفایت اللہ رح

۲ ۷ ۱۳ ھ

رحلتِ مفتیٔ ہندؒ

از جناب مولانا یحییٰ صاحب اعظمی

ملتِ بیضا کو کیا کم تھا غمِ قحط الرجال
اس کی محفل سے اٹھا اک اور بھی اہلِ کمال

اجمل و انصاری و جوہر کا ماتم تھا ابھی
کر دیا اس تازہ غم نے اور بھی آشفتہ حال

ہوتے جاتے ہیں سبھی رخصت بساطِ ہند سے
دیکھئے اب کیا ہو اس فقدانِ ملی کا مآل

ہے صفِ ماتم بچھی ہر سو جہان آباد میں
ذرہ ذرہ بن گیا ہے پیکرِ حزن و ملال

مسندِ ارشاد و افتا حیف سونی ہو گئی
اُٹھ گیا اُف دورِ حاضر کا فقیہ بے مثال

مرجعِ اصحابِ استفتا تھی اس کی بارگاہ
اب کہاں جائیں گے امت کے یہ اربابِ سوال

عقدہ ہائے شرع، ملت کے مہماتِ امور
حل کرے گا آہ اب کس کے تفقہ کا کمال

"جرعہ خوارانِ کہن" اپنی بجھائیں تشنگی
آج انھیں کی بزم میں ہے ساقیٔ دیرینہ سال

جلوہ گر ہوتی ہے بزمِ دہر میں صدیوں کے بعد
اس وقار و سادگی و حزم و تقویٰ کی مثال

کس کی سیرت میں فضائل کا تھا ایسا اجتماع
کس کی فطرت میں مکارم کا تھا ایسا اعتدال

سادگی، تقویٰ، تفقہ، فہمِ دیں، ذوقِ جہاد
جلوہ گر سرتا قدم استادؒ کا فیضِ کمال

فقہ و دانش کا وہ خازن درس و افتاء کا امام
جس کا اٹھنا ہے سلف کے علم و حکمت کا زوال

چہرہ آرائے معارف جس کا ہر نقشِ قلم
شرحِ اسرار و غوامض جس کا ہر حرفِ مقال

اس کی ہستی ملک و ملت میں تھی یکساں محترم
تھا مسلم اس کی تدبیر و فراست کا کمال

زندگی اس کی مجسم پیکرِ حلم و وقار
سادگی اس کی سراپا آئینہ دارِ جلال

ذات اس کی مختلف اجزا کی تھی شیرازہ بند
شعلہ و شبنم کا قائم تھا اسی سے اتصال

اس کی رحلت دین و ملت کا ہے نقصانِ عظیم
آہ اب صدیوں میں بھی اس کی تلافی ہے محال

دیر تک روئے گی خون چشمِ جہانِ علم و دیں
غیر ممکن ہے مگر اس زخمِ غم کا اندمال

شہر دہلی دردِ فرقت سے نہ کیوں ہو بیقرار
آج اس کے مفتیٔ اعظم کا ہے یوم الوصال

تیرے استقبال کو حاضر ہے بزمِ قدسیاں
الفراق و الوداع اے مفتیٔ ہندوستاں

نقشِ حیات[1]

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہندؒ

از جناب مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف خلف اکبر حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

ہمیں شکرگزار ہونا چاہیئے کہ جناب واصف صاحب کے ذریعہ ہم حضرت مفتی اعظم ہند کی حیاتِ طیبہ کے بہت سے اہم پہلوؤں سے واقف ہو رہے ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ خبر اور بھی زیادہ باعثِ مسرت ہوگی کہ حضرت واصف صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کی مفصل سوانح حیات بھی تحریر فرما رہے ہیں۔ آپ کی تحقیقی اور تنقیدی نظر ہمیں یقین دلاتی ہے کہ یہ مجموعہ صرف ایک بزرگ کا تذکرہ نہیں، بلکہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا اہم باب ہوگا۔ (ادارہ)

اس سرزمین پاک جہان آباد کی عظمت و مرتبت کا کیا ٹھکانا ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں اور بڑے بڑے عظیم المرتبت علماء و اولیاء کرام کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔

نورِ جاں در ظلمت آباد بدن گم کردہٴ
آہ زاں یوسف کہ تو در پیرہن گم کردہٴ
(مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی)

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو دلی والوں نے قدیم دہلی میں سرخیل اولیاء حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے جوار میں ایسا ہی اپنا ایک خزانہ دفن کیا ہے، وہ کون تھا جس نے غریبی میں فیاضی اور داد و دہش کی اور اس طرح کی کہ اس کا دوسرا ہاتھ اس کی فیاضی کا رازدار نہ بن سکا۔ وہ کون تھا جس نے اپنے اقران میں تفقہ فی الدین کا ذوق پیدا کیا اور جس کی بے پناہ قوت اجتہاد نے علماء دین کے لئے منارۂ نور کا کام دیا، جس نے بڑے بڑے الجھے ہوئے دینی و سیاسی مسائل کو بیک جنبش نگاہ حل کیا، جو میدان سیاست کا بھی شہسوار تھا اور بحرِ شریعت و طریقت کا بھی کامیاب غواص تھا، کمالات ظاہری و باطنی کا مجموعہ اور گلزار مصطفوی (علی صاحبہا التحیۃ والتسلیم) کا گل سرسبد تھا۔

یعنی میرے والد ماجد حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔

---

[1] میں نے اپنے مقالے کا مسودہ لکھ کر بغیر عنوان کے مولانا محمد میاں صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اور عرض کر دیا تھا کہ عنوان آپ خود تجویز فرما لیجئے۔ یہ عنوان غالباً مولانا موصوف نے ہی تجویز فرمایا۔ (واصف)

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے) آپ کے کمالات وفضائل کا بیان کرنا مجھ ناچیز کی قوت سے باہر ہے۔
کچھ مختصر حالات زندگی مشفق محترم مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند کے حکم کی تعمیل کے طور پر عرض کرتا ہوں۔

ولادت باسعادت اور خاندان آپ کی پیدائش شاہجہاں پور (روہیلکھنڈ) کے محلہ حسن زئی میں ہوئی۔ ۱۲۹۲ھ سن پیدائش ہے۔ آپ کے والد کا نام شیخ عنایت اللہ، ابن فیض اللہ، ابن خیر اللہ ابن عباد اللہ۔ یہ سلسلہ نسب شیخ جمال یمنی سے جاکر مل جاتا ہے۔
اس لحاظ سے آپ کا اجدادی وطن جزیرۃ العرب کا جنوبی ساحلی خطہ یمن ہے۔ یہ لوگ موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ بحرین سے موتی خرید کر ہندوستان، لنکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں لاکر فروخت کرتے تھے۔

قدیم زمانہ میں یمن سے اسی طرح سوداگروں کا ایک قافلہ جہاز پر سوار ہوکر سمندر کی سطح پر روانہ ہوا۔ ہندوستان کے ساحل پر پہونچنے سے قبل طوفان نے آگھیرا۔ جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ مسافر غرق ہو گئے۔ قافلہ کے سردار کا کم سن لڑکا جس کا نام شیخ جمال تھا ایک تختہ پر بہتا ہوا ساحل تک پہونچا، ساحل سے اس کو ایک شخص جو بھوپال کا باشندہ تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ کم سن بچہ اسی شخص کے زیر تربیت رہا اور اس نے اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کردی۔ یہی شیخ جمال حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے مورث اعلیٰ ہیں۔

والد ماجد آپ کے والد شیخ عنایت اللہ نہایت نیک نفس صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ اپنے بلند کردار کی وجہ سے اپنے خاندان اور احباب واقران میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اپنے فرزند (حضرت مفتی صاحب مرحوم) کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں اس کو عالم دین بنانا چاہتا ہوں۔ غریبی ونا داری کے باوجود بہت بلند حوصلہ تھے، دو لڑکیوں کے بعد آپ کو اللہ تعالےٰ نے یہ مبارک ومسعود فرزند عطا فرمایا
وہ دن کیسا ہی مبارک دن تھا جبکہ یہ آفتاب رشد وہدایت افق شاہجہاں پور سے طلوع ہوا کس کو معلوم تھا کہ یہ نومولود ایک روز عالم اسلام کا عظیم رہبر ورہنما ہوگا۔ ان پڑھ اور مزدوری پیشہ خاندان کا چشم وچراغ، گدڑی کا لال عالم اسلام کا منارۂ راہ ثابت ہوگا۔ بچپن سے ہی پیشانی پر ستارۂ بلندی چمک رہا تھا کھیل کود کی طرف سے بے رغبتی اور تعلیم وتفکر کی طرف رجحان تھا۔

تعلیم پانچ برس کی عمر میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں تعلیم شروع ہوئی۔ قرآن شریف اسی مکتب میں ختم ہوا۔ اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم حافظ نسیم اللہ کے مکتب واقع محلہ ورگ زئی میں ہوئی۔ محلہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن خاں صاحب کا مدرسہ اعزازیہ جاری تھا۔ مکتبوں سے فارغ ہوکر وہاں داخلہ ہوا۔ سکندرنامہ اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن خاں صاحب نے شروع کرائیں۔ مثل مشہور ہے کہ سونے پر سہاگہ۔ یہاں تو خود ہی جوہر قابل تھا۔ خدا کی شان کہ اساتذہ بھی مولانا عبید الحق خاں صاحب

جیسے مشفق، جوہر شناس اور حافظ بدھن خاں صاحب جیسے ذکی و ذہین مل گئے۔ مولانا عبید الحق خاں صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے اپنے تمام شاگردوں میں حضرت مفتی صاحب کو ممتاز و بلند مقام پر پایا۔ آپ نے شیخ عنایت اللہ مرحوم کو مجبور کیا کہ اپنے صاحبزادہ کو دارالعلوم دیوبند بھیج دیں۔ والدین وطن سے باہر بھیجنے پر راضی نہ ہوتے تھے، بڑی ردوکد کے بعد یہ طے پایا کہ فی الحال مراد آباد بھیج دیا جائے تاکہ وطن سے زیادہ دوری نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے ایک اور شاگرد حافظ عبدالمجید کے ساتھ مدرسہ شاہی مراد آباد میں بھیج دیا۔ اس وقت حضرت کی عمر مبارک تقریباً پندرہ سال، حافظ عبدالمجید صاحب کی عمر شریف تقریباً سولہ سال تھی۔ مولانا نے اپنے ایک شاگرد مولوی حکیم عبدالخالق کو ایک سال قبل مراد آباد بھیج دیا تھا۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً سترہ سال تھی۔ یہ ہاتھی خانے کی مسجد میں قیام پذیر تھے۔

مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخلہ

غریب والدین کے لئے اپنی اولاد کو جدا کرنا اور پھر اس کم سنی میں پردیس بھیج دینا بڑا کٹھن ہوتا ہے، مگر مولانا عبید الحق خاں صاحب کا تصرف باطنی کہئے یا کارکنانِ قضا و قدر کی کارسازی سمجھئے کہ یہ مسئلہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا اور یہ دونوں ساتھی مولانا کا خط لے کر مدرسہ عربیہ شاہی مسجد مراد آباد کے مہتمم مرزا حافظ نبی بیگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب مولانا کے پیر بھائی تھے، خط انھیں کے نام تھا، مگر وہ ان دنوں بیمار گئے ہوئے تھے۔ نائب مہتمم حاجی محمد اکبر خاں سوداگر نے خط دیکھ کر بڑی نوازش فرمائی اور ہاتھی خانے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے پاس عارضی طور پر ٹھہرا دیا اور بعد میں مستقل قیام کے لئے حافظ محمد اسمٰعیل وکیل کا دیوان خانہ تجویز کیا گیا۔

حافظ محمد اسمٰعیل وکیل جو مولوی سر محمد یعقوب مرحوم ایم۔ ایل۔ اے کے والد بزرگوار تھے شاہجہاں پور میں وکالت کرتے تھے اور وہیں سکونت رکھتے تھے۔ دسویں، پندرھویں دن وہ اپنے وطن مراد آباد آتے رہتے تھے۔ ان کا دیوان خانہ محلہ مغل پورہ میں واقع ہے۔ اسی میں حضرت مفتی صاحب اور حافظ عبدالمجید قیام پذیر تھے۔ وکیل صاحب مرحوم جب شاہجہاں پور سے آتے تھے تو ان تینوں ہم وطن طلبہ کے والدین ان کے ہاتھ ضروریات کی چیزیں تحفے، تحائف کپڑا، جوتا وغیرہ بھیجتے رہتے تھے۔

مراد آباد کے قیام کے دوران کھانے کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا۔ تعلیم کے دیگر اخراجات آپ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ آپ کے والد نادار تھے اس لئے وہ تعلیم کے پورے اخراجات برداشت نہ کر سکتے تھے اور نہ دوسروں کے عطیات سے طبعاً نفرت تھی۔ تحصیل علم کے تمام زمانہ میں کسی مسجد میں قیام نہیں کیا۔ اپنی کفالت کا بار کبھی کسی پر نہیں ڈالا۔ مراد آباد اور دیوبند کے قیام کے دوران میں تاگے کی ٹوپیاں کروشیا سے بنتے تھے اور فروخت کرتے تھے۔ بہت عمدہ مختلف رنگ کے ریشمی پھول بناوٹ میں ہوتے تھے۔ دو تین روز میں ایک ٹوپی تیار ہوتی تھی

دو روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ وہ کتاب میرے پاس موجود ہے جس میں قلم سے آپ نے ٹوپیوں کے مختلف ڈیزائن اور نمونے بنائے تھے۔ فن کاری اور ہنر مندی کا بہترین نمونہ ہے۔

اساتذہ مراد آباد

مراد آباد میں مندرجہ ذیل اساتذہ سے پڑھا:۔ مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی مرحوم مدرس اول تلمیذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (جو بعد میں مدرسہ عبدالرب دہلی کے صدر مدرس رہے ہیں اور وہیں وفات ہوئی) مولوی محمد حسن صاحب۔ مولوی محمود حسن صاحب سہسوانی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

مدرسہ شاہی میں دو سال تعلیم جاری رہی۔ اس کے بعد ۱۳۱۲ھ میں آپ اور مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید تینوں ساتھی دارالعلوم دیوبند میں آکر داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم مولوی محمد منیر صاحب تھے۔ اور صدر مدرس حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ تھے۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ مندرجہ ذیل اساتذہ سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ مولانا منفعت علی صاحب۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب (برادر خورد شیخ الہند) مولانا غلام رسول صاحب۔ مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی۔ دورۂ حدیث مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی اور حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔

رفقاء خصوصی

قیام دیوبند کے زمانہ میں مندرجہ ذیل ساتھی اور ہم جماعت ایسے تھے جن سے بے تکلفی تھی۔ مولوی عبدالخالق شاہجہان پوری مرحوم مولوی حافظ عبدالمجید شاہجہان پوری مرحوم۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور ان کے بھائی مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی۔ مولانا مولوی ضیاء الحق صاحب دیوبندی (حال صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی)۔

صحاح ستہ کے دورہ میں آپ کے تقریباً ۴۰ ساتھیوں میں سے قابل ذکر حضرات مندرجہ ذیل ہیں:۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ۔ مولانا محمد شفیع دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی) استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب دیوبندی (حال صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی) مولوی محمد قاسم دیوبندی مرحوم مدرس مدرسہ امینیہ دہلی۔ مولوی امین الدین ایولوی (بانی مدرسہ امینیہ دہلی)۔

قیام دیوبند کے مختصر حالات

دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا انور شاہؒ صاحب ۱۳۱۴ھ میں اور حضرت مفتی اعظمؒ ۱۳۱۵ھ میں اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی مدظلہم العالی ۱۳۱۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

دارالعلوم میں آپ کا قیام ۳ سال رہا۔ مدرسہ کے دارالاقامہ میں ہی رہتے تھے تعلیم کے زمانہ میں اپنی ذہانت و فطانت اور ذہنی صلاحیت کی وجہ سے اپنے محنتی اور جفاکش اقران سے ہمیشہ پیش قدم رہتے تھے۔ مطالعہ کم کرتے تھے مگر امتحان میں سب سے زائد نمبر حاصل کرتے تھے۔ فطانت اس بلا کی تھی کہ لوگوں کو محو حیرت کر دیتی تھی۔ چند

ساتھیوں کے ساتھ شرکت میں کھانا پکایا جاتا تھا سالن خود پکا لیتے تھے اور روٹی بازار میں ایک بھٹیاری کی دوکان سے پکوائی جاتی تھی۔ کچھ دن کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ روٹیاں ہلکی آتی ہیں اور سب ساتھی سیر نہیں ہوتے خیال ہوا کہ شاید بھٹیاری آٹا چرالیتی ہے۔ طے ہوا کہ بھٹیاری کو آزمانا چاہئے۔ جو ساتھی روٹی پکوانے جاتا وہ شروع سے آخر تک وہاں موجود رہتا اور اس کی حرکات پر نظر رکھتا۔ بہت دنوں تک تمام ساتھیوں نے جانچ پڑتال جاری رکھی مگر پتہ نہ چلا۔ حضرت مفتی صاحب خود کبھی روٹی پکوانے نہ گئے تھے۔ ایک روز فرمایا کہ آج میں جاؤں گا۔ آپ آٹا لے کر بھٹیاری کی دوکان پر گئے اور جب اس نے روٹی پکانے کے لئے پیڑے کاٹنے شروع کئے اسی وقت آپ نے اس کو ڈانٹ کر کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ وہ کھڑی نہ ہوتی تھی۔ جب حاضرین کے مجمع نے اس کو مجبور کیا اور وہ کھڑی ہوئی تو اس کی جھولی میں سے ۲۵-۳۰ پیڑے بھرے ہوئے نکلے جو اس نے اپنی چابک دستی سے گاہکوں کے آٹے میں سے چرائے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت

آپ تقریباً ۲۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہو کر دہلی آئے اور اپنے دوست مولوی امین الدین صاحب کے پاس دو تین روز قیام کر کے عازم وطن ہوئے۔ اس وقت مولوی امین الدین صاحب مسجد چھتہ شاہ جی چاوڑی بازار دہلی میں قیام پذیر تھے اور ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کی فکر میں تھے۔

سلسلہ تدریس

آپ کے اولین مربی و استاد مولانا عبید الحق خاں صاحب جو مدرسہ اعزازیہ شاہجہانپور کے اعزازی مدرس تھے بوجہ غلبہ بدعتیین کچھ بددل ہو کر ۱۳۱۴ھ میں مدرسہ عین العلم کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ جب دیوبند سے شاہجہاں پور پہنچے تو انھوں نے اپنے ہونہار اور قابل شاگرد کو درس و تدریس اور دفتری خدمات پر مامور فرمایا۔ تنخواہ غالباً پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی مالی حالت کمزور تھی اس وجہ سے ارکان مدرسہ کو کافی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور مدرسین و ملازمین کو ایثار سے بھی کام لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں مدرسین کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی اور آپ کی تنخواہ بھی ۱۸ سے ۱۶ ہو گئی۔ آپ تقریباً ۵ سال مدرسہ عین العلم میں رہے۔

رسالہ البرہان کا اجراء

اس زمانہ میں فتنہ قادیانیت کا زور تھا۔ آپ نے ضرورت کا احساس فرمایا اور ایک ماہوار رسالہ البرہان کے نام سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر آپ خود تھے اور منیجر (مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے بڑے بھائی) منشی سلطان حسن میاں تھے۔ پہلا نمبر شعبان ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ اس میں قادیانیت کے رد میں بہترین مضامین شائع ہوتے تھے۔

جس وقت آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ اس زمانہ کے آپ کے تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات مجھے معلوم ہیں:

حضرت مولانا حافظ اعزاز علی صاحب - استاذ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی حافظ ذاکر علی صاحب ایڈوکیٹ، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڈھ۔

مدرسہ امینیہ کو مولوی امین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنہری مسجد چاندنی چوک دہلی میں جاری کیا تھا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرت شاہ صاحب کچھ عرصہ کے بعد اپنے وطن کشمیر واپس تشریف لے گئے تو مولوی امین الدین صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو خط لکھا۔ ادھر مدرسہ عین العلم کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے تنخواہوں میں اضافہ کے بجائے تخفیف ہو رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے مولانا عبید الحق صاحب سے دہلی جانے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ "آپ ترقی پر جا رہے ہیں اللہ مبارک کرے، لیکن اگر خدا نے مجھ سے آخرت میں یہ پوچھا کہ تم نے مولوی کفایت اللہ کو کیوں چھوڑ دیا، تو کیا جواب دوں گا۔" آپ نے دہلی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر قدرت نے آپ کے لئے وہ جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔

دہلی تشریف آوری

رمضان ۱۳۲۱ھ میں مولانا عبید الحق صاحب کی وفات ہوگئی۔ مولوی امین الدین صاحب شاہجہاں پور پہنچ گئے، حضرت مفتی صاحب کے مکان پر ہی قیام کیا اور دہلی آنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ شوال ۱۳۲۱ھ میں حضرت مفتی صاحب دہلی تشریف لے آئے۔

مدرسہ عین العلم کے ریکارڈ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور حضرت مفتی صاحب ہی انجام دیتے تھے، تمام عملے سے پہلے مدرسہ پہونچ جاتے تھے اور سب کے بعد وہاں سے روانہ ہوتے تھے۔ حساب کتاب بہت عمدہ اور باقاعدہ رکھتے تھے۔ افتاء کا کام بھی کرتے تھے اور درس تدریس بھی۔ سب سے پہلا فتویٰ جو بہت مدلل اور مبسوط لکھا تھا۔ اس کو شاہجہاں پور کے تمام علماء نے اور خاص کر آپ کے استاد مولانا عبید الحق صاحب نے بہت پسند کیا تھا اور بڑی تعریف کی تھی۔

فرمایا کرتے تھے کہ حصول تعلیم کے زمانہ میں اگرچہ میں نے بہت کم محنت کی، مگر افتاء کے معاملہ میں بڑی احتیاط اور محنت سے کام لیا کرتا تھا۔ حصول تعلیم دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں رات کے مطالعہ کے لئے طلبہ کو سرسوں کا تیل چراغ میں جلانے کے لئے ملا کرتا تھا۔ میں رات کو مطالعہ نہیں کرتا تھا تیل کا پکوان تل کر کھاتا اور ساتھیوں کو کھلاتا تھا اس کے باوجود امتحان میں کامیاب رہتا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کروں۔ بڑی محنت اور خوب مطالعہ کرتا تھا۔ امتحان کے موقع پر ہر بار اہل

رسالہ کا پرچہ تھا۔ ایک سوال کا جواب بڑی عمدگی سے میں نے دو صفحے پر لکھا اور اسی سوال کا جواب مفتی صاحب نے آدھے صفحہ پر لکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس پرچہ کے ممتحن تھے۔ آپ نے دونوں کو برابر نمبر دیئے۔ یعنے آدھے صفحہ کا مضمون اپنے وزن کے لحاظ سے دو صفحے والے مضمون سے کم نہ تھا۔

نجی زندگی و خانہ داری آپ کی پہلی شادی اس وقت ہوئی جب کہ آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ زوجۂ اولیٰ سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے، مگر یہ دونوں بچے خورد سالی فوت ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد زوجۂ محترمہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد شرف الدین صاحب کی صاحبزادی نفیسہ خاتون کے ساتھ نکاح ہوا۔ ان سے سات اولادیں ہوئیں جن میں سے ہم دو بھائی اور دو بہنیں بقید حیات ہیں۔

دہلی میں جب آپ نے اپنی زوجۂ محترمہ کو لانے کا ارادہ فرمایا تو بارہ دری شیر افگن خاں میں چھپرے والوں کے مکان کے قریب ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ سب سے پہلا مکان تھا جس میں آپ نے سکونت فرمائی۔ اس کے بعد حویلی اعظم خاں میں متعدد مکان تبدیل کئے اور کرایہ کے مکانوں میں سب سے آخری مکان کوچہ فولاد خاں گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ میں لیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ قیام رہا۔ اور اس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ کی تشریف آوری کا منظر راقم الحروف کو خوب یاد ہے۔

غالباً ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۴۳ھ تک تقریباً ۱۳ سال اسی مکان میں رہے۔ اسی اثنا میں کوچہ چیلاں میں ایک مکان خریدیا تھا جس میں ناصر وحید صاحب بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں کچھ تعمیری تغیر و تبدل کر کے ذاتی مکان میں ہی منتقل ہو گئے۔ اب اس وقت دو مکان زرخرید ہیں۔ پہلا مکان ۱۶ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سراج الدین ولد بہاء الدین وارشاد الٰہی ولد حاجی کرم الٰہی سے دو ہزار دو سو ساٹھ روپے میں خریدا تھا اور دوسرے مکان کی زمین ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء اور ۱۳ جون ۱۹۳۶ء کو خان بہادر منشی ذکاء اللہ خاں مرحوم کے ورثاء سے ایک ہزار دو سو اسی روپے میں خریدی تھی[1]

دہلی میں ابتدائی ایام میں مدرسہ امینیہ کی ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے انجمن ہدایت الاسلام کے دفتر میں بعہدۂ محاسبی ملازمت کر لی تھی۔ انجمن کے دفتر میں آپ بعد مغرب کام کیا کرتے تھے۔ انجمن کی سالانہ کانفرنس جو ۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو دہلی میں منعقد ہوئی تھی اس کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت انجمن میں موجود تھے اور اس کے چوتھے اجلاس میں جو حکیم اجمل خاں کی صدارت میں ہوا تھا آپ نے ہی انجمن کی کارگذاری اور حسابات وغیرہ پیش کئے تھے۔ آپ اس تبلیغی انجمن کے کاموں سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد

[1] اب ایک ہی مکان ہے نیا مکان جس میں حضرت کی وفات ہوئی کسٹوڈین کی نذر ہو چکا۔ (واصف)

آپ نے محض اس وجہ سے ملازمت چھوڑ دی کہ بعض غلط اور ناجائز حساب آپ کو لکھنے پڑتے تھے۔ جس کو آپ کا ضمیر گوارا نہ کرسکا۔

مدرسہ امینیہ کا قیام

مولوی امین الدین مرحوم نے ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو سنہری مسجد میں یہ دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ صدر مدرس کے عہدہ پر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کو رکھا گیا۔ مدرس دوم مولانا محمد عبد القادر ہزاروی۔ مدرس سوم مولانا ضیاء الحق دیوبندی مدرس چہارم مولوی محمد قاسم دیوبندی مدرس پنجم مولوی سید انتظار حسین سہنس پوری۔ مدرس فارسی و نائب مہتمم مولوی عبد الغفور دہلوی۔ مدرس قرآن حافظ عبد اللہ بلاسپوری اور حافظ رحیم بخش فیض آبادی۔ اس جماعت نے (مع مولوی امین الدین مہتمم) بلا تعیین تنخواہ اس مدرسے کی دینی خدمت شروع کی۔

جب حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد محترم کی طلب پر وطن تشریف لے گئے تو مدرسہ امینیہ میں بڑی کمی محسوس ہونے لگی۔ اور مولوی امین الدین صاحب حضرت مفتی صاحب کو شاہجہاں پور سے بلانا چاہتے تھے مگر آپ اپنے استاد مولانا عبید الحق صاحب کی وجہ سے مجبور تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے مدرسہ عین العلم سے استعفاء دے دیا اور مولوی امین الدین کی طلب پر شوال ۱۳۲۱ھ میں دہلی تشریف لے آئے۔ یہ طلب تو ظاہری سبب تھا۔ لیکن حقیقت نگر نگاہیں خاندان ولی اللہی کے بعد دہلی کے تاریک مطلع پر اس بدر کامل کی منتظر تھیں۔ خاندان ولی اللہی کے منتسبین انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دیوبند وغیرہ کی طرف منتقل ہوگئے تھے۔ کارکنان قضا و قدر نے اسی خاندان کے تبعین میں سے ایک اولو العزم ہستی کو دار السلطنت دہلی کے لیے چنا اور یہ بدر کامل ولی اللہی آفتاب سے انوار قدسی اپنے دامن میں لے کر آسمان دہلی کے مطلع پر بصد جاہ و جلال نمودار ہوا۔

یکم شوال ۱۳۲۱ھ سے آپ کی تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ علمی حیثیت سے مدرسہ امینیہ کے تمام انتظامی معاملات درس حدیث اور افتاء آپ ہی انجام دیتے تھے۔ مہتمم صاحب تمام امور میں حتیٰ کہ خانگی معاملات میں آپ سے مشورہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ جلسوں کا انصرام رودادوں اور مضامین کی ترتیب و تدوین معاہدات اور تمام معاملات آپ کے ہی سپرد تھے۔

دہلی کے لیے آپ کی تشریف آوری آیہ رحمت ثابت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ عرصہ سے دہلی کو اور خاص کر اس چمنستان ملت کو آپ کا ہی انتظار تھا۔ شہر کے زعماء و شرفاء اور اہل الرائے حضرات نے بھی ہر قسم کے سیاسی دینی اور اجتماعی و شہری اداروں کے معاملات میں آپ سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ حاجی رشید مرزا مرحوم سے کسی بیرسٹر نے کہا کہ مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلوں کے سلسلے میں مجسٹریٹوں اور وکیلوں کو سخت الجھن اور دشواری پیش آتی تھی

کیونکہ مقامی علماء کے فتوے الجھے ہوئے ہوتے تھے۔ یا تو عبارت سمجھ میں نہیں آتی تھی یا غلط ہوتے تھے اور جس مقدمہ میں دو چار علماء کے فتوے عدالت میں پیش ہوتے تھے ان میں اختلاف ہوتا تھا۔ جب سے مولانا کفایت اللہ کے فتوے آنے شروع ہوئے عدالتوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے۔

مدرسے میں آنے کے بعد آپ نے بہت سی اہم تبدیلیاں کیں۔ آپ ہی کی خوددار ہستی تھی جس نے سب سے پہلے طلبہ میں خودداری اور عظمتِ علم کا شعور پیدا کیا، شہر کے لوگ شادی بیاہ یا دیگر تقریبات میں طلبہ کی دعوت کرتے تھے اور طلبہ ان کے مکانوں پر جا کر کھانا کھاتے تھے، علم دین کی اس بے حرمتی کو وہ اولوالعزم ہستی کیوں کر برداشت کر سکتی تھی جس نے تعلیم کے زمانہ میں ٹوپیاں بن کر اپنی روزی آپ پیدا کی ہو، اور کسی کا دست نگر بننا گوارا نہ کیا ہو، چنانچہ آپ کے تشریف لانے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

آٹھویں سالانہ اجلاس میں آپ نے جو مقالہ پڑھا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

(۱) تمام مدارس اسلامیہ کا مقصود ایک ہے یعنی چمن علم دین کی آبیاری۔ اسی باغ کی یہ سب کیاریاں ہیں۔ لہٰذا تمام مدارس کو انتظامی حیثیت سے بھی ایک نظام میں منسلک ہونا چاہیئے اور ایک کو دوسرے کا مخالف نہ ہونا چاہیئے۔

(۲) مدارس اسلامیہ کے ترقی نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے کارکن یعنی اہل شوریٰ اور منتظمین وہ لوگ ہیں جن کو علم دین کا ذوق اور مناسبت نہیں ہے، بلکہ اکثر نئی وضع کے پابند اور جدید طرز کے شیدائی اور علم دین سے محض بے بہرہ ہیں۔ یا اگر اہل شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہیں تو ان کے مہتمموں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ اگرچہ وہ امور تعلیمی کو خوب سمجھتے ہیں لیکن مالی معاملات میں نیت درست نہیں، وہ اس چندے کے مال کو اپنا مال اور اپنی جائداد سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اہل شوریٰ میں اہل علم بھی داخل ہوں اور تمام امور انتظامی و تعلیمی ان کے مشورے سے فیصل ہوں۔ اور مہتمموں کو خدا کا خوف اور اپنے فرائض کا احساس کرنا چاہیئے اور اس مال میں سے جو خدا نے ان کو امانت سونپا ہے بقدر ضرورت اپنے اوپر خرچ کرنا چاہیئے۔

(۳) مدرسے کا اہتمام کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے پوری فرصت توجہ اور لیاقت شرط ہے ضروری ہے کہ مہتمم مدبر، تجربہ کار، امور انتظامی سے واقف ہو اور اس کے ذمہ کوئی اور کام بطور فرض منصبی کے نہ ہو۔ ایک شخص پوری توجہ سے دو کام نہیں کر سکتا۔

(۴) مہتمم اور اہل شوریٰ مدرسے کے امور میں خدا کی طرف سے وکیل ہیں۔ لہٰذا موکل کی رضا مدنظر رہنی چاہیئے اور مدرسے کے انتظام اور ضروریات پر کامل توجہ رہنی چاہیئے۔

(۵) مہتممین اور مدرسین کو چاہیئے کہ ان خدا کے مہمانوں (طلبہ) کے ساتھ نہایت نرمی اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں ان کی مشکلات میں ان کی اعانت اور مدد کو باعث فخر سمجھیں۔

(۶) طلبہ کے داخلے کے وقت احتیاط سے کام لیا جائے اور پچھلے مدرسے سے نیک چلنی کی سند لیکر داخل کیا جائے۔

(۷) اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جو خدا کے ان مہمانوں کی دعوت کرتے ہیں اور ان اعلیٰ تعظیم کے حقدار لوگوں کی انتہائی توہین اور تضیع اوقات کا سبب بنتے ہیں۔ یہ طے کر لیا گیا ہے کہ طلبہ کو مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں ہرگز نہ بھیجا جائے گا۔ اگر دعوت کرنا ضروری ہو تو ایک دن قبل مہتمم کو تعین وقت اور تعداد کے ساتھ اطلاع دی جائے اور مدرسے میں پابندیٔ وقت کے ساتھ کھانا لا کر اپنے آدمیوں کے انتظام میں کھلایا جائے۔

انجمن اصلاح الکلام

آپ نے ۱۳۲۵ھ میں ایک مجلس تقریر و مناظرہ قائم کی، جس کا نام کچھ عرصہ کے بعد انجمن اصلاح الکلام تجویز کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر و مناظرہ سکھایا جائے۔ ہر آٹھویں دن طلبہ تقریر اور مناظرہ کیا کرتے تھے اور آپ خود ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔

اتحاد مدارس اسلامیہ کی تحریک

آپ نے ۱۳۲۲ھ میں مدارس اسلامیہ کے اتحاد کی جو تحریک اٹھائی تھی وہ کافی حد تک کامیاب ہوئی اور اس کی کامیابی کا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے عظیم الشان اجتماع منعقدہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ میں ہوا۔ اس اجتماع میں مدرسہ امینیہ کے دس فارغ التحصیل طلبا کی دستار بندی کی گئی۔

افسوس کہ یہ تحریک کسی وجہ سے وسیع تر نہ ہو سکی اور اسی میں عافیت تھی کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ مولانا امین الدین صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ کی وفات ۱۹ رمضان ۱۳۳۸ھ (۶ رجون ۱۹۲۰ء) کو ہوئی اور ۹ رشوال ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۶ رجون ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی تشریف لا کر معززین شہر کے اجتماع میں مدرسہ امینیہ کا اہتمام بھی حضرت مفتی اعظم کے سپرد فرمایا۔

آپ کا ملی وقومی احساس

یورپین ٹرکی کے سیاسی مطلع کار یاستہائے متحدہ بلقان کی بغاوت سے مکدر ہونا تھا کہ اسلامی اخوت اور ملی غیرت کی روح مغرب سے مشرق تک دوڑ گئی۔ دہلی کے مسلمانوں نے بھی گہری ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مدرسہ امینیہ کی طرف سے قنوت نازلہ کے بارے میں ایک فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد چرم قربانی کے بارے میں دوسرا فتویٰ ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب نے ایک جلسہ بلایا اور تقریر میں ترکوں کے اندوہناک مصائب بیان فرما کر اعانت کی ترغیب دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ طلبہ نے اپنا سب کچھ دے ڈالا اور جن کے پاس کچھ نقد نہ تھا انھوں نے کپڑے، کتابیں اور برتن دے ڈالے۔ اس کے بعد آپ نے مدرسین و طلبہ کے وفود مرتب کر کے روانہ کئے اور چندہ جمع کیا گیا۔ جو سامان جمع ہوا تھا اس کو آپ نے خود جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر نیلام کیا۔ آپ کی سعی و کوشش سے جو چندہ ہلال احمر کو دیا گیا اس کی میزان تین ہزار آٹھ سو بانوے روپے آٹھ آنے نو پائی تھی۔

جس تربیت گاہ سے آپ تربیت پاکر نکلے تھے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ صرف درس وتدریس ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ میدان سیاست کے بھی شہسوار تھے۔ حضرت شیخ الہند کی وصیت کے سننے اور جاننے والے آج بھی موجود ہیں۔ اس نگاہ جوہر شناس نے اول دن سے اس گدڑی کے لعل کی آب وتاب دیکھ لی تھی اور ارکان جمعیۃ علماء کو وصیت فرمائی تھی کہ دو آدمیوں کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور دوسرے مولانا کفایت اللہ (صدر جمعیۃ علمائے ہند)۔

آپ کے دل میں قومی وملی احساس بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور باوجود خاموش طبع ہونے کے آپ اہم اور خطرناک موقعوں پر بے دھڑک میدان میں آجاتے تھے۔ بیسویں صدی کا آغاز مسلمانان عالم کے لئے بے انتہا دل شکن اور صبر آزما تھا۔ جبکہ بلقان میں ترکوں پر آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ مبارک ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے وہ منظر دیکھا ہوگا کہ چمنستان محمودؒ وقاسمؒ کا یہ سرو آزاد جامع مسجد شاہجہانی کی سیڑھیوں پر چندہ کا سامان نیلام کر رہا تھا اور لوگ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خرید رہے تھے۔ نعم البائع ونعم المشتری۔

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل رہا تھا اور زعمائے ملک یہ محسوس کر رہے تھے کہ عوام کی رائے عامہ کو بیدار کر کے ملک کے اندر انقلاب کی روح پیدا کی جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تمام فرقے آپس میں متحد ہو جائیں اور مشترک طور پر کوئی حرکت کی جائے۔ مسلم لیگ نے جو برادران وطن کے ساتھ سمجھوتہ کا قدم اپنے جدید دور ۱۹۱۵ء کے اجلاس بمبئی میں اٹھایا تھا اور لکھنؤ کے اجلاس دسمبر ۱۹۱۶ء میں بصدارت مسٹر محمد علی جناح مکمل ہوا۔ جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے اس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ اس میں صوبائی اسمبلیوں کے معاملہ میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ جس کا احساس اس وقت کے لیڈروں کو نہیں ہوا۔ اور مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت بھی مسلم لیگ کے سوا نہیں تھی۔ خاص خاص کے علاوہ تمام علماء نے میدان سیاست میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ نہ جمعیۃ علماء کا وجود تھا۔ نہ ان کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم تھا۔ مگر جونہی کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ شائع ہوا۔ فوراً ہندوستان کے علماء میں سے ایک ہی شخص اٹھا تھا اور اس نے اس سمجھوتہ میں وہ خامیاں بیان کی تھیں جن کی بنا پر بعد میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سمجھوتہ کو ناقابل قبول سمجھا۔ وہ دور بین مفکر حضرت مفتی اعظم تھے۔ آپ نے وزیر ہند لارڈ مانٹیگو کی آمد کے موقع پر ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں حکومت خود اختیاری کا مطالبہ پیش کیا۔

آپ نے ہی سب سے پہلے شرعی عدالتیں قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ یہاں ان تفصیلات کی گنجائش نہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ جب سیاسی معاملات میں کسی لیڈر سے گفتگو کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہمارے کفایت کو بلاؤ۔ ایک طرف حضرت شیخ کے وہ رفقاء اور تلامذہ جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے

اور ہر حالت کے شریک تھے، مالٹا میں اسیری کی سختیاں جنھوں نے آپ کے ہمراہ جھیلی تھیں اور دوسری طرف حضرت شیخ کا ہر اہم معاملہ میں مولوی کفایت کو یاد فرمانا۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ آخر ایک روز آپ کے ایک تلمیذ خاص نے عرض کیا کہ حضرت ہم بھی تو آپ کے ہمراز و دمساز خدام ہیں اور سیاسی معاملات سے بھی واقف ہیں، فرمایا ہاں بیشک تم لوگ سیاست داں ہو، لیکن مولوی کفایت کا دماغ سیاست ساز ہے۔ (بروایت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب)۔

آپ کو حضرت شیخ الہند کے ساتھ جو تعلق تھا وہ عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ آپ نے کئی عربی قصیدوں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ایک قصیدہ جو اس موقع کے مناسب ہے نقل کرتا ہوں۔ اس کا عنوان آپ نے اس طرح قائم کیا ہے:-

"حضرت مولانا کے ایک خادم نے اپنے درد دل کا اس طرح اظہار کیا ہے"

أَلَا يَا مَالْطَا! طُوبَىٰ وَبُشْرَىٰ ۱ ثَوَىٰ بِكِ مَنْ مَحَا آثَارَ كُفْرٍ
وَلَمْ تَكُ قَبْلَهُ إِلَّا خَرَابًا ۲ خَمُولًا غَيْرَ مَعْرُوفٍ بِخَيْرٍ
فَلَمَّا حَلَّهَا عَادَتْ رِيَاضًا ۳ مُنَضَّرَةً مِّنَ التَّقْوَىٰ وَذِكْرٍ
مُكَلَّلَةً بِأَزْهَارِ الْمَزَايَا ۴ وَأَزْهَارُ الْمَزَايَا الْخَيْرُ زُهْرٌ
أَلَا يَا مَالْطَا! كُونِي سَلَامًا ۵ عَلَىٰ مَحْمُودِنَا الرَّاضِي بِقَدْرٍ
إِمَامُ الْخَلْقِ قُدْوَتُهُمْ جَمِيعًا ۶ لَهُ كَرَمٌ إِلَى الْآفَاقِ يَسْرِي
جُنَيْدُ الْعَصْرِ سِرِّيُّ الزَّمَانِ ۷ غُيُوثُ فُيُوضِهِ تَهْمِي وَتَجْرِي
فَرِيدٌ فِي خَلَائِقِهِ الْعِذَابِ ۸ وَحِيدٌ فِي التُّقَىٰ مِنْ غَيْرِ فَخْرٍ
أَشَدُّ النَّاسِ أَمْثَلُهُمْ بَلَاءً ۹ فَيَا شَمْسَ الْهُدَىٰ يَا طَوْدَ صَبْرٍ
ذَكَرْنَا يُوسُفَ الصِّدِّيقَ لَمَّا ۱۰ أُسِرْتَ بِغَيْرِ اسْتِحْقَاقِ أَسْرٍ
لِحَرِّ الْبَيْنِ فِي صَدْرِ الْكَئِيبِ ۱۱ تَفِيضُ دُمُوعُهُ حُمْرًا كَجَمْرٍ
سَيُنْزِلُكَ الْعَزِيزُ مَحَلَّ عِزٍّ ۱۲ وَيَنْصُرُكَ النَّصِيرُ أَعَزَّ نَصْرٍ

سَيَكْفِيكَ الْإِلٰهُ فَأَنْتَ مَرْءٌ
كَفَاكَ اللّٰهُ قَدْ مَا كُلَّ شَرٍّ

(رسالہ شیخ الہند مطبوعہ ۱۹۱۸ء)

ترجمہ (۱) سُن! اے مالٹا! مبارک ہو تجھے یہ مژدہ کہ تیرے اندر کفر کا مٹانے والا ایک مرد مجاہد مقیم ہوا ہے۔
(۲) اور اس سے پہلے تیری حیثیت ہی کیا تھی۔ تو ایک گمنام ویرانہ تھا کہ تیرا ذکر خیر دنیا میں کہیں بھی نہ تھا۔

(۳) جب مالٹا میں اُس مقدس ہستی نے ورود فرمایا تو وہ تقویٰ اور ذکر اللہ کا ایک ایسا سرسبز باغ بن گیا۔
(۴) جس میں فضائل و معالی کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اور حقیقی بہار تو دراصل فضائل و معالی کی ہی بہار ہے۔
(۵) ہاں اے مالٹا سلامتی ہو جا! ہمارے محمود پر جو راضی برضائے الٰہی (ہو کر تیرے اندر جلوہ افروز ہوا) ہے۔
(۶) جو عصر حاضر میں پوری قوم کا امام اور پیشوا ہے اور اس کی عظمت کا آوازہ تمام عالم میں پہنچا ہوا ہے۔
(۷) وہ زمانے کا جنیدؒ اور وقت کا سری سقطیؒ ہے اس کے فیوض کی بارشیں برستی اور سیل رواں بنتی ہیں۔
(۸) اپنے بیشتر خصائل میں یگانہ اور تقویٰ میں یکتائے زمانہ ہے۔ (۹) جو انسان برگزیدہ و عالی مرتبہ ہوتا ہے اس پر آزمائشیں بھی سب سے زیادہ سخت آتی ہیں۔ تو اے آفتاب ہدایت اور اے کوہ تحمل!
(۱۰) جب تجھ کو بغیر اثبات جرم کے قید کر دیا گیا تو ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام یاد آ گئے۔ (۱۱) آہ! ایک مضطرب کے سینے میں غم فراق کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس کی وجہ سے اس کے سُرخ آنسو انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے نکل رہے ہیں۔ (۱۲) عنقریب آپ کو خدائے عزیز مقام عزت پر فائز فرمائے گا اور بڑی زبردست مدد فرمائے گا۔ (۱۳) اور عنقریب اللہ تعالےٰ آپ کی مکمل حمایت و نصرت فرمائے گا کیونکہ آپ ہی وہ مرد مجاہد ہیں جسے خدا نے ہمیشہ ہر قسم کے شر سے بچایا ہے۔ (ترجمہ از واصف)

۱۸ر اگست ۱۹۱۷ء کو ملک معظم (برطانیہ) کا مشہور اعلان بابت حکومت خود اختیاری شائع ہوا۔ کچھ روز کے بعد لارڈ مانٹیگو ہندوستان آئے اور میثاق لکھنؤ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ زمانہ بے انتہا نازک اور خطرناک تھا۔ ملک کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی لیڈر شپ صرف مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی علما یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر قومی و ملی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو آئندہ چل کر ان سے مزید غلطیاں سرزد ہونے کا قوی امکان ہے۔

چنانچہ مسلم لیگ کے گیارھویں اجلاس دہلی منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں جو مسٹر اے کے فضل الحق (کلکتہ) کی صدارت میں ہوا تھا، علماء سب سے پہلی بار بکثرت شریک ہوئے اور تقریریں کیں۔ اور علماء کی شرکت کی خوشی میں کرسی صدارت سے ایک تجویز پیش کی گئی۔ جو علماء اس اجلاس میں شریک ہوئے ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مولانا آزاد سبحانی۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ مولانا محمد کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا عبداللطیف دہلوی نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ (روشن مستقبل)۔

پھر ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس مسٹر فضل الحق موصوف کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں بہت سے علماء شریک ہوئے جشن صلح کے مقاطعہ کا مندرجہ ذیل رزولیوشن باتفاق رائے پاس ہوا:۔

"یہ جلسہ اُن دل دوز واقعات کو پیش نظر رکھکر جو سلطنت ترکی، خلافت، مقامات مقدسہ اور سلطنت ایران کے متعلق اس صلح کے نتیجے کے طور پر پیش آئے مذہبی نقطۂ نظر سے تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جشن فتح میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیئے۔"

مندرجہ بالا رزولیوشن مفتی اعظم نے مندرجہ ذیل تقریر کے ساتھ پیش کیا تھا۔

"شرعاً ایسی حالت میں کہ مقامات مقدسہ خلیفۃ المسلمین کے قبضے سے باہر ہیں اور بغداد شریف و بیت المقدس و نجف اشرف وغیرہ غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں مسلمان کسی طرح ایک ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے جس کا نتیجہ اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین کے قبضۂ اقتدار سے ان کے ممالک نکال لئے گئے ہیں اور اسلام کی دنیوی طاقت و اقتدار کو زائل کیا جارہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں طبقۂ علماء سے ہوں اور شرعی نقطۂ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اور اگر ہونگے تو شرعاً گناہ گار ہونگے۔"

مذکورہ بالا تجویز کی تائید میں (۱) مولانا شاہ ولایت حسین الہ آبادی (۲) نواب حاجی محمد موسیٰ خاں شروانی (۳) مولانا سید محمد داؤد صاحب امرتسری۔ (۴) مسٹر محمد حسین بیرسٹر میرٹھ (۵) مولانا سید محمد فاخر صاحب الہ آبادی (۶) سیٹھ میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی بمبئی۔ (۷) قاری عباس حسین ایڈیٹر قوم۔ (۸) مہاتما گاندھی وغیرہ نے تقریریں کیں۔ (مسئلہ خلافت و جشن صلح)

خلافت کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد علماء نے آپس میں مشورے کیئے اور یہ بات طے کرلی کہ علماء کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہیئے۔ اور اپنی ایک منظم جماعت بنانی چاہیئے۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا آزاد سبحانی کو تمام علماء سے جو اس وقت دہلی میں موجود تھے گفتگو کرنے کے لئے ہدایت کی گئی۔ اور سب سے زیادہ پر جوش طریقے پر حضرت مولانا عبد الباری صاحب نے اس خیال کی تائید فرمائی۔ اجتماع کا وقت وغیرہ طے ہو جانے کے بعد پچیس علماء کی میٹنگ میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ (بروایت حضرت مولانا احمد سعید صاحب)

مفتی اعظم کو اس کا عارضی صدر اور مولانا احمد سعید کو عارضی ناظم بنادیا گیا۔ اور مولانا سید داؤد غزنوی کی دعوت پر طے پایا کہ جمعیۃ علمائے ہند کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر بصدارت حضرت مولانا عبد الباری منعقد ہوگا۔

مولانا احمد سعید مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ۱۹۱۸ء میں جب مفتی صاحب حضرت شیخ الہند کے حالات پر ایک کتابچہ لکھ رہے تھے (جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے) اسی وقت سے مفتی صاحب نے یہ طے کر لیا تھا کہ علماء کا ایک آل انڈیا جماعت کی صورت میں منظم ہونا اشد ضروری ہے۔ جب خلافت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دہلی میں علماء کا اجتماع ہو گیا تو آپ کے تخیل نے عملی شکل اختیار کرلی اور جمعیۃ علمائے ہند وجود میں آگئی۔

رولٹ بل ۱۹۱۹ء کے خلاف جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کی شرکت میں تحریک ستیہ گرہ شروع کی تو حضرت مفتی صاحب بڑے انہماک سے اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ آپ کے دولت خانے پر لیڈروں کے بڑے بڑے اہم مشورے ہوتے تھے مگر آپ حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے گرفتاری کا موقع نہیں آنے دیا۔ آپ کے رفقائے کار (حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری۔ مولانا محمد علی) ہرگز آپ کی گرفتاری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ پس منظر میں بیک وقت خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء کی روح رواں آپ ہی تھے۔

جمعیتہ علماء ہند کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ میں آپ کے ہی کمرہ میں قائم ہوا۔ کوئی محرر اور چپراسی نہیں تھا۔ بلکہ آپ خود اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ جمعیتہ علماء ہند اپنے ہاتھوں سے تمام کام کیا کرتے تھے۔ آپ کو قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ فضائل و کمالات کا مجموعہ بنایا تھا۔ وہ علماء جو ہمیشہ جزوی مسائل میں الجھے رہتے تھے آپ کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے اور یہ آپ کا ہی بلند اخلاق اور مضبوط کردار تھا کہ مختلف الخیال علماء میں ایک جگہ جمع ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جمعیتہ علماء کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے پرورش کیا اور اپنی محنت و جانفشانی سے پروان چڑھایا۔ تقریباً ۲۰ برس آپ جمعیتہ علماء کے صدر رہے۔ مگر اس طویل عرصہ میں کبھی سالانہ کانفرنس کی صدارت نہیں فرمائی۔ قومی کاموں میں حتی الامکان اپنی جیب سے رقمیں خرچ کرتے تھے۔ سفر خرچ وغیرہ بھی بہت کم لیتے تھے۔ جمعیتہ علماء کے اجلاس پشاور ۱۹۲۷ء میں راقم الحروف کو بھی (جبکہ میری عمر ۱۶-۱۷ سال کی تھی) اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے بے انتہا اصرار کے باوجود میرا سفر خرچ اور کھانے وغیرہ کے مصارف نہیں لئے۔ صدر استقبالیہ نے کہا کہ ایک بچے کے سفر خرچ اور مصارف طعام کو آپ اتنی اہمیت نہ دیجئے جب کہ میں اپنی قوم اور اپنے صوبہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خوشی سے پیش کر رہا ہوں۔ فرمایا کہ یہ بچہ اگرچہ صدر جمعیتہ کا بچہ ضرور ہے۔ مگر جمعیتہ کا رکن نہیں ہے۔ اس کا سفر خرچ لینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔

آپ کی عمر مبارک کے ۶۰ سال دینی و مذہبی اور سیاسی و ملی خدمات کے لئے وقف رہے۔ ایک طرف مدرسہ امینیہ کے ساتھ آپ کا یہ شغف تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی درس و افتاء کا شغل رہتا تھا۔ مدرسہ سے رخصت نہیں لیتے تھے۔ کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف قومی و ملی فرائض سے بھی غافل نہ تھے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں آپ بے انتہا باغیانہ اور خطرناک تقریریں کرنے کے جرم میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء مطابق ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ کو اپنے دولت خانہ واقع کوچہ چیلان سے رات کے چار بجے گرفتار کئے گئے تھے۔

آپ کی عظیم الشان تقریروں کی گونج آج بھی فضائے آسمانی میں باقی ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور کمزوری صحت

کے باوجود دو دو۔ تین تین گھنٹے تک اسٹیج پر شیر کی طرح گرجتے تھے شروع میں آواز ہلکی ہوتی تھی، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد تیز، بلند اور قوی تر ہوتی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر (آلہ مکبر الصوت) کا رواج نہ تھا، مگر بڑے سے بڑے عظیم الشان مجمعوں پر آپ کی آواز حاوی ہوتی تھی۔ آپ کی تقریر عالمانہ ہوتی تھی۔ مگر عوام کے لئے بھی اس قدر دلچسپ ہوتی تھی کہ کبھی آپ کی تقریروں سے کسی کو اٹھ کر جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ غرضکہ آپ خلوت میں اعلےٰ درجہ کے مفکر و مدبر اور جلوت میں اعلےٰ درجہ کے مقرر و خطیب تھے۔ (اگرچہ عادی مقرر نہ تھے) ہر میدان میں آپ کا ارشاد قول فیصل تھا۔ میں بلا خوف لومۃ لائم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مفتی اعظم گذشتہ تحریکات آزادی میں (خاص کر نہرو رپورٹ کے استرداد کے بعد) برادران وطن کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرتے تو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ان تمام تحریکات سے بالکل الگ رہتے

غرض کہ یہ آپ کی پہلی گرفتاری تھی جو ۱۱ اکتوبر ۳۰ء کو وقوع میں آئی۔ گورنمنٹ برطانیہ آپ کی عظمت سے واقف تھی۔ آپ کے اوپر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ پہلے سے تمام ریزرو پولیس کو دہلی میں بلا لیا گیا تھا اسلحہ اور مشین گنوں کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ اور شہر کے تمام گلی کوچوں کی بڑی سختی سے ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ قصاب پورہ پہاڑ گنج، ملتانی ڈھانڈہ کی طرف خاص طور سے مشین گنیں لگائی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں پولیس بھیجی گئی۔ رات کے ۳ بجے سے شہر کے گلی کوچوں میں آمد و رفت بالکل بند کر دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ نماز فجر کے لئے جانے والوں کو بھی گھروں سے نہیں نکلنے دیا جاتا تھا۔

تقریباً ۴ بجے کوتوال، مجسٹریٹ وغیرہ آپ کے دولت خانہ پر آئے۔ گھر کے سب بچے عورتیں وغیرہ خوف زدہ تھے اور آپ نہایت استغنا کے ساتھ ان کے ہمراہ تشریف لے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے کسی لیڈر کو اس شان و شوکت اور اس انتظام کے ساتھ گرفتار نہیں کیا گیا۔ دہلی جیل میں مجسٹریٹ نے آپ کو ۶ ماہ قید بامشقت اے کلاس کا حکم سنایا اور گجرات جیل میں منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم، خان بادشاہ خان عبد الغفار خان، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مسٹر آصف علی وغیرہ گجرات جیل میں آپ کے ساتھ

دوسری گول میز کانفرنس (دسمبر ۱۹۳۱ء) کی ناکامی کے بعد دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوگئی۔ اور ۴ جنوری ۳۲ء کو گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ اس موقع پر جمعیۃ علماء پھر جنگ آزادی کے میدان میں آگئی۔ حضرت مفتی اعظم کو سب سے پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے لئے ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء بروز جمعہ جلوس اور جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ جامع مسجد شاہجہانی میں بعد نماز جمعہ جلسہ ہوا اور آپ نے جلوس میں پُر امن طریقے اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور جامع مسجد سے بہ عظیم الشان جلوس چلا جس میں ایک لاکھ نفوس تھے۔ جلوس کی رہنمائی آپ خود فرما رہے تھے۔ آزاد پارک خلف ٹاؤن ہال جلوس پہونچا اور وہاں جلسہ مرتب کیا گیا۔ وہاں دیوی دیال کوتوال شہر اور عبد الواحد قادیانی سب انسپکٹر پولیس کی بڑی بھاری جمعیۃ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ ایک بنچ پر کھڑے

ہو کر اپنا طوفانی بیان پڑھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے بے تحاشا لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ نہتے عوام سراسیمہ ہو گئے۔ لاٹھی چارج بہت شدید تھا۔ سینکڑوں آدمی زخمی اور ادھ موئے ہو گئے۔ آپ کے بائیں طرف مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دائیں طرف ماسٹر ہلال احمد زبیری تھے اور سامنے راقم الحروف آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم کے کئی چوٹیں آئیں۔ زبیری صاحب کی کلائی کی ہڈی ٹوٹی اور راقم الحروف کے کندھے اور بازوؤں پر کئی لاٹھیاں پڑیں۔ ڈیڑھ دو ماہ تک علاج جاری رہا۔

پولیس کے بے رحمانہ لاٹھی چارج سے جب عوام منتشر ہو گئے تو کوتوال آپ کو گرفتار کر کے کوتوالی لے گیا اور وہاں سے جیل بھیج دیا گیا۔ سیاسی اسیروں کے مقدمات کے لئے جیل میں عدالت قائم کی جاتی تھی۔ آپ کو ۱۸ ماہ قید بامشقت اے کلاس کا حکم سنایا گیا۔ اور نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا۔ ملتان جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی۔ لالہ دیش بندھو گپتا۔ چودھری شیر جنگ۔ ڈاکٹر انصاری وغیرہ آپ کے ساتھ تھے۔

آپ کا دینی احساس

باوجودیکہ قومی و وطنی تحریکات میں آپ جان کی بازی لگانے سے دریغ نہ فرماتے تھے اپنے دینی و مذہبی فرائض سے بھی غافل نہ تھے۔ ۱۹۲۲ء میں جب سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور ہزاروں ملکانوں کو مرتد کرایا۔ تو جمعیۃ علماء نے اس کی روک تھام شروع کی تبلیغی وفود بھیجنے شروع کئے۔ سوامی شردھانند نے کس جذبہ کے ماتحت یہ تحریک جاری کی تھی اور اس کا جواب دینا مسلمانوں کا فریضہ تھا یا نہیں۔ اس موقع پر اس بحث کی ضرورت نہیں۔ بہرحال سب سے پہلا تبلیغی وفد جو حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب فرما کر اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ فرمایا تھا اس کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اول اخبار الجمعیۃ) اور نائب صدر مولانا وحید حسن ٹونکی (مدرس مدرسہ امینیہ) تھے۔ اور ساتھ ہی ایک دورہ خود نے کر بمقام اچھنیرہ جا پہنچے اور حالات کو سنبھالا۔

شدھی کی تحریک کی وجہ سے ملک کے اندر فسادات اور بلوے جاری تھے۔ اور اس سلسلے میں اتحاد کانفرنسیں بھی ہو رہی تھیں۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ۲۱ دن کا برت شروع کیا تھا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو سنگم تھیٹر مقابل ایڈورڈ پارک دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ایک عظیم الشان اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی جس میں آپ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور حکیم اجمل خاں۔ مولانا احمد سعید۔ مفتی محمد صادق قادیانی۔ سوامی شردھانند۔ پنڈت رام چندر وغیرہ اور ملک کے دیگر زعماء موجود تھے۔ صدر اجلاس نے اپنی تقریر میں اشتراک مذہب اور اتحاد عمل کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کو نکال ڈالیں تاکہ امن و اتحاد قائم ہو۔ دوسرے لیڈروں نے کہا یہ صلح کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ

تمہارے مذہب میں مرتد کے لئے سزائے قتل ہے۔ اس کانفرنس میں فریق مخالف بڑی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ بڑے بڑے مشہور مناظر اور پنڈت موجود تھے۔ جدید تعلیم یافتہ مسلم لیڈروں کو ہمیشہ سے یہ خبط رہا ہے کہ اپنے آپ کو امام اعظمؒ کا جانشین سمجھتے رہے ہیں۔ ان مسائل میں برادران وطن کے ساتھ تھے۔ مفتی محمد صادق نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد علیؒ نے بھی یہی کہا۔ اس کانفرنس کا منظر دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور صرف ایک اللہ کا شیر کھڑا ہوا گرج رہا تھا۔ اسلامی شعائر کی طرف سے مدافعت کر رہا تھا۔ یعنی مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ جو مناظروں کے بھی سینکڑوں میدان جیت چکے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔ اس کو تبلیغ کے حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ ہمیں اس کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں، مگر ہندوستان کے فسادات اس عقیدہ کے نتائج نہیں ہیں اور اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ مولانا یہ تو فرمائیے کہ سوراج کے بعد کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ سوراج کے بعد جمہوری مجلس مقننہ ہوگی کیا وہ اسلامی قانون نافذ کرے گی؟ اگر کرے گی تو تمام احکام جاری ہوں گے مگر ہندوستان کے مستقبل کے مشترک پلیٹ فارم پر اسلامی حکومت کا تصور پیش نظر نہیں ہے۔

اللہ اللہ! اسلام کے اس مرد مجاہد کی نظر کس قدر دوربین تھی۔

جب حجاز سے شریف حسین کی عملداری کو سلطان ابن سعود نے ختم کر دیا تو دنیائے اسلام

موتمر حجاز کا ایک نمایندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز ہوئی۔ یہ موتمر عالم اسلامی مورخہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ کو مکہ معظمہ میں شریف شرف عدنان کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اور اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

حضرت مولانا محمد کفایت اللہ (صدر وفد) مولانا عبدالحلیم صدیقی پرائیویٹ سکرٹری صدر وفد۔ مولانا محمد عرفان سکرٹری وفد۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا احمد سعید مولانا نثار احمد ارکان وفد۔

آپ نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ موتمر اسلامی میں حجاز کے لئے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۲۵ء کو اکبر جہاز بمبئی سے روانہ ہوا تھا جس میں جمعیۃ علماء کا وفد اور جمعیۃ خلافت کا وفد اور ہندوستان کے تقریباً چار سو علماء و زعماء روانہ ہوئے۔ خلافت کا وفد مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صدر وفد، مسٹر شعیب قریشی سکرٹری وفد

مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی ارکان وفد۔ یہ سب حضرات ہم سفر ہی نہیں بلکہ ہر حال کے رفیق، غمگسار و مددگار رہتے تھے۔

اس عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں ہند، مصر، جاوا، فلسطین، بیروت، شام، سوڈان، نجد، حجاز، روسی ترکستان، یمن، افغانستان، مالدیپ، ٹرکی، لاذقیہ وغیرہ کے وفود شامل تھے۔

سبجکٹ کمیٹی کے لئے مندرجہ ذیل ارکان کو منتخب کیا گیا۔ مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ۔ حافظ وہبہ وزیر اعظم حکومت سعودیہ۔ مولانا شوکت علی رکن وفد خلافت کمیٹی۔ ضیاء الدین رئیس وفد روسی۔ عمر سعید رئیس وفد جاوا۔

اس کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں آپ نے بہت محنت سے کام کیا۔ حجازیوں سے اور خاص کر سلطان ابن سعود سے خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ تمام دنیا کے علماء و زعماء نے آپ کی قابلیت کا لوہا مانا۔ حجاز میں تمام مذاہب کی آزادی اور بردہ فروشی کے غیر شرعی رواج کا انسداد نیز اور بہت سی تجاویز پیش کیں اور اپنی قوت استدلال سے منظور کرائیں۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ صرف ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ سلطان ابن سعود سے ایک ملاقات کے دوران آپ نے کہا کہ اگر آپ کو مدینہ منورہ میں بھی وہی کرنا تھا جو مکہ معظمہ میں ہوا تو آپ نے دنیائے اسلام سے یہ وعدہ کیوں کیا تھا کہ ہم موتمر اسلامی کے فیصلہ تک مدینہ میں کوئی قابل شکایت کام نہیں کریں گے۔ سلطان نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا کہ میری قوم کے پانچ ہزار آدمیوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں مقابر و مآثر کو منہدم نہ کروں گا تو وہ خود چڑھائی کر کے یہ کام کریں گے۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ مجھ سے بھی زیادہ تخریب کریں۔ اس لئے میں نے ان کا مطالبہ پورا کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا آپ کو اپنی قوم کا حال معلوم نہ تھا؟ جب آپ ان کی وحشت و بربریت کو جانتے تھے اور اعلان ملوکیت کے وقت تجربہ بھی کر چکے تھے تو آپ نے اس قسم کا وعدہ کیوں فرمایا؟ سلطان ابن سعود سٹ پٹا کر لاجواب ہو گئے۔ ایک مصاحب نے جواب دیا کہ جلالۃ الملک نے یہ سوچا تھا کہ میں اپنی قوم کو سمجھا لوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ کس صورت سے سمجھا لینے کی امید تھی؟ دلیل سے؟ یا طاقت سے؟ اس پر تمام حاضرین لاجواب ہو گئے۔

مؤتمر فلسطین جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصہ میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی تو فلسطین کے عربوں میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ برطانیہ کے خلاف تحریک جاری تھی۔ حکومت کی طرف سے عربوں پر بے انتہا مظالم ہو رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں بھی جمعیۃ علماء ہند نے مجلس تحفظ فلسطین قائم کی۔ اعراب فلسطین اور شہدائے فلسطین کے لئے چندہ وغیرہ جمع کیا۔ تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف ۲۶ اگست ۳۸ء کو یوم فلسطین منایا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے

اور جلوس نکالے گئے۔ اس سلسلے میں برطانیہ نے قاہرہ میں عالم اسلامی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی۔ یہ کانفرنس "موتمر البرلمانیۃ المصریۃ للدفاع عن فلسطین" کے نام سے مشہور ہے۔ مورخہ ۷؍اکتوبر ۳۸ء کو یہ موتمر قاہرہ میں علی علوبہ پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مصر، شام، عراق، ایران، ہندوستان، لبنان، حجاز، شرق اردن، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، ترکی غرضکہ تمام عالم اسلامی کے تقریباً ۲۰۰ ہزار نمائندے شریک تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے نمائندے مندرجہ ذیل تھے۔ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رئیس وفد مولانا عبد الحق مدنی اور مولانا محمد یوسف بنوری ارکان وفد۔

آپ ۲۶؍ستمبر ۳۸ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۴؍اکتوبر کو قاہرہ پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت مفتی اعظم کے استقبال کا جو نظارہ قاہرہ میں دیکھا ہمارے دل مسرت کی وجہ سے اچھل رہے تھے اور ہمارے سر فخر کی وجہ سے بلند ہو رہے تھے (اتنا عظیم الشان استقبال دنیا کے کسی نمائندے کا نہیں کیا گیا)۔ مفتی اکبر زندہ باد، ہندی وفد زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگائے جا رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں آپ کو قیام گاہ تک لے جایا گیا۔ ۷؍اکتوبر کو شام کے ۵ بجے موتمر شروع ہوئی۔ صدر کے دائیں جانب آپ کے لئے کرسی مخصوص کی گئی تھی۔ سبجکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے رکھا گیا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی کے ۱۸ ممبر تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے یعنی حضرت مفتی اعظم (صدر جمعیۃ علمائے ہند) مولانا محمد عرفان اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن صدیقی ارکان وفد خلافت کمیٹی۔

آپ جہاز میں ہی علیل ہو گئے تھے اور مصر پہنچ کر بھی شدید بخار میں مبتلا رہے۔ اس لئے کانفرنس میں خود شریک نہ ہو سکے۔ حضرت مولانا عبد الحق مدنی نے موتمر میں آپ کا بیان پڑھا اور آپ کی نمائندگی کی۔ آپ کی علالت کے دوران میں شیخ ازہر علامہ مصطفےٰ المراغی کئی مرتبہ آپ کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ مصر میں شیخ ازہر کی پوزیشن شاہ مصر سے زیادہ ہے۔ یعنی شیخ ازہر سے ملاقات کے لئے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں آتے ہیں۔ شیخ الازہر کسی سے ملنے کے لئے کہیں تشریف نہیں لے جاتے۔ یہ خاص امتیاز تھا جو انھوں نے ہندوستان کے مفتی اعظم کے لئے برتا۔ موتمر میں تمام مندوبین عالم اسلام کے بیانات سے زیادہ سخت اور بے باکانہ آپ کا بیان تھا۔ قاہرہ سے رخصت کے وقت مصر کے علماء و زعماء نے چاہا کہ گروپ کے ساتھ آپ کا فوٹو لیا جائے۔ آپ نے انکار فرمایا بس پھر کیا تھا وہاں کے علماء نے مناظرہ شروع کر دیا۔ بڑی مدلل تقریریں شروع کر دیں۔ آپ نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں آپ نے دریافت کیا کہ یجابُ فیہ اَم لا؟ ایک صاحب بولے کیف لا! آپ نے فرمایا فھُوَ حرامٌ مجلس پر کچھ ایسی خاموشی چھا گئی کہ پھر اس مسئلہ کے

بارے میں کوئی شخص ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ (حضرت مولانا عبدالحق مدنی نے اپنے مقالہ میں یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہے)۔

دم واپسیں

۲۶ شوال ۱۳۵۹ھ کو آپ نے مدرسہ امینیہ کے انتظام کے بارے میں جو ہدایات شائع کی تھیں۔ اس کی تمہید مندرجہ ذیل ہے:۔

"چوں کہ مذہب کی آزادی وطن کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے لئے جد وجہد کرنا میں اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں اور اس فریضے کی ادائیگی کے جرم میں مجھے توقع ہے کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اس لئے مدرسہ امینیہ دہلی کی ان ذمہ داریوں کو جو میرے اوپر ہیں پیش نظر رکھ کر میں نے حسب ذیل انتظام کر دیا ہے تاکہ میری اسیری کے زمانہ میں مدرسہ کے کام میں کوئی خلل نہ آئے اور حقیقی نگران و محافظ تو رب العزت جل شانہ ہی ہے۔"

یہ مجاہدین ملت اور شہیدان وطن کا خواب تھا۔ افسوس کہ آزادئ وطن کے بعد بھی اس کی تعبیر پوری نہ ہوئی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے حصول مقصد کے لئے بڑی بڑی کٹھن منزلیں طے کیں، بڑی بڑی آفتیں جھیلیں لیکن اس بارگاہ کون و فساد سے کوچ کرنے سے پہلے خود اپنی آنکھوں سے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ گئے۔ ان کے کیا تاثرات اور کیا احساسات تھے۔ اب الفاظ میں کون ان کو بیان کر سکتا ہے۔ یہ جگر کا ناسور وہ اپنے ساتھ لے گئے، زندگی میں اس کو بہتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

آپ تقریباً ۱۹۴۷ء سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جلسوں اور پبلک کاموں میں کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ الہ آباد کے ہندی اخبار "امرت پتریکا" نے جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور اس کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کو جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے جمعیۃ علماء کے اہتمام سے بہت بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ اس کی صدارت آپ نے ہی فرمائی تھی۔ یہ دس برس کی گوشہ نشینی کے بعد پہلی اور آخری صدارت تھی۔ اسی وقت سے آپ کی صحت گرنے لگی۔ آپ ہر وقت اداس اور ملول رہنے لگے۔ ایک روز آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ہم کو بھی اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھنا تھا۔

ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی
میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

آہ! لبوں پر مہر خاموشی تھی۔ دل سلگ رہا تھا۔ عاشقان جاں باز کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو کبھی عشق سے واسطہ پڑا ہو۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ ملت اسلامیہ کے اس بوڑھے سپہ سالار کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ آدھی صدی دینی و سیاسی جدوجہد میں گذار کر بوڑھا شہسوار زمانے کی ناسازگاری سے

تھک چکا تھا۔ اب اس کو ایک نیند کی ضرورت تھی۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت کا ایک جھونکا آیا اور اس کو نیند آ گئی۔

یہ ۸۰ برس کی بے داغ زندگی کیا تھی۔ ایک شاعر کی نظر میں :-

زیست ہے ایک وقفہ موہوم
زندگانی سے زندگانی تک

لیکن یہ وقفۂ موہوم ایک انقلاب انگیز برق تھی۔ ایک اسوۂ حسنہ تھا حریم نبوت کی روشنی اور چمنستان شریعت کی نسیم تھی جو ۱۳/۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ ۳۱ دسمبر ۵۲ء یکم جنوری ۵۳ء کی درمیانی شب یعنی شب پنجشنبہ کو ۱۰½ بجے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آپ کے ہزاروں شاگرد ہندوستان، پاکستان، برما، ملایا، جاوا، سماترا، عراق، حجاز، شام، افغانستان، ایران، بخارا، ختن، تبت، چین اور افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر میں سے حضرت مولانا حافظ اعزاز علی (استاذ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا حافظ احمد سعید (ناظم اول جمعیۃ علمائے ہند) آپ کے محبوب اور خاص تلامذہ میں سے ہیں۔

آپ کے کمالات و فضائل کی شرح و تفصیل مجھ جیسے ہیچمداں کے امکان سے باہر ہے۔ اپنی کوتاہ علمی نیز قلت گنجائش کی وجہ سے مقالہ ہذا کو ختم کرتا ہوں۔ ابھی آپ کے کمالات و فضائل اور آپ کی علمی و دینی خدمات پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ موجودہ نسل کو بھی آپ بہت کچھ سکھا گئے اور آئندہ نسلیں بھی آپ کے اسوہ سے بہت کچھ سیکھیں گی۔ چودھویں صدی ہجری کا یہ عظیم المرتبت انسان تھا جو انبیاء علیہم السلام کی سادگی و استغناء، خودداری و تحمل، دیانت و امانت، صبر و قناعت اور عزم و استقلال کا نمونہ پیش کر گیا۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَمَتِّعْنَا بِاُسْوَتِہٖ اِنَّکَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ ٥

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت خاموشی پسند تھے وقار اور متانت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے اور احباب و رفقاء آپ کی ہیبت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور مرنجان مرنج تھے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنرمند ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لئے مشکل نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ اور دلفریب تھا۔ آپ کا کمال خوشنویسی بالکل وہبی اور محض عطیہ ربانی تھا۔ خوش نویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔ (منشی محمد دین خوشنویس دہلوی کے صاحبزادے مسٹر ضیاء الدین نے اپنی کسی کتاب میں مفتی اعظم کے حالات لکھے

ہیں۔ سنا ہے کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ مفتی اعظم خوشنویسی میں میرے والد (منشی محمد دین) کے شاگرد تھے یہ بالکل غلط ہے) حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ کوئی امتیازی شان پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی ادب میں اور عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے علماء نے آپ کی زبان دانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے آپ کو اہل زبان کی طرح شستہ زبان بولتے ہوئے سنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ یتلألأ العلم والوقار فی جبینہ (اس شخص کی پیشانی پر علم اور وقار چمکتا ہے)۔

عالم اسلام کے اکثر علماء سے آپ کے تعلقات اور خط و کتابت تھی۔ مفتی اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید توفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آتے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لیڈر تو آپ کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ کی دعوت کی۔ دسترخوان پر چنے کی دال کا بھرتہ بھی تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ دال ضرورت سے زیادہ لذیذ کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے پکائی ہے اور چونکہ خلوص کے ساتھ پکائی ہے اس لئے لذیذ معلوم ہو رہی ہے۔

آہ! اب نہ وہ خلوص والے رہے، نہ وہ خلوص کی قدر پہچاننے والے رہے۔ حکیم صاحب مرحوم اپنی مجلس اور مطب میں کسی والیٔ ریاست کے استقبال کے لئے بھی کھڑے نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب آپ تشریف لاتے تو سروقد کھڑے ہو جاتے تھے اور دور تک دروازے سے آپ کو اپنے ساتھ لاتے تھے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ مگر خود کسی کو بیعت نہیں کیا۔ جب کوئی عقیدت مند بیعت کی درخواست کرتا تھا تو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یا مولانا عبد القادر رائے پوری یا مولانا حسین احمد مدنی مدظلہم العالی یا مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف کچھ بیمار ہو گیا۔ اس وقت چھ سات برس کی عمر تھی۔ والد مرحوم نے اپنے ایک شاگرد مولوی محمد ایوب کوٹھاپوری کے ساتھ مجھے ڈاکٹر انصاری کے مطب میں بھیجا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا مطب مسجد فتحپوری کے شرقی دروازہ کے دائیں جانب کمرے پر (بالمقابل کورونیشن ہوٹل) واقع تھا۔ مطب کے منیجر غالب صاحب تھے (جو رشتے میں غالباً ڈاکٹر صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے) تمام آنے والے مریضوں کے نام

رجسٹر پر لکھتے تھے، فیس وصول کرتے تھے اور مطب میں ترتیب وار بھیجتے تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کی فیس پانچ روپے تھی۔ والد محترم نے مجھکو اپنے ساتھ لے جانا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب فیس قبول نہ کریں۔ محمد ایوب کو سمجھا دیا تھا کہ وہاں میرا نام نہ لینا۔ جب مطب میں پہونچے، فیس پیش کی تو غالب صاحب نے پوچھا کہ اس بچہ کے والد کا کیا نام ہے۔ مولوی صاحب نے کہا عبداللہ پھر پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں انھوں نے کہا یہیں دلی شہر سے۔ غالب صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ نوٹ ہاتھ میں تھا اور الٹ پھر کر مختلف سوالات کر رہے تھے۔ دیگر حاضرین بھی حیران تھے کہ اس قدر تحقیقات کیوں ہو رہی ہے۔ آخر جب کچھ نہ کھلا تو نوٹ کو میز کی دراز میں رکھ لیا اور اندر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔ دو تین منٹ کے بعد واپس آئے اور ہم کو نمبر کے خلاف اندر بھیج دیا۔ ہم معائنہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا جب ان کی متجسس اور متبسم نگاہیں مجھ پر پڑیں تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سورج کی شعاع میرے دل کو گرما رہی ہے۔

میرے سلام کے جواب کے بعد میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے پہلا سوال یہ کیا۔ کہو بیٹا تمھارے ابا کا کیا نام ہے؟ میں نے کہا اباجی، بے ساختہ ہنس پڑے اور مولوی ایوب سے کہا کہ مولوی صاحب سچ کہئے، کیا یہ مولانا کفایت اللہ کا بچہ نہیں ہے؟ اب سوائے اقرار کے کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً فیس واپس کروا دی۔ مجھ سے فرمایا کہ دیکھا میں نے تم کو کیسا پہچانا۔ معائنہ کے بعد نسخہ لکھ کر دیا اور چلتے وقت کہا کہ اپنے اباجی سے میرا سلام کہنا۔

اہل حاجت اور مستفتی لوگوں کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ لیا اوقات رات کے بارہ اور ایک بجے لوگ فتویٰ لینے آتے تھے۔ آپ بستر استراحت سے خود اٹھ کر تشریف لاتے تھے اور پیشانی پر بل بھی نہ آتا تھا۔ آپ کے ایک شاگرد مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ ایک روز مدرسہ امینیہ سے واپسی کے دوران کاٹھ کے پل پر ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ حضرت مجھے ایک ضروری فتویٰ لینا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان سے فتویٰ لیا اور کمپنی باغ کے دروازے کے سامنے پٹرول پمپ کے پاس ایک چارپائی پر اجازت لے کر بیٹھ گئے اور فتویٰ کا جواب لکھ کر اسی وقت ان کے حوالہ کیا۔

یہ چیز آپ کی فطرت میں داخل تھی کہ آپ کسی ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا نہیں ہزاروں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران اگر کوئی آجاتا تھا تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ اور جا کر ملاقات کرتے تھے۔ اور اگر فتویٰ لے کر کوئی آتا تھا تو فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ غرضکہ فتویٰ لکھنے کے لئے کوئی خاص وقت کبھی مقرر نہیں کیا۔ چوبیس گھنٹے اور آرام و راحت حتیٰ کہ پوری

زندگی افتاء اور اہل حاجت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

طبیعت بے انتہا غیور تھی کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت یا اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ایک دوکان دار سے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت حقیقت میں دس روپے تھی۔ اس نے کہا کہ حضرت ویسے تو میں پندرہ روپے لیتا ہوں، مگر آپ سے دس روپے لوں گا۔ آپ کے پاس اس وقت صرف دس روپے تھے، دوکان دار کو کچھ نہیں دیا۔ گھر آکر اپنے شاگرد (مولوی ضیاء الحق دہلوی) کو پندرہ روپے دیئے اور فرمایا کہ اگر وہ پورے پندرہ روپے نہ لے تو اس کے سامنے پھینک کر آجانا۔

مکان کے لئے زمین خرید لی تھی، مگر بنوانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ دہلی کے ایک رئیس نے آپ سے درخواست کی کہ میں روپیہ پیش کردوں گا آپ تعمیر شروع کرا دیجئے۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر انھوں نے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا کچھ روپیہ قرض دے دو اور پرونوٹ لکھوا لو۔ انھوں نے ضابطے کے مطابق پرونوٹ انگریزی میں ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ فرمایا کہ اس کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ انھوں نے ترجمہ سنایا تو آپ نے دستخط کرنے سے انکار فرما دیا کیونکہ اس میں شرح سود بھی لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے بہت کچھ سمجھانے اور تسلی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے، ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی کو سود دیا، نہ کسی سے سود لیا۔ فرمایا کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انھوں نے دوسرا پرونوٹ ٹائپ کرایا جب آپ نے دستخط فرمائے۔ قرض سے ہمیشہ بچتے تھے، وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہیں تھے۔

چند متفرق حکایتیں[له]

ایک مرتبہ والئ چترال نے حضرت مفتی اعظم کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں دریافت کیا گیا کہ دہلی میں عید کا چاند ہو گیا یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحب موجود نہیں تھے۔ مدرسہ امینیہ میں چند چترالی طلبہ تھے۔ انھوں نے تار کا جواب دیدیا کہ چاند ہو گیا۔ اس کے مطابق چترال میں صبح کو عید کرلی گئی۔ والئ چترال نے حضرت کو خط لکھا کہ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ایک بہت بڑے اختلافی مسئلے کو حل فرما دیا۔ یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر نہ ہوتی تو آپ تار کا جواب نہ دیتے۔ حضرت مفتی صاحب نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اس کے جواب کی مجھے قطعاً کوئی خبر نہیں کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اس کا جواب دیا اور یہی بات تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

ایک مرتبہ ایک افغانی طالب علم نے حضرت سے دریافت کیا کہ اگر کسی کو پیشاب کا قطرہ آجائے

له چند متفرق حکایتوں کا اب نظر ثانی کے وقت اضافہ کیا گیا۔ (واصف)

تو کیا کرے فرمایا ڈھیلے سے خشک کرلے۔ اس نے کہا اگر پھر آجائے تو کیا کرے فرمایا کپڑے سے پونچھ لے، کہا اگر پھر آجائے فرمایا پانی سے دھولے۔ اس نے کہا اگر پھر آجائے فرمایا انگیٹھی میں رکھکر سکھالے۔

ایک مرتبہ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند اور مولانا محمد عرفان صاحب جو اُس زمانے میں اخبار الجمعیۃ کے مدیر تھے۔ اور مولوی حافظ عبد الغنی دہلوی حضرت کے پاس دولت خانے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کچھ ضروری اور اہم معاملے پر گفتگو تھی۔ اسی دوران میں ایک شخص استفتاء لیکر آیا آپ نے فرمایا کل لے جانا۔ اس نے اصرار کیا کہ ابھی جواب کی ضرورت ہے۔ آپ نے کام چھوڑ کر فتوے کا جواب لکھنا شروع کردیا۔ دوسرے حضرات کو کچھ گرانی اور انقباض ہوا۔ مولوی عبد الغنی صاحب نے فرمایا کہ مولوی عبد الحق (مصنف تفسیر حقانی) نے فتویٰ کے جواب کے لئے خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص فتویٰ لے کر آتا تو جھڑک دیا کرتے تھے اس پر مولانا محمد عرفان نے کہا کہ حافظ صاحب وہ زمانہ اور تھا اگر موجودہ دور میں ایسا کیا جائے تو دوسرے ہی دن دیواروں پر بہت بڑا پوسٹر دکھائی دیگا جس کا عنوان جلی حروف میں ہوگا "مغرور مفتی" اس پر ہنستے ہنستے چاروں حضرات کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

جمعیۃ علماء کے سالانہ اجلاس پشاور کے موقعہ پر آپ اور شیخ الاسلام مولانا مدنی وغیرہ شاہی مہمان خانے میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز چاء پینے کی رائے ہوئی۔ آپ نے چولھا جلایا۔ مولانا محمد عرفان پانی للئے۔ مولانا مدنی پیالیاں اٹھا کر لائے چائے کا پانی رکھدیا گیا۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ مولانا محمد عرفان صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں بہت نمایاں اور غیر معمولی فرق ہے یعنی دایاں ہاتھ بہت بھاری اور طاقتور معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسا نہیں دیکھا گیا۔ یہ کیا بات ہے ؟ آپ نے مولانا مدنی کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان سے پوچھئے۔ اس نمایاں فرق کے ذمہ دار یہ ہیں۔ مولانا مدنی خاموش بیٹھے تبسم فرمارہے تھے آپ نے ان کے گدگدی کرنی شروع کی اور فرمایا کہ بولتے کیوں نہیں۔ دیوبند میں پنجہ لڑاتے تھے یا نہیں ؟

مرض وفات میں جبکہ آپ بالکل صاحب فراش تھے ایک روز نلان کے وقت خدام نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرکے کل آپ کو غسل کرادیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ

بہت سخت سردی پڑ رہی ہے نقصان تو نہیں ہوگا۔ مولوی ضیاء الحق نے عرض کیا کہ بجلی کا ہیٹر رکھ لیا جائے گا اور ہوا سے بچانے کے لئے چاروں طرف پردے تان لئے جائیں گے۔ فرمایا اچھا ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لینا۔ مولوی اختر نے مولوی ضیاء الحق سے کہا کہ جائیے ڈاکٹر صاحب سے ٹیلیفون پر پوچھ لیجئے۔ انھوں نے کہا کل صبح ہی پوچھ لوں گا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا کہ ابھی پوچھ لیجئے۔ مولوی ضیاء الحق نے پھر ٹال دیا۔

دو تین منٹ خاموشی رہی پھر حضرت نے فرمایا کہ بھئی تم سمجھے نہیں۔ مولوی اختر کا یہ مطلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے ٹیلیفون پر ابھی دریافت کر کے ابھی اسی وقت نہلا دو۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی زبیدہ خاتون تھی۔ جو ۱۸ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ اس سے آپ کو بہت محبت تھی۔ جب وہ چار پانچ سال کی تھی ایک مرتبہ گھر میں شلجم منگائے گئے۔ زبیدہ نے ان میں سے مٹی اور ریتہ چھڑا کر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد والدہ نے وہ مٹی کوڑے پر پھینک دی۔ جب بچی کو اس کا علم ہوا تو مچل گئی بلک بلک کر رونے لگی والدہ نے بہت منایا بہلایا پھسلایا۔ آپ نے بھی بہت کچھ چپکا کرنے کی کوشش کی۔ گود میں لے کر بازار سے مٹھائی دلوائی مگر کسی طرح اس کی ضد نہ گئی۔ گملوں میں سے مٹی نکال کر اس کو دی مگر وہ کہتی تھی کہ میں تو شلجم کی مٹی لونگی۔ آخر آپ اس کو گود میں لیکر سبزی فروشوں کی دکانوں پر گئے اور کئی دکانوں سے شلجم کی مٹی جمع کر کے لائے تب وہ خوش ہوئی۔ گھر میں آکر فرمایا کہ ماں باپ ان پھول سے بچوں اور خاص کر بچیوں کی کس قدر ناز برداری کرتے ہیں، کس محنت اور محبت سے پالتے ہیں۔ جب یہ دوسرے گھر جاتی ہیں تو وہ لوگ ان تمام محنتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ کے دلوں کو کس قدر صدمہ اور دکھ پہنچاتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۴ء میں راقم الحروف نے کراچی کا سفر کیا۔ جیکب لائن میں قیام کیا قریب ہی سید محمد رضا صاحب عرف ملا واحدی دہلوی کا مکان بھی ہے۔ ایک روز وہاں جا رہا تھا کہ راستے میں مولوی عبد الحق سواتی مل گئے۔ مولوی عبد الحق سواتی فاضل امینیہ حضرت مفتی اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں اور جہانگیر پارک کی مسجد کے خطیب ہیں۔ وعظ بھی کہتے ہیں۔ میں ان کو بھی اپنے ساتھ ملا واحدی کے ہاں لے گیا۔ وہاں بیٹھکر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر واحدی صاحب نے حضرت مفتی صاحب کا تذکرہ شروع کیا۔ دوران گفتگو میں مولوی عبد الحق نے کہا کہ ایک روز حضرت دار الحدیث میں مسند پر تشریف رکھتے تھے حدیث کا درس ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم نور محمد کو آواز دی وہ جب قریب آیا تو فرمایا جاؤ اس عبد الحق کی پگڑی۔

اور گل محمد کی شلوار نمائش میں رکھ آؤ۔ (اتفاق سے اس روز میرا عمامہ اور گل محمد کی شلوار بے انتہا میلی تھی)۔

مولوی عبدالحق نے ایک اور واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دارالحدیث میں صبح کے وقت ہم لوگ (یعنی درس حدیث کی جماعت) اپنے معمول کے مطابق آکر بیٹھ گئے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ حضرت تشریف لائیں تو سبق شروع ہو۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لا رہے ہیں جو بالکل حضرت مفتی اعظم کے مشابہ ہیں، اور حضرت ہی کی طرح ان کی بھی ڈاڑھی سفید ہے۔ دارالحدیث میں تشریف لا کر فرمایا کہ کیا تم لوگ پسند کرو گے کہ آج حدیث کا سبق میں تم کو پڑھاؤں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں اپنا تعارف فرمائیے۔ فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں میرا نام محمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سب طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی کیا ہوگی کہ آپ حدیث پڑھائیں آپ ہی کی تو حدیث ہے۔ غرض کہ حضور علیہ السلام نے مسلم کی ایک حدیث پڑھائی اور تقریر فرمائی۔ مولوی عبدالحق نے کہا کہ آپ کی وہ پوری تقریر مجھے آج تک یاد ہے اس کے بعد آنکھ کھل گئی اور صبح کو میں حسب معمول مدرسے پہنچا اور دارالحدیث میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں حضرت مفتی اعظم تشریف لائے۔ اپنی مسند پر بیٹھ کر کتاب کھولی اور سبق شروع کرانے کا ارادہ فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہو۔ میں نے رات کو جو خواب دیکھا تھا وہ سنایا۔ خواب سنتے ہی حضرت مسند پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا عبدالحق قبلہ رخ کھڑے ہو کر خدا کو گواہ کر کے کہو کہ واقعی تم نے اسی طرح خواب میں دیکھا ہے۔ میں حکم بجا لایا۔ آپ مسند پر سے ہٹ کر سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا عبدالحق تمہارا خواب سچا ہے۔ وہ حضور پُرنور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو اس دارالحدیث میں جلوہ افروز ہوئے تھے۔ مگر عبدالحق تم اپنے ایمان کی خبر لو۔ تمہارا ایمان کمزور ہے تم نے حضور کی ڈاڑھی سفید دیکھی ہے حالانکہ آپ کی ڈاڑھی سیاہ تھی۔

مولوی عبدالحق نے یہ واقعہ ملا قادری کی موجودگی میں سنایا اور کہا کہ پھر حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ تقریباً چالیس روز تک مسند پر نہیں بیٹھے بلکہ مسند کے سامنے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر درس دیتے رہے۔

ایک دفعہ اخبار سہ روزہ الجمعیۃ میں ایک تصویر والا اشتہار چھپ گیا۔ آپ نے فوراً ایڈیٹر صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا:-

مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب مدیر الجمعیۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

اخبار الجمعیۃ میں دو اشتہاروں میں تصویریں چھپی ہیں۔ تصویر بنانا چھاپنا جائز نہیں۔ بالخصوص جمعیۃ کا

اخبار ایسی چیزوں سے ملوث نہ ہونا چاہیئے۔ محمد کفایت اللہ غفرلہ

حضرت صدر محترم کا مراسلہ جو اوپر درج کیا گیا ہے بالکل بجا ہے۔ اور مجھے سخت افسوس ہے کہ الجمعیۃ میں تصویریں چھپ گئیں۔ مگر اس میں میری کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ میں سفر حجاز سے واپس ہو کر کچھ ایسی پریشانی اور علالت میں رہا کہ اخبار کا کام نہ دیکھ سکا۔ اور محررنے یہ اشتہار لے لئے اور وہ درج اخبار ہو گئے۔ بہرحال یہ افسوسناک غلطی ہوئی۔ اور مجھے اس پر افسوس و ندامت ہے۔ آئندہ انشاءاللہ ایسا نہ ہوگا۔ ابو المعارف محمد عرفان مدیر الجمعیۃ

(سہ روزہ الجمعیۃ مورخہ ۲۶ راگست ۱۹۲۵ء دہلی)

حضرت مفتی صاحب کی منکسر المزاجی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مورخہ ۵ راپریل ۱۹۲۲ء کو مولانا محمد عبد الحلیم صاحب صدیقی ناظم جمعیۃ علمائے ہند کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوا اور وہ جیل گئے تو حضرت مفتی اعظم صدر جمعیۃ علمائے ہند اور چار پانچ حضرات ان کو جیل تک پہنچانے کے لئے گئے۔ اور مولانا کو خدا کی حفاظت میں چھوڑ آئے۔

(ہفتہ وار مسلم دہلی مورخہ ۸ راپریل ۱۹۲۲ء)

حضرت مفتی صاحب کے ایک شاگرد مولوی سید محمد فاروق (ناظم "بچوں کا گھر") کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک استفتاء صوبہ سرحد سے آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنے خسر کو جو مشہور عالم دین تھے زدوکوب کیا اور سخت توہین کی۔ اس پر جواب لکھا ہوا تھا اور بہت سے علماء کے تصدیقی دستخط تھے۔ تمام جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ عالم دین کی توہین دین کی توہین ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے۔ لہٰذا وہ شخص کافر ہو گیا۔ مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ میں نے بھی ان تمام جوابات کی تصدیق کی اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ تمام جواب غلط ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مارنے والا کافر نہیں ہوا کیونکہ اس نے عالم کی توہین نہیں کی بلکہ اس شخص کی توہین کی ہے جو کسی خانگی اور نجی جھگڑے میں اس کا مخالف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اتفاقاً وہ عالم دین بھی تھا۔ لہٰذا اس مارنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

ایک مرتبہ ایک استفتاء آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جارہی تھی۔ ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا۔ وہ اس کی توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دیدے۔ اس نے مسجد کی شان میں نامناسب الفاظ کہے۔ آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ چونکہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی توہین

کفر ہے لہٰذا وہ شخص کافر ہوگیا۔ جواب دیکھکر حضرت نے فرمایا کہ ابھی سے تم تے کافرسازی شروع کردی۔ مفتی بن جاؤگے تو کیا کروگے؟ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جا سکتا ہو تو اس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ اس سوال میں تو مسجد کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے۔ فرض کرو کہ وہ مسجد زمین مغصوبہ پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہوگئی ہو اس لئے اس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں اسلئے اتنی جلدی ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیئے۔

حکیم محمد بشیر مرحوم دہلی کے ایک مشہور طبیب اور خوشنویس تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مقدمہ کے سلسلے میں عدالت میں پیش کرنے کے لئے ایک استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر ہندوستان کے مشاہیر علماء سے جواب منگائے گئے۔ آخر میں وہ تمام جوابات اور تصدیقی دستخط وغیرہ لے کر میں سنہری مسجد میں حاضر ہوا (اس زمانے میں مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا) اور وہ استفتاء حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے دیکھکر فرمایا کہ تمام جوابات غلط ہیں۔ عرض کیا کہ آپ جواب تحریر فرما دیجئے۔ فرمایا کہ علیحدہ سادے کاغذ پر سوال کو نقل کردو۔ میں نے کاغذ لیکر سوال نقل کردیا۔ آپ نے قلم برداشتہ دو سطروں میں ایسا جامع و مانع جواب لکھا کہ وکلا اور جج اس کی عبارت کی خوبی و بلندی کو دیکھکر دنگ رہ گئے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہمرکاب تھا۔ جس ڈبے میں ہم دونوں تھے اسی میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب دو تین بھاری بھرکم قادیانی مولوی بھی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسّان اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتا تھا مگر یہاں معاملہ دین کا ہے اسلئے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو ابھی یہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت

حضور کی ہی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے تو یہ تو فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ میں تو کسی خاص قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے۔ مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی غیر ضمنی اور ظلی بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے نفی جنس نے نبوت کے تمام اقسام و اصناف کی نفی کر دی ہے۔ پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟

قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے آپ کے ہی دین کی تجدید کے لئے نبی آسکتا ہے اور اس سے آپ کے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظم نے فرمایا نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائیگا انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کے دعوے کے مطابق قیامت تک کے لئے نبی ہیں پھر حضور کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؟ بولیے جواب دیجئے!

حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا۔ بولیے جواب دیجئے۔ مگر اُدھر ایسا سناٹا چھا گیا کہ صدائے برنخاست قادیانی اک دم مبہوت ہو گئے بالکل جواب نہ دے سکے۔

پھر فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضور قیامت تک کے لئے نبی ہیں خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوت میں کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی؟ اور اس کی ضرورت کیوں؟ بولیے جواب دیجئے! مگر صدائے برنخاست۔

قادیانیوں پر اوس پڑ گئی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور ہونٹ خشک ہو گئے۔ اور بالکل ساکت و صامت ہو گئے تو حضرت والا ماجد نے تقریبًا ایک گھنٹے تک قادیانیت کے رد میں مسلسل تقریر کی۔

اس کے بعد دلی کے ہم سفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ اپنا تعارف تو فرمایئے۔ فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں۔ مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔

اُس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ڈبے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے بھی یہ تمام گفتگو سنی تھی بہت شکریہ ادا کیا اور ان دولت مند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذبذب ہو گئے تھے۔ آپ نے بر وقت ہماری دستگیری کی۔ اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے نادم ہوئے کہ دلی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم تھے

اُدھر قادیانی مولویوں کا یہ حال تھا کہ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا بھی بھول گئے تھے۔ اُس وقت غالباً راقم الحروف کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ (اور اب غفلت و معصیت کی اٹھاون منزلیں طے ہو چکی ہیں) افسوس کہ والد ماجد کی بحث اور محققانہ تقریر نہ تو میں سمجھ سکتا تھا نہ یاد رہ سکتی تھی۔ اتنا خوب یاد ہے کہ بحث تو کچھ زیادہ ہوئی ہی نہیں دو چار جملوں میں ہی قادیانی مولویوں کا کام تمام ہو گیا۔ البتہ بعد میں تقریر خاصی طویل اور مفصل تھی۔ واقعہ کا ایک خاکہ ذہن میں محفوظ تھا جا پنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تحریر کر دیا ہے۔

غرض نقشے ست کز ما یاد ماند — کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت — کند در کار درویشاں دعائے

واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین

حفیظ الرحمان واصف

صفر المظفر ۱۳۸۶ھ

مفتی اعظم

عزیز صاحب وارثی — تجھرایونی

آہ! اے مفتی اعظم حامل رازِ خودی — زندگی رشکِ ملائک بالیقیں تھی آپ کی
آپ کے دم سے ہمارا گلستاں شاداب تھا — آپ کا ہر لفظ علم و فضل کا اک باب تھا
آپ اک صوفی بھی تھے عالم بھی اور فاضل بھی تھے — بزم نجم و کہکشاں میں اک مہ کامل بھی تھے
آپ کی شہرت رہینِ منتِ عالم نہ تھی — شہسوارانِ وطن ہی پھر بھی عزت کم نہ تھی
آپ کے اُٹھنے سے دنیا پر اداسی چھا گئی — آپ کے ہمراہ بزم زیست کو موت آ گئی
شمع کو آج اپنے پروانوں سے نفرت ہو گئی — محفلِ عشرت کی ہر اک چیز عبرت ہو گئی
اب نکاتِ علم آکر ہم کو سمجھائے گا کون — دین کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھائے گا کون
پیار اور اخلاص کی تعلیم پائیں گے کہاں — آپ کی محفل کے یہ پروانے جائینگے کہاں
ہے پریشانی کہ دل کی بات اب کس سے کہیں — عصر نو میں آپ کی کتنی ضرورت تھی ہمیں
آپ کی ہستی کے سب طوفاں کنارے ہو گئے — سب کا جو پیارا رہا آپ اس کے ہی پیارے ہو گئے

دامنِ ضبط و تحمل پارا پارا کر لیا
آج ہم نے آپ کا غم بھی گوارا کر لیا

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ کی مقدس زندگی کے چند واقعات

(از سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند)

یوں تو حضرت مفتی صاحب قبلہ کی ہمراہی کا مجھ کو ہر سفر اور حضر میں شرف حاصل رہا ہے اور ہمیشہ ان کی خداداد قابلیت کا معترف اور ثنا خواں رہا ہوں۔ لیکن تین سفر جو قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں اس فقیر کو میسر آئے ہیں وہ تمام عمر مجھ کو یاد رہیں گے اور وہی میرے لئے انشاء اللہ توشہ آخرت ہوں گے۔ پہلا سفر، سفر حج ہے جو مفتی صاحب قبلہ کا پہلا سفر اور میرا دوسرا سفر تھا۔ اگرچہ مفتی صاحب قبلہ کا ارادہ کئی سال سے ہو رہا تھا لیکن حسن اتفاق سے مؤتمر اسلامی کا موقع نکل آیا۔ اور اس تقریب کی وجہ سے بعض اچھے اچھے اور مشہور حضرات رفیق سفر ہو گئے۔ علی برادران۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا سراج الحق صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کثر اللہ سوادکم۔ مولانا محمد عرفان۔ مولانا عبد الحلیم صدیقی۔ مولانا مرزا عمر دراز بیگ صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ یہ سب حضرات ہندوستان کی مختلف کمیٹیوں کی جانب سے وفود کی شکل میں تشریف لے گئے تھے۔ کچھ مخلصین تھے جو محض اس خیال سے ہمراہ ہو گئے تھے کہ حج سفر کے ساتھ مؤتمر اسلامی میں شریک ہو سکیں گے۔

مفتی صاحب اس سفر میں بالکل خاموش تھے البتہ کبھی کوئی آ بیٹھتا تو بات کر لیتے ورنہ اپنے کیبن میں رہا کرتے۔ جب نماز پڑھنے نکلتے تو عرشہ پر بیٹھ جاتے۔ جس قدر ہمراہی تھے وہ یا تو مفتی صاحب کے ہم سبق علماء تھے یا آپ کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تھے۔ جہاز میں ہم سب لوگ کھانا ایک ہی جگہ کھاتے تھے۔ قرنطینہ میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کو میں نے دیکھا کہ بچھا رہے ہیں جو کپڑے لوگوں کے بھیگ گئے تھے وہ دھوپ میں پھیلا رہے ہیں۔ اور جب خشک ہو جاتے ہیں تو ان کپڑوں کو بہت قاعدہ سے طے کر کے ہر کپڑے کے مالک کو پہنچاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، آپ یہ کیا کر رہے ہیں فرمایا یہ سفر حج ہے۔ اس میں لوگوں کی مدد کر رہا ہوں جدہ پہونچنے کے بعد تمام وفود سعودی حکومت کے مہمان ہو گئے اور سعودی حکومت کی نگرانی میں ہم لوگ مکہ معظمہ پہنچا دیئے گئے۔ وہاں مختلف اسلامی ممالک کے وفود قیام پذیر تھے۔ وہاں پہونچ کر مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیالات ہوتے رہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ سے عرب کے علماء گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ بحث کا موضوع عام طور سے ملوکیت اور جمہوریت ہوتا تھا۔ یمن کے حضرات ملوکیت کے بہت حامی تھے۔ لمبی اور طویل گفتگو کے بعد کچھ لوگ جمہوریت کے قائل ہو جاتے تھے۔

علی برادران اور مفتی صاحب

علماء وفود کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کا بہت سا وقت علی برادران سے گفتگو میں خرچ ہوتا تھا۔ اور وہ علی برادران کو نرم پالیسی اختیار کرنے پر آمادہ کرتے رہتے

تھے۔ ابتدائی کانفرنس کے بعد مختلف سب کمیٹیاں منتخب ہوئیں اس میں سب سے اہم وہ سب کمیٹی تھی جو تجاویز مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے کنوینر سید سلیمان ندوی تھے۔ اس کمیٹی کے تمام جلسے حضرت مفتی صاحب قبلہ کی صدارت میں ہوتے تھے اور جو تجویزیں کھلی کانفرنس میں پیش ہوئیں وہ تقریباً تمام حضرت مفتی صاحب کی مرتب کردہ تھیں۔ کئی روز تک کانفرنس ہوتی رہی۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہم لوگ مدینہ منورہ چلے گئے۔ چوں کہ یہ سفر اونٹوں پر ہوا تھا اس لئے رات کو جہاں قافلہ ٹھہرتا مفتی صاحب قبلہ تمام انتظام کرتے۔ پاخانہ باورچی خانہ درست کرتے اور قدمچوں کے لئے پتھر تلاش کرتے پھرتے اور جب ہم سب سو جاتے اس کے بعد مفتی صاحب قبلہ تہجد کی نماز پڑھتے۔ تہجد کی نماز میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ پسند تھا یعنی کوئی شخص دیکھے نہیں۔ کسی شغدف کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جاتے۔ یا کوئی اور آڑ تلاش کر لیتے اور اس کے پیچھے اپنے کو چھپا کر نماز ادا کرتے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر وہاں کے علماء اور مشائخ کے ساتھ اکثر صحبتیں رہیں اور بعض علمی تذکرے بھی ہوئے۔ سب سے زیادہ رقت آنگیز وہ موقع تھا جب روضہ اطہر پر آخری سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ عام عادت یہ تھی کہ روضہ اطہر پر جب حاضر ہوتے تو اس کے بعد دیر تک کوئی بات نہ کرتے تھے۔ اور تقریباً گھنٹہ بھر تک خاموش رہتے تھے۔ لیکن آخری دن مفتی صاحب تقریباً تین گھنٹے تک خاموش رہے یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہو گیا اور مدینہ منورہ سے دور نکل آیا۔ تب بھی سکوت کا عالم طاری رہا۔ زیادہ وقت حضرت کا حرم مدینہ اور حرم مکہ میں گذرتا تھا۔ مفتی صاحب رات کو خاموشی کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں روپے تقسیم کیا کرتے تھے۔ غرض ان کی قابلیت کا اندازہ موتمر میں لگایا جاتا تھا اور خلوص و عبادت اور ان کے تقوی کا اندازہ حرم میں دیکھا جا سکتا تھا۔

دوسرا سفر حضرت مفتی صاحب قبلہ کے ہمراہ گجرات جیل کا اور تیسرا سفر ملتان جیل کا ہوا۔

دوسرا اور تیسرا سفر

گجرات جیل میں صرف چار یا ساڑھے چار ماہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ معیت نصیب ہوئی۔ فتح الباری شرح بخاری کا پچھلا پارہ میں نے حضرت سے وہیں پڑھا۔ اس وقت جیل میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی مسٹر آصف علی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ خان عبد الغفار خاں۔ مولانا نور الدین صاحب لائل پوری۔ مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ اور بہت سے ہندوستان کے چیدہ حضرات موجود تھے۔ وہاں بھی مختلف صحبتیں مذہبی اور سیاسی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ خاص کر مولوی نور الدین لائل پوری تو ہر وقت ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ جیل خانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ اے کلاس کے قیدیوں کو مشقتی دیئے جاتے تھے۔ یہ مشقتی اخلاقی قیدیوں میں سے ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ ان قیدیوں سے کام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح کے قیدی ہیں۔ ان سے ہم خدمت کس طرح لے سکتے ہیں۔ اول تو مفتی صاحب اپنا ہر ایک کام

اپنے ہی ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ بات کہ ہم بھی قیدی ہیں اور وہ بھی قیدی ہیں۔ ہم بحیثیت ایک قیدی کے دوسرے قیدی سے ظلماً کس طرح خدمت لے سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اور بھی مشفقیتوں سے کوئی خدمت نہ لیتے تھے۔ چار مہینے کے بعد مسٹر آصف علی اور میں رہا ہو گئے۔ ہم لوگ دہلی چلے آئے اور ایک ماہ کے بعد حضرت مفتی صاحب قبلہ رہا ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔

تیسری مرتبہ ملتان جیل میں

تیسری مرتبہ ملتان جیل میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ملتان جیل میں پہلے مجھے پہونچنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ مجھ سے تقریباً بیس یوم کے بعد تشریف لائے۔ یہاں دہلی اور پنجاب کے بہت سے حضرات جمع تھے۔ مولانا داؤد صاحب غزنوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نکودری۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چودھری افضل حق۔ مولانا احمد علی صاحب لاہوری لالہ دیش بندھو۔ لالہ شام ناتھ۔ لالہ اوکارناتھ۔ مکند لال۔ چودھری شیر جنگ۔ مہاشہ اندر۔ مولانا عارف ہسوی۔ لالہ داؤدیال کے علاوہ اور بہت سے ہندو مسلمان تھے جن کے نام مجھے اب محفوظ نہیں۔

حضرت مفتی صاحب قبلہ کا شغل

حضرت مفتی صاحب قبلہ اپنی عادت کے موافق کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے۔ کچھ وقت لالہ دیش بندھو آنجہانی کو فارسی پڑھاتے تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے سراجی اور دیوان حماسہ جیل ہی میں پڑھا اور جب ملتان جیل میں مشاعرہ کا دور شروع ہوا تو مفتی صاحب قبلہ اکثر غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔

قیدیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے

عام طور سے مفتی صاحب سیا کرتے تھے۔ جو قیدی آتا اس کا کرتہ یا پاجامہ پھٹا ہوا دیکھا اور اس سے فرمایا لاؤ تمہارا کرتہ درست کردوں۔ جو شخص جیل سے رہا ہو کر جاتا اس کے لئے قصیدہ لکھا جاتا۔ اور حضرت مفتی صاحب قبلہ کی اصلاح کے بعد اس کو پڑھ کر سنایا جاتا۔ یہ پھٹے ہوئے کپڑوں کا سینا صرف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ اخلاقی قیدیوں کے کپڑے بھی سیا کرتے تھے۔ اخلاقی قیدیوں میں سے اگر کسی کا کرتہ یا پاجامہ پھٹ جاتا تھا تو وہ سیدھا حضرت مفتی صاحب کی کوٹھری میں پہونچ جاتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہی مشغلہ رہتا تھا۔ گرمی وہاں بہت سخت ہوتی تھی۔ مفتی صاحب بیمار بھی رہتے تھے۔ ایک دن شام کو غسل فرمانے کے لئے پانی گرم کیا۔ کوٹھری کے دوسرے درجہ میں کمبل پڑا ہوا تھا۔ آپ نہانے کے لئے تشریف لے گئے۔ کوئلہ کے دھوئیں کا اثر ہو گیا۔ کسی کو خبر نہیں۔ اندر سے نیم بے ہوشی کی حالت میں نکلے۔ کپڑے تو بدل لئے لیکن حواس صحیح نہ رہے۔ برابر کی کوٹھری والے نے آ کر بتایا۔ ہم سب لوگ پہنچے۔ چودھری افضل حق مرحوم نے تشخیص کی

کہ کوئلہ کے گیس کا اثر ہے۔ میجر فضل الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل کو بلایا گیا۔ انھوں نے دوا تجویز کی اور رات کو بارہ بجے مفتی صاحب قبلہ کی طبیعت درست ہوئی۔ مفتی صاحب قبلہ کو ڈیڑھ سال کی قید مسٹر ینگ کی عدالت سے ہوئی تھی۔ میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل رہا ہو گیا تھا۔ میری روانگی کے وقت مفتی صاحب قبلہ نے میرے لیے چند اشعار لکھے تھے۔ جواب میرے پاس محفوظ نہیں۔ ایک رمضان بھی ہم کو جیل میں نصیب ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے بہت خدمت انجام دی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی نے تراویح پڑھائی اور کئی قرآن شریف ختم کئے۔ بالآخر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اپریل ۳۳ء میں مفتی صاحب ملتان جیل سے رہا ہو کر دہلی پہونچے۔ یہ چند سطریں میں نے مولانا سید محمد میاں صاحب کے ایما پر لکھ دیں۔ ورنہ حضرت مفتی صاحب قبلہ کی حیات طیبہ کے لئے دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ۔

قطعات تاریخ وفات

از جناب مقبول صاحب بیوہاروی

صد دریغا کہ مفتیٔ اعظم | رفت وبگذاشت نقش فضل وکمال

ہاتفِ غیب حسب حالش گفت | وارثُ الخلد ہست سال وصال

۱۳۷۲ھ

از جناب معراج صاحب دمولپوری

شد برائے سیر جنت قبلہ سُنّی دل | مُبتلائے درد بے حد گشت چوں بزم جہاں

رحلتش را عیسوی سن گفت معراجِ حزیں | خُلد منزل پاک باطن مفتیٔ ہندوستاں

۱۹۵۳ء

از جناب محمد عمر خاں صاحب ثمر چھتاروی مدیر "جمہور" علی گڈھ

مفتیٔ اعظم کی رحلت آہ آہ | نائب ماہِ عجم ماہِ عرب

سالِ رحلت کا ثمر مصرعہ یہ ہے | "مردِ مومن جنّتی ہے پیش رب"

۱۳۷۲ھ

مادۂ تاریخ

مقبول صاحب بیوہاروی

فقیہ الامت مولانا کفایت اللہ | طغرائے علم بود

۱۳۷۲ھ | ۱۳۷۲ھ

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

(حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہی شیخ الادب والحدیث دارالعلوم دیوبند)

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ محررہٗ بالا نام عوام تو بجائے خود خواص کے قلوب میں بھی بصد عظمت متمکن تھا۔ زبانوں کا یہ حال تھا کہ کوئی اس کے مسمیٰ کو جبل علوم کہتا تھا۔ کوئی حلال حوادث ونوائب۔ اگر قومی مدارس کے طلبہ "زینت دہ مسند تدریس" کہتے تھے تو ملک وقوم کے ہمدرد ان کو قدوۂ اہل سیاست کہتے تھے غرض یہ کہ جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی باتیں تھیں۔ آپ کے رعب کا صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس وقت کا تصور کرو جبکہ صبح صادق طلوع ہو رہی تھی۔ کوچہ چیلاں کی دیندار جماعت سوتے ہوؤں کو نماز فجر کے لئے بیدار کر رہی تھی کہ کثیر التعداد پولیس اپنے چھوٹے بڑے افسران سمیت آئی بیدار کرنے والی جماعت کو آواز نکالنے سے منع کیا۔ اور پوری خموشی کے ساتھ اس مجسمہ حریت کو گرفتار کر کے لے گئے اور اس طرح لے گئی کہ کوچہ چیلاں کے بہت سے باشندے بھی اس وقت اس حادثۂ فاجعہ سے باخبر ہوئے جبکہ آپ دہلی جیل میں پہنچ چکے تھے۔

جن لوگوں نے یہ سماں اپنی نظروں سے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس گرفتاری کے وقت پولیس کا ایک ایک فرد اس طرح مراسیمہ اور بدحواس تھا کہ پاؤں کی چاپ بم کے گولہ کی طرح گھبرا دینے کا کام کرتی تھی۔ شاید بہادر شاہ بھی دہلی سے اس پردہ داری کے ساتھ روانہ نہیں کئے گئے ہوں گے۔

مادی طاقتیں اجسام وابدان ہی پر حکومت کر سکتی ہیں۔ مگر روحانی طاقت اور انسانی کمالات سے قلوب پر حکومت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی اس مغرور حکومت کو (جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اس کی سلطنت میں آفتاب غروب ہوتا ہی نہیں ہے) بھی ڈر تھا کہ آپ کی گرفتاری بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

انگریزی حساب سے ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ۱۹۵۳ء کے پہلے ہی دن میں تقریباً شام کے چار بجے ہم نے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کر دیا ۱۹۵۳ء کی آئندہ کارگذاری اسی سے ظاہر ہے ؎

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا

میرے الفاظ سے آپ کو غلط فہمی نہ ہو کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اعزاز علی بھی آپ کے مرقد کو مٹی سے بھرنے میں شریک تھا۔ میں تو ان بدنصیبوں میں ہوں کہ یکم جنوری کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کو تار کے ذریعہ سے نو بجے صبح کو اس سانحہ کی اطلاع ملی۔ آپ نے جہاں اور اپنے خدام کو بلا کر اس سے مطلع فرمایا۔ مجھ کو

بھی بلا کر مطلع فرمایا۔ اور میں اس امر کا ہمیشہ شکر گذار رہوں گا کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ کار تیار ہے ہمارے ساتھ چلو۔ میں اسی وقت آپ کی ہم رکابی میں روانہ ہوا مگر راستہ میں اضطراری اور غیر اختیاری طریقہ پر گھنٹہ بھر سے زائد تاخیر ہو گئی۔ اور یہ کار اس وقت پہنچی کہ مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم نماز سے فارغ ہو چکا تھا ہم سے کہا گیا کہ دہلی دروازہ جاؤ جنازہ وہاں ملے گا۔ ہم سب کو ظہر کی نماز پڑھنی تھی آگے چلے گئے پرانی دہلی میں مہرولی کی اس مسجد میں نماز ظہر پڑھی جس کے دروازے کے باہر اس وقت آپ کی آرام گاہ ہے کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ آ گیا ہم سب باہر آئے۔ تو جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ حضرت مہتمم صاحب اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ہمت فیوضہ تو کسی نہ کسی طرح قبر پر پہنچ گئے مگر میرے لئے کوئی امکان ہی نہ تھا، ہجوم میں کچل جانے کے ڈر سے میں تو پھر کار ہی میں بیٹھ گیا۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں تو جنازہ کی زیارت کر ہی نہ سکا۔ یکایک معلوم ہوا کہ قبر میں مٹی ڈالی جانی شروع کر دی گئی کہ کسی جلے ہوئے دل والے شخص نے نہایت مؤثر آواز میں کہا کہ ع

مرتے مرتے بھی ہمیں مرنا سکھا کر چل دیئے

اس مصرع کو سن کر خیال آیا کہ دہلی کی زبان اور لہجہ دونوں اب بھی کسی حد تک باقی ہیں ۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت مفتی اعظم ہند کی موت نے اصحاب بصیرت کو سمجھا دیا کہ ؎

یاد داری کہ وقت زادنِ تو	ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ بعد مردنِ تو	ہمہ گریاں بُوند و تو خنداں

یہ عمل اس طرح ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس تسخیر کا عمل ہوتا ہے جس سے وہ قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں۔ یہ مستبعدات زمانہ کو دیکھ کر اس درجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ کسی چیز کو ناممکن کہنا دشوار ہو گیا اس لئے ممکن ہے کہ ایسے عمل ہوں مگر تسخیر قلوب کا عمل اگر تیر بہدف ہے تو وہ "طرز زندگی" ہے جو اس مجسمہ علم واخلاق کا تھا۔ اور یہ سبق تھا جو "مَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" کے لئے تھا۔

پچاس برس یا اس سے کم زمانہ گذرا کہ میں بھاگلپور کے قصبہ پورینی میں ایک ابتدائی مدرسہ میں مدرس تھا۔ وہاں ایک کتاب میں (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا ہے) دیکھا کہ سکندر اعظم کے مرنے پر اس کے درباری حکماء نے طے کیا کہ نعش کے ارد گرد کھڑا ہو کر ہر ایک شخص کوئی مختصر اور حکمت آمیز بات کہے۔ چنانچہ ہر ایک نے چھوٹے چھوٹے اور مختصر مختصر جملوں میں کلمات حکمت ادا کئے۔ اس کتاب میں ہر ایک کے قول اور اس کے قائل کی تعیین تھی۔ مجھ کو صرف ایک قول یاد رہا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ قائل کا نام بھی یاد نہیں۔ میرے نزدیک ان سب

میں اچھا اور جامع حکم دکلمہ بھی تھا کہ

"انت میتاً اوعظ منک حیاً"

یعنی تم ہمیشہ ہم کو زمانہ کی اونچ نیچ سمجھایا کرتے تھے مگر مر کر دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کا جو عملی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے یہ زندگی بھر کی تمام نصیحتوں سے بڑھ کر ہے۔

میرا خیال ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات نے بھی جو سبق دیا ہے وہ ان کے زمانہ حیات کے تمام اسباق سے زیادہ مؤثر اور مفید ہے حمیت اسلامی، عزم و استقلال، بے خوفی کے ساتھ اعلان کلمۃ الحق وغیرہ وغیرہ اوصاف آپ کے فطری اور خلقی تھے۔ یہ امر آخر ہے کہ دہلی جا کر یہ اوصاف نمایاں ہو گئے۔

میں آپ سے شاہجہاں پور میں سکندر نامہ پڑھتا تھا کہ معلوم ہوا کہ سبزی منڈی (شاہجہاں پور) میں عیسائیوں نے اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ اسی روز حضرت مفتی صاحب مجھ کو اور مولوی اکرام اللہ خاں مرحوم ندوی اڈیٹر "کانفرنس گزٹ" (علیگڈھ) کو ساتھ لے کر مجمع میں جا گھسے۔ اور ان بدزبانوں پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ اول تو وہ سمجھے کہ کوئی ناواقف بول رہا ہے مگر اعتراضات کی اہمیت نے اُن کو بتایا کہ معترض معمولی انسان نہیں ہے تو مناظرہ سے انکار کر کے سب نے گانا شروع کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تقریباً دس قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُن کے اعتراضوں کے جواب اور خود ان کے مسلمات سے اُن پر اعتراض کرنا شروع کر دیئے۔

عیسائیوں کے اسٹیج میں رہ کر میں ان کی تقریر کے نوٹ حضرت مفتی صاحب کو مہیا کرتا تھا۔ اور وہ ہاتھ کے ہاتھ جوابات دیتے تھے۔ غالباً یہ سلسلہ دو ہفتے جاری رہا۔ پھر ختم ہوا۔ اور اس طرح ختم ہوا کہ عیسائیوں کی تقریر میں بجز میرے (کہ میں یادداشت مرتب کرنے کی غرض سے وہاں موجود ہوتا تھا) کوئی ایک متنفس ان کے پاس نہ جاتا تھا۔!

اس سے غالباً دو ایک سال کے بعد امریکن مشن کے ایک مشہور مبلغ پادری جوالا پرشاد نے رمضان المبارک (اور وہ بھی شاید موسم گرما کے رمضان) میں جلسہ کا اعلان کیا۔ اور اشتہار میں شائع کیا کہ آریوں اور اہل اسلام کو بھی رفع شبہات کا موقع دیا جائے گا۔ یہ اجلاس مشن اسکول کے وسیع ہال میں ہوا حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا عبدالکریم صاحب بقوی (مؤخر الذکر حضرت بھی غالباً دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں) ظہر کے بعد سے موجود تھے۔ پادری صاحب وقت معینہ سے دو گھنٹے بعد تشریف لائے۔ تقریر شروع کی۔ عشاء کا وقت آ گیا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالکریم صاحب کے ساتھ ہم نے ایک مسجد میں پانی کے ساتھ افطار کر لیا تھا۔ مگر اب بھوک زیادہ لگی۔ اُدھر یہ خیال کہ قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے چلا آیا مگر یہ دونوں حضرات وہاں شب کے

بارہ بجے تک رہے۔

یہ جلسہ کس طرح ختم ہوا مجھ کو معلوم نہ ہوا لیکن صبح کو ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ تھا کہ ان دونوں مولویوں نے اسلام کی لاج رکھ لی۔ خدا جانے یہ کہاں سے آ گئے تھے (ان دونوں سے شاہجہاں پور کے عوام عموماً ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اسی کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا کہ "مگر ان میں جو ایک دبلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا تم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غراتا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آ جاتا تھا"

اسی زمانہ میں شاہجہاں پور کے ایک تاجر چونہ حاجی عبدالعزیز اور حافظ سید علی اور حافظ مختار احمد کے ذریعہ سے "فتنۂ قادیانیت" نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کئے۔ مولوی محمد اکرام اللہ خاں مرحوم نے حضرت مفتی صاحبؒ ہی کے زیر سرپرستی اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ جن کی شہرت جلد ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کو ناکافی سمجھ کر خود ایک رسالہ "البرہان" جاری کیا۔ وہ زمانہ تقریر و تحریر کی آزادی کا زمانہ نہ تھا اس رسالہ کی بمشکل اجازت ملی تھی۔ غالباً یہ رسالہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آپؒ نے دہلی میں اقامت طے نہ فرمائی۔

ان کے خصائص میں تھا کہ "دوسروں سے خدمت نہ لو بلکہ ان کی خدمت کرو اور اپنی خدمت خود کرو۔"

چنانچہ جب آپؒ ملتان جیل سے واپس آئے تو اس وقت بچہ بچہ آپ کی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ بازار سے دودھ خرید کر دیگچی ہاتھ میں لئے ہوئے جا رہے ہیں۔ میں نے لپک کر دیگچی ہاتھ میں لینی چاہی تو پیچھے پھر کر مجھ کو دیکھا۔ اور دیگچی ہاتھ میں دیدی۔ میں نے عرض کیا کہ کیا گھر میں اور کوئی نہ تھا جو اس خدمت کو انجام دیتا۔ تو فرمایا کہ

"سب سے بڑا متکبر وہ ہے جو اپنی خدمت کو اپنے لئے عار سمجھے۔"

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہونے سے پہلے آپؒ دیوبند تشریف لائے تو ایسا اتفاق بھی ہوا کہ آپ نے رات میرے حجرہ ہی میں گذاری۔ عشاء کے بعد آرام فرمایا تو میں نے پیر دبانا شروع کر دیئے۔ پیر پھیلا دیئے۔ اور ایک دفعہ بھی تو نہ فرمایا کہ پیر نہ دباؤ۔ جوتے سیدھے کئے تو یہ نہ فرمایا کہ نہ کرو۔ مجمع میں تو بے شک مولانا اعزاز علی یا مولانا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ مگر تنہائی میں اعزاز علی یا زیادہ سے زیادہ مولوی اعزاز علی فرمایا کرتے تھے۔ میرے لئے اب کوئی ایسا نہ رہا کہ شفقت آمیز لہجہ میں اعزاز علی یا مولوی اعزاز علی کہے ؎

ہائے استاذ ہمارا نہ رہا ہم غریبوں کا سہارا نہ رہا

جس زمانہ میں آپ ملتان جیل میں "طلب حریت" کے جرم میں محبوس تھے۔ میں نے عریضہ لکھا۔ مگر کچھ تاخیر کے ساتھ۔ تو جواب میں چند شعر تحریر فرمائے جن میں سے ایک شعر یہ بھی تھا ؎

نسیتم اخا اذ خانہ الدھر لم یکن بعارضۃ نسیان وکان مصافیا

حضرت کے اس حبس بے جا سے تکلیف ضرور تھی۔ مگر قلب خزینۂ احزان نہ تھا۔ اس لئے میں نے بھی فوراً اسی بحر و قافیہ پر ۳۵ اشعار کا ایک طویل قصیدہ لکھا۔ اور حضرت کی خدمت میں بھیج دیا۔ جس کا ایک اقتباس یہ ہے :-

لَطِرْتُ إِلَى مُلْتَانَ لَوْ كُنْتُ طَائِرًا	وَلٰكِنْ قَضَاءَ اللّٰهِ قَصَّ جَنَاحِيَا
بِعَيْنِي دُمُوعٌ كَالدِّمَاءِ تَتَابَعَتْ	وَأُسْتَاذُنَا الْعَلَّامُ يُنْشِدُ شَاكِيَا
نَسِيتُمْ أَخًا إِذْ خَانَهُ الدَّهْرُ لَمْ يَكُنْ	بِعَارِضَةِ نِسْيَانٍ وَكَانَ مُصَافِيَا
فَقُلْتُ مُجِيبًا يَا رَجَاءَ قُلُوبِنَا	رَجَاءُ جَمِيعِ الْخَلْقِ دُونَ رَجَائِيَا
أَأَنْسَى الَّذِي لَوْلَا مُحَيَّاهُ وِجْهَتِي	لَمَا كُنْتُ أَدْرِي مَا الْحَذَاقَةُ مَاهِيَا
أَأَنْسَى الَّذِي لَوْلَا اهْتَدَيْتُ بِهَدْيِهِ	لَمَا كَانَ لِي وَقْتٌ مِنَ الْعُمْرِ صَافِيَا
أَأَنْسَاكُمْ فِي الْأَسْرِ وَالْقَلْبُ فِي شَجًى	تَنَاهَى وَلٰكِنْ لَا أَخَالُ التَّنَاهِيَا
أَأَنْسَى الَّذِي انْقَادَتْ أَزِمَّةُ طَاعَتِي	لِمَرْضَاتِهِ إِذْ لَمْ يَزَلْ بِي وَاقِيَا
أَأَنْسَى الَّذِي أَسْقَتْ غُيُوثُ كَمَالِهِ	رِيَاضَ الْعُلُومِ الرَّائِقَاتِ الْخَوَالِيَا
أَأَنْسَى الَّذِي أَسْقَى الْأَنَامَ جَمِيعَهُمْ	كُؤُوسًا مِنَ التَّقْوَى فَبُورِكْتَ سَاقِيَا
أَأَنْسَى وَحِيدَ الْعَصْرِ عِلْمًا وَحِكْمَةً	وَفِي ذِكْرِهِ الْمَيْمُونِ كَانَ شِفَائِيَا
أَضَاءَ بَسِيطَ الْأَرْضِ كَالشَّمْسِ فِي الضُّحَى	وَلَا زَالَ حُرًّا آمِرًا ثُمَّ نَاهِيَا
وَمَا ضَرَّهُ سِجْنٌ وَغَيْظُ عَدُوِّهِ	لِأَنَّ لَهُ صِيتًا عَلَى الدَّهْرِ بَاقِيَا

آخری شعر یہ ہے

سَقَاكَ إِلٰهُ الْعَالَمِينَ بِفَضْلِهِ	شَرَابَ رِضَاءٍ مِنْهُ عَذْبًا وَصَافِيَا

آپ نے اس قصیدہ کو پڑھکر ہمت افزائی کے طور پر الفاظ تحسین فرمائے۔ اور اس کے ساتھ نفس مضمون کے متعلق جو خیال ظاہر فرمایا وہ میرے زاویۂ خیال سے سہیل و ثریا کے برابر بلند تھا۔

یہ اور اسی قسم کی چند تحریریں میرے پاس ہیں جو خدا ہی جانے کہ کہاں رکھی گئی ہیں۔ میں نے ان کو ڈھونڈھنا شروع کردیا ہے اگر کسی صاحب عزم صمیم نے حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح کی طباعت کا ارادہ کیا تو عرض کروں گا کہ ان تحریروں کا فوٹو شائع کردیا جائے۔

آپ کی وفات کے بعد اہل علم حضرات نے جودت طبع سے کام لیا۔ قطعات، قصائد کہے۔ تاریخیں نکالیں جو شائع ہوئیں اور اب تک شائع ہوتی ہیں۔ مگر میں اپنی اس کوتاہی کا معترف ہوں کہ ایک شعر بھی

نہ لکھ سکا اور یہ نہیں کہ میں نے توجہ نہیں کی۔ فکر کو کام میں نہیں لایا۔ یہ سب کچھ کیا، بمشکل چار شعر غیر مرتب لکھے آخر مجبور ہو کر ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اس کا قوی سبب تو غالبًا یہی ہو کہ ایک مدت سے ادبی کتب اور اعزاز علی میں یوں بعید ہو گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ "کس سے اصلاح لینے کو جائیں" حضرت مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کا زیادہ تعلق ان حضرات کو ہوگا جو نظر بظاہر اسباب دنیا میں کچھ زیادہ دنوں تک رہیں گے۔ ہم جیسوں کے لئے یہ خیال موجب تسلی ہے ؏

آج وہ کل ہماری باری ہے (انتہیٰ)

قطعۂ تاریخ

(از جناب سید ذاکر علی صاحب ذاکر ٹونکی)

مفتیٔ اعظم کی رحلت کی خبر — دل پہ گہرا نقش حسرت ہو گئی
کیوں نہ اُس ہستی پہ سو دل سے نثار — جس کی جاں تک صرفِ ملت ہو گئی
اب کہاں ہر درد کا وہ چارہ گر — بے سہارے آدمیت ہو گئی
سیکڑوں اوصاف کی حامل وہ ذات — آہ ہم سے آج رخصت ہو گئی
مغفرت کی ہر زباں پر ہے دُعا — جُزوِ کل مقبول خدمت ہو گئی

آہ ذاکر یاد تازہ یوں کریں،
مفتی الاعلاء کی رحلت ہو گئی،
۲ ۷ ۳ ۱ ھ

قطعۂ تاریخ وفات

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

(از جناب مرزا سلطان بیگ صاحب سلطان پہاڑی بھوجلا دہلی)

تاریخِ وفاتِ مفتی — پوچھی جو کسی نے مجھ سے
ہاتف نے کہا اے سلطاں — تیرہ سو بہتر گن دے
۱۳ ۷۲ ھ

جمعیۃ علماء ہند کا بانی اور اس کا معمارِ اوّل

(از رئیس الاحرار جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی)

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کے تمام مقتدر مسلمان رہنما نظر بند کر دیئے گئے تھے اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی اور آپ کے رفقاء کار حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی حضرت مولانا عزیر گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم، مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کو مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا۔ اور آپ کے جو ساتھی ہندوستان میں تھے وہ تقریباً سب کے سب ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کو بھی حکومت ہند نے گرفتار کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا تھا، حکومت کی اس متشددانہ پالیسی کے باوجود جن حضرات نے حوصلہ اور پامردی کے ساتھ ملک کی رہنمائی کی ان میں سب سے پہلے مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم اور آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی کے اسمائے گرامی ہندوستان کی تاریخ سیاست کے صفحۂ اول پر نظر آتے ہیں۔ برطانوی استعمار کے خلاف نظر بندوں کی رہائی کے مطالبہ کے عنوان سے تحریک کو منظم طریقہ سے چلانے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ ہندوستان میں جو لوگ تھے انھوں نے اس تحریک کو چلایا۔ اس وقت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے ذہن میں جمعیۃ علماء ہند کے بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے "علماء ہند" کے نام سے ایک جماعت کے بنائے جانے کے خیال کا اظہار کیا تھا لیکن وہ اپنی کثیر مصروفیتوں کی وجہ سے اس طرف دھیان نہ دے سکے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے "جمعیۃ علماء ہند" کی داغ بیل ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ڈالی۔ اس کے قیام اور انتظام و انصرام میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی صاحب مرحوم کے شریک کار تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کی دعوت پر ہندوستان کے تمام صوبوں سے چیدہ چیدہ علماء دہلی تشریف لائے تھے۔ میں خود اس بنیادی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا لیکن لدھیانہ سے میرے حقیقی پھوپی زاد بھائی مولانا محمد عبداللہ اور مولوی حفیظ اللہ صاحب[1] نے شرکت کی۔ لکھنؤ سے حضرت مولانا عبدالباری صاحب مرحوم

[1] وہ پچیس حضرات جن کے اجتماع میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام بمقام دہلی عمل میں آیا اُن میں مولانا محمد عبداللہ کا اسم گرامی تو ہے، مولانا حفیظ اللہ کا اسم گرامی نہیں ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن جامعی ابن حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی فرماتے ہیں کہ مولوی حفیظ اللہ اُس وقت پڑھتے تھے۔ ایک طالبعلم کی حیثیت سے خلافت کانفرنس دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ (واصف)

تشریف لائے ہوئے تھے۔ علماء کے اس نمائندہ اجلاس نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو "جمعیۃ علماء ہند" کا صدر منتخب کیا۔ اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے "خلافت کمیٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے بنانے میں بھی حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا حسرت موہانی مرحوم، مولانا عارف ہسوی سب حضرت مفتی صاحب کے شریک کار تھے۔ ان ہی دنوں گاندھی جی نے کانگریس کے کام کی ابتدا کر دی۔ اس کام میں گاندھی جی کے سب سے زیادہ مشیر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تھے۔ ان دنوں علی برادران اور مولانا آزاد جیلوں میں تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ کام کی اہمیت نے اور اخبارات نے مفتی صاحب کے نام کا تعارف ملک میں کرا دیا۔ اہل علم وہ مسلم تھے یا غیر مسلم، مفتی صاحب کے علم و دانش کے قائل ہو گئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے تمام سیاسی نظر بند رہا کر دیئے گئے تھے۔ لیکن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ اور یہ بدستور مالٹا میں نظر بند رہے۔ ہندوستان کے تمام رہا شدہ رہنما کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے امرتسر پہنچ گئے۔ اس وقت مسلم لیگ کانگریس کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے اجلاس کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی صدارت میں بہت شان و شوکت سے ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رہائی کے بعد امرتسر تشریف نہیں لائے۔ اس لئے کہ آپ کی رہائی ایسے وقت میں ہوئی جب کہ آپ امرتسر پہنچ کر اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ علی برادران نظر بندی سے رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے اور وہیں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کی دوسری نشست ہوئی۔ جمعیۃ کی اس میٹنگ میں میں بھی شریک تھا۔ ستر اسی کے قریب ہندوستان کے نفتدر سرکردہ علماء شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ امرتسر کے ایک بہت بڑے رئیس میاں محمد شریف مرحوم کی کوٹھی پر ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور تمام علماء چونکہ طبعاً پروپیگنڈسٹ نہیں تھے۔ تصوف اور درویشی کا طبیعتوں پر اثر غالب تھا۔ اس لئے یہ حضرات اس وقت عوام میں نمایاں نہ ہو سکے اور نہ ہی نمایاں ہونا چاہتے تھے۔ اس علاوہ عوامی لیڈرشپ امرتسر میں علی برادران کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس کانگریس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ مگر اس موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کا کھلا اجلاس امرتسر میں نہیں ہوا۔ لیکن جمعیۃ علماء کا آئین اور آئندہ طریق کار امرتسر میں ہی تیار ہوا۔ جمعیۃ کا آئین اور طریق کار

لہ "مختصر حالات انعقاد جمعیۃ علمائے ہند" میں جمعیۃ کے اجلاس اول کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اجلاس امرتسر میں اسلامیہ مسلم ہائی اسکول کے وسیع کمرے میں منعقد ہوا۔ ممکن ہے کہ اسکول ہی میاں محمد شریف کی کوٹھی میں واقع ہو۔ (واصف)

مرتب کرنا بہت مشکل مسئلہ تھا۔ مگر بقول مولانا عبد الباری مرحوم، اگر یہ کام مفتی کفایت اللہ صاحب کے سپرد کر دیا جائے تو یہ مسودہ چند گھنٹوں میں مفتی صاحب تیار کر دیں گے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے چند گھنٹوں میں واقعی جمعیۃ علماء کیلئے ایک آئین اور آئندہ طریق کار کا مسودہ تیار کر کے علماء کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ یہ اجلاس مختصر تھا مگر فہم اور رہنمائی کے اعتبار سے بہت ہی اہم تھا۔ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۱۹ برس مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر رہے۔ لیکن انیس برس میں آپ کبھی جمعیۃ کے اجلاس کے صدر نہیں بنے۔ بلکہ ہم عصر دوستوں کی صدارت میں کام کرنا ان کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔

آپ آل انڈیا خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے۔ ورکنگ کمیٹی میں آپ نے بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل کو منٹوں میں حل کر دیا۔ آپ نے کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء میں رہ کر جن جن مسائل میں رہنمائی فرمائی اس کا اندازہ صرف ان ہی حضرات کو ہو سکتا ہے جو آپ کے ہر وقت کے ساتھی تھے لیکن دنیا نے کبھی بھی مفتی صاحب کے نام کو ان کے کاموں کے ساتھ شہرت کی جگہ پر نہیں پایا۔ وہ مٹ کر کام کرنے کے عادی تھے۔

جمعیۃ علماء کا حقیقی وجود اور اس کی تعمیر مفتی صاحب کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اور مولانا احمد سعید صاحب نے پورے اخلاص اور دیانتداری سے مفتی صاحب مرحوم کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ مفتی صاحب اپنے ساتھیوں اور اچھے کام کرنیوالوں کو آگے بڑھا کر خوش ہوتے تھے۔ بہت سے غلط کار آدمیوں کو محبت اور پیار سے سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ اپنے وقت میں آفتاب سیاست تھے تو اس سچ میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور کون ہے جو اس کی شعاعوں کی روشنی میں ملک کی رہنمائی نہیں کرتا رہا۔ اور آج بھی سوائے چند ایک کے اس آفتاب سیاست کے غروب ہونے کے بعد صحیح راستہ کی تلاش میں دشواریاں محسوس نہیں کرتے۔

جہاں آپ کو فہم رسا کی وجہ سے سیاسیات میں غیر معمولی درجہ حاصل تھا، وہاں آپ کی شخصیت کو بحیثیت عالم دین ہونے کے نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ "علم دین" میں آپ کا درجہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ آپ کو حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ سے بخوبی ہو جائے گا کہ جب کبھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تو ان کے لئے۔ عالم الدین والدنیا مفتی کفایت اللہ" فرمایا کرتے۔

تحریک خلافت میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم اور گاندھی جی نے جیل جانے سے روک دیا تھا لیکن ۱۹۳۰ء کی نمک سول نافرمانی میں مفتی صاحب بحیثیت کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر جیل میں تشریف لے گئے۔ تقریباً چھ ماہ مجھے آپ کی خدمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں آپ کو پھر ڈیڑھ سال کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور آپ کو دہلی جیل سے نیو سنٹرل جیل ملتان میں بھیجدیا گیا۔ چنانچہ اس مرتبہ مجھے ایک سال آپ کی خدمت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ میری سزا

ایک سال تھی۔ اور مجھے لاہور جیل سے ملتان جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے جس قدر آپ کا قرب حاصل ہوتا گیا۔ اتنی ہی آپ کی عقیدت، عزت اور محبت میرے دل میں گھر کرتی گئی۔ آپ اپنے ساتھیوں کے علاوہ جیل میں اخلاقی قیدیوں سے بھی ہمیشہ محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ آپ جیل میں ان قیدیوں کی خدمت کرتے۔ اور ان کے کپڑوں کی مرمت کرتے۔ جو ان کو ان کی خدمت کے لئے ملے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ یہ بھی ہماری طرح قید ہیں۔ ہمیں ان سے کام لینے کا حق نہیں یہ حکومت کا جبر و قہر ہے کہ ان کو اس طرح ہماری خدمت کے لئے متعین کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہم بھی ان کی خدمت کریں۔ یہ ایک شرعی نکتہ تھا۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو کسی شخص کا کوئی کام کرنا بھی بوجھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے پاس جمعیتہ علما کی طرف سے ایک وفد بھیجا گیا۔ جس کے صدر حضرت مفتی صاحب مرحوم تھے۔ یہ وفد حج کے موقعہ پر گیا تھا۔ میں اس سفر میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔ اس پورے سفر میں مفتی صاحب کی استقامت تقویٰ اور دیانت داری کا جو منظر میں نے دیکھا وہ حیرت انگیز تھا۔ ہم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے لئے اونٹوں پر سفر اختیار کیا۔ ہر منزل پر ساتھی تکان کی وجہ سے آرام کرتے یا سو جاتے۔ لیکن مفتی صاحب سب کے لئے کھانا پکانے اور تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ اس تمام سفر میں کبھی آپ کی پیشانی پر کسی نے بھی بل آتے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی آپ کے مشاغل دینی اور معمولات میں کسی دن فرق آیا۔

علاوہ فقیہہ ہونے کے فہم قرآن میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب کبھی مشکل مقامات میں نے مفتی صاحب کے سامنے پیش کئے۔ اسے آپ نے فوراً حل فرما دیا۔ ملتان جیل میں آپ نے ترجمہ کی ابتداء کی۔ افسوس کہ یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

حضرت مفتی صاحب کے یہ مختصر حالات میں نے بیماری کی حالت میں لکھوائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں بلند مرتبہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(از مرقومات معراج دھولیوی)

پردۂ رحمت کشیدہ آں فقیہ بے بدل	چوں نہفتہ از نگاہِ طالبِ دیدار شد
در تلاشِ سالِ ہجری خاطرم معراج بود	گفت ہاتف۔ رہ نوردِ عالمِ اسرار شد

۱۳۷۲ھ

باقة الرثاء

(للاستاذ العلامة الحاج - الاديب اللوذعي - مولينا عبد الحق المدني)

هوى كوكب العلياء واهد بنيان
نعم وتداعت للمعارف اركان

برتری اور سربلندی کا تارا ٹوٹ گیا علم وفضل کی عمارت منہدم ہوگئی۔ بیشک ایسا ہی ہوا علوم و معارف کے ستونوں میں شگاف پڑ گئے۔

بكل فواد لوعة لا يطيقها
وهل يحمل الرزء المبرح انسان

ہر ایک قلب میں غیر قابلِ برداشت سوزش ہے اور کیا کوئی انسان شدید ترین مصیبت کو برداشت کرسکتا ہے

اجل خطوب الدهر رحلة عالم
له في عويصات المسائل امعان

رحلتِ عالم زمانہ کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ عالم بھی ایسا کہ مشکل اور الجھے ہوئے مسائل میں نظرِ عمیق اور گہرے غور وفکر کا مالک ہو۔

ترى منه في كل العلوم مجليا
وفي عصره في الفقه لاشك نعمان

ایسا عالم جو ہر ایک علم وفن میں پیش رو ہو (بالخصوص) فقہ میں اپنے زمانہ کا نعمان ہو (یعنی ابوحنیفہ وقت ہو)

عليم باسرار الخطاب كأنه
اذا قال اما بعد في القوم سحبان

اسرار خطابت کا بہترین واقف ہو گویا جب خطبہ پڑھکر تقریر شروع کرے تو معلوم ہو کہ اپنی قوم کا سحبان ہے۔

كأن الثريا قلدته نجومها
ففي كل حرف للنباهة برهان

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہکشاں نے اپنے تاروں کا ہار بناکر اس کو پہنایا ہے۔ بس ہر ایک حرف میں شرافت وعظمت کی بُرہان اور دلیل موجود ہوتی تھی۔

حكيم بتلخيص المعاني كأنما
يلقنه وحيا من الصحف لقمان

مقاصد اور مطالب کا خلاصہ پیش کرنے میں ایسا دانشمند وماہر کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت لقمان اپنے دانشمندانہ رسالوں کا ان کے دل میں القاء کر رہے ہیں۔

كأن بكفيه مجلة آصف
وفي صدره بحر من العلم طفحان

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے ہاتھ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اعظم آصف بن برخیا کی کتاب ہے۔ اور اُن کے سینے میں علم کا چھلکتا ہوا دریا موجیں مار رہا ہے۔

قضى العمر في درك العلوم ونشرها
وتدوينها والمرء بالعلم يزدان

علوم کے حاصل کرنے اور ان کو پھیلانے شائع کرنے مرتب و مدون کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کردی۔ انسان علم کے ذریعہ ہی تقرب ومقبولیت کے اعلیٰ وبلندترین مرتبہ پر فائز ہوتا۔ اور اپنے دور کا واجب الاحترام شخص بن جاتا ہے۔

اناۃ واقدام وحلم و سطوۃ
ورای رشید فی الامور وامعان

آپ سراسر سنجیدگی واقدام (پیش قدمی) مجسمہ علم و وقار۔ پیکر تدبر وتفکر۔ اور اصابت رائے کی بہترین مثال تھے۔

بیسرہ سفر للسیاسۃ کافل
وفی کفہ الیمنی حدیث وقرآن

آپ کے بائیں ہاتھ میں دستور وسیاست کی مکمل کتاب تھی اور دائیں ہاتھ میں حدیث وقرآن۔

ارانا سبیل الرشد صبحا انارہ
بآی لھا فی محکم الذکر تبیان

ہمیں رشد وہدایت کے راستے بتائے جو صبح صادق کی طرح روشن تھے۔ مزید براں اُن پر قرآن حکیم کی واضح آیتوں کی روشنی ڈالی۔

وحث علی حسن التوافق قائلا
حذار من التفریق فالقوم اخوان

ہمیں ہندو مسلم اشتراک عمل اور باہمی موافقت پر آمادہ کیا۔ اور فہمائش کی کہ ہندو مسلمان وطنی برادر ہیں تفریق وتقسیم ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔

فوافقہ قوم و خالف بعضھم
فللحق اعداء وللحق اعوان

بس ایک جماعت نے آپ کی بات تسلیم کی دوسرے گروہ نے مخالفت کی۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ حق و صداقت کے دشمن بھی ہوتے ہیں اور معاون ومددگار بھی۔

لقد خدم الاسلام والقوم باذلا
لھم نصحۃ حقا وما ثم ادھان

بلا شبہ قوم وملت کی پوری خیرخواہی اور سچائی کے ساتھ بلا کسی مداہنت کے صحیح اور سچی خدمت انجام دی۔

وفی الناس من لا یرعوی عن ضلالۃ
وان لاح مثل الصبح یسطع برھان

مگر دنیا میں وہ آدمی بھی کثرت سے ہوتے ہیں جو گمراہی سے کبھی نہیں خائف ہوتے ہیں۔ اگرچہ صداقت صبح صادق کی طرح روشن ہوکر سامنے آجائے۔

فذالک الذی استھوتہ نفس غویۃ
یھیم بوادی غیھا وھو حیران

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اغراض کے تابع ہوتے ہیں اور گمراہی نفس کی تاریک وادی میں سرگرداں بھٹکتے رہتے ہیں۔

یشاھد ما قد حل ھتک محارم
وسفک دماء وانتھاب وخسران

بے عزتی عصمت دری۔ خونریزی۔ لوٹ مار اور تباہی وبربادی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کررہے ہیں۔

ولم یعترف للحق یوما تعنتا
وغمطہ ریح الحق لاشک طغیان

لیکن ضد، اور بے جا ضد کا خمار کچھ اس طرح دماغوں پر چھایا ہوا ہے کہ اعتراف حق کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صاف اور صریح صداقت کے مقابلہ میں اکڑنا۔ بہت بڑی سرکشی ہے۔

فلا کنت یا مذیاع مذ جئت ناعیًا
فهل نعبت فی جوفك الیوم غربان

اے آلہ نشر الصوت (ریڈیو) تو خود کیوں نہیں فنا ہوگیا۔ جب تو نے یہ الم انگیز خبر نشر کی تھی۔ کیا آج تیرے اندر کوئی غراب البین صدائے فراق لگا رہا ہے۔

نعیت لنا الطود العظیم فزلزلت
دعائم بیت المجد و اغال ایوان

کوہ وقار کے وفات پا جانے کی تو نے خبر دی۔ جس سے شرف و مجد کی عمارت کے ستون ہل گئے۔ اور قصر علم و فضل دہل گیا۔

اصم تناجی الخلق شرقًا و مغربًا
و لیس لرجع الصوت عندك آذان

اے بہرے ریڈیو تو اپنی باتیں مشرق و مغرب کے کانوں میں پھونکتا رہتا ہے۔ مگر صدائے بازگشت سننے کے لئے خود تیرے پاس کان نہیں ہیں۔

فلو کنت ذا سمع لذبت تحسرًا
و اصبح فی موجات نشرك بحران

اگر تیرے کان ہوتے تو اس الم دہ اندوہ میں تو خود پگھل گیا ہوتا، اور نشر آواز کی فضائی لہروں میں بحران پیدا ہوگیا ہوتا۔

و لولا التقی و الدین و الله عاصم
و فی القلب ایمان و للحق اذعان

اگر خوف خدا احکام شریعت کی پابندی قلب میں ایمان۔ اور حق و صداقت کا اذعان نہ ہوتا۔

لزلت بنا الاقدام و استلب النهی
و شقت جیوب الصبر و الشجو افنان

تو ہمارے قدم پھسل جاتے عقلیں سلب ہوجاتیں گریبان صبر چاک ہوجاتے اور یہ رنج و الم طرح طرح ہمیں بدحواس کرتا۔

و لکن جمیل الصبر احری بذی الحجی
و اجدر بالتقوی و ان عز سلوان

لیکن صاحب عقل و ہوش کے لئے صبر ہی موزوں ہے۔ تقاضائے تقویٰ بھی یہی ہے خواہ صبر و سکون کتنا ہی دشوار رہو۔

حفیظ افق و استوف بالصبر اجره
فلیس لاجر الصبر فی الحشر میزان

اے حفیظ (صاحبزادہ کو خطاب) تم بھی ہوش و حواس درست رکھو۔ صبر کرکے اللہ تعالیٰ سے صبر کا ثواب پورا پورا حاصل کرو۔ صبر کا ثواب اتنا بڑا ہے کہ میدان حشر میں میزان عمل بھی اس کو نہیں اٹھا سکتی۔

فانت ابنه البر الوفی بحقه
لحظك فی نیل السعادة رجحان

تم اُن کے خلف رشید ہو۔ حق شناس اور حق ادا کرنے والے۔ سعادت کی کامیابی میں تمہاری خوش نصیبی کا پلہ جھکا ہوا ہے۔

یقولون مات الشیخ و الشیخ لم یزل
بآثاره حیا و ان غاب جثمان

لوگ کہتے ہیں مفتی صاحب کی وفات ہوگئی حالانکہ مفتی صاحب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ صرف جسم غائب ہوگیا ہے۔

لقد عشت محمود الخصال فلم تدع
مجالا لمرتاب ولو شاء اضغان

آپ نے ہمیشہ قابل ستائش زندگی گذاری۔ اس طرح کہ کبھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوئی اور بدترین مخالف بھی نکتہ چینی نہیں کر سکے۔

وسرت الی دار البقاء مزودًا
بقلبك ایمان وفعلك احسان

آج دار بقاء کی جانب اس طرح روانہ ہو رہے ہو کہ تمہارے قلب میں ایمان اور کردار وعمل میں حسن وخوبی کا پورا توشہ ساتھ ہے۔

وارجو من الرحمن اضعاف رحمة
سلام واکرام وعفو وغفران

اللہ تعالیٰ رحیم وکریم سے بیش از بیش رحمتوں کی امید ہے۔ سلام واکرام۔ عفو اور غفران کی توقع ہے۔

وعلمك روض فی ضریحك ناضر
ونور علی متن الصراط له شان

آپ کا علم قبر میں تروتازہ باغیچہ اور پل صراط پر شاندار نور ہوگا۔

وسعیك فی علم الحدیث ونشره
یفوح بدار الخلد روح وریحان

علم حدیث کے درس دینے اور نشرواشاعت میں جو جدوجہد کی۔ وہ دار الخلد میں روح وریحان بن کر مہکے گی۔

وارجو لك الزلفی بما قد ارخته
وحسبك بالحسنی یجیبك رضوان

آپ کے مادۂ تاریخ سے بھی مجھے قرب خداوندی کی توقع ہو رہی ہے کیونکہ آپ کے مادہ تاریخ کا مفہوم یہ ہے کہ جنت کی عیش راحت کے لئے یہ کافی ہے کہ رضوان جنت آپ کی تعظیم بجا لا رہا ہے۔

موتُ العالِم موتُ العالَم

(از جناب حافظ صاحب غازی آبادی مقیم کراچی)

چھین لئے ہیں دستِ قضا نے — محسنِ ملت مفتیٔ اعظم
سارا چمن مصروف فغاں ہے — سنبل و ریحاں لالہ و شبنم
جاتی رہی بے لوث قیادت — چھن گیا ہم سے رہبرِ اعظم
لُٹ گئی ہے اخلاص کی دنیا — افسردہ ہے زُہد کا عالم
کون سے دل میں درد نہیں ہے — کون سی آنکھ نہیں ہے پُر نم
حافظ شمس نے ٹھیک کہا ہے — موتُ العالِم موتُ العالَم

ارشادات

(حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند)

افسوس کہ جن مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کو آج سے چند دن پہلے ہم سلمہ اللہ اور دام ظلہٗ کہا کرتے تھے آج رحمۃ اللہ اور مرحوم و مغفور کی صفت سے یاد کر رہے ہیں۔ افسوس مرحوم و مغفور ہونے پر نہیں کہ یہ تو زندگی کا انتہائی مطلوب اور منتہا ہے۔ افسوس اُن کے وصال پر نہیں کہ وصال بحق تو حصول مقصود ہے۔ افسوس فراق پر ہے کہ ایک روشنی ہم میں تھی اور نہ رہی۔ علم و عمل کی کتنی ہی خصوصیات ہم میں جلوہ پیرا تھیں اور چھن گئیں۔ وہ انشاء اللہ واصل اور مرحوم و مغفور ہیں اور بنائے ہی گئے تھے رحمت و مغفرت کرنے کے لئے بقول امام محمد رحمۃ اللہ۔ جب ان کے وصال کے بعد بعض عارفین نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اے محمد! حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو فرمایا کہ حق تعالےٰ نے مجھے بخش دیا اور فرمایا کہ اے محمد! اگر مجھے تیری مغفرت منظور نہ ہوتی تو میں اپنا علم ہی تیرے سینہ میں کیوں ڈالتا؟ پس حضرت مفتی صاحب انشاء اللہ مغفور اور واصل ہیں، اگر مغفرت و وصل منظور نہ ہوتا تو یہ علم کتاب و سنت ان کے سینہ میں ڈالا ہی کیوں جاتا؟ اس لئے ان کے وصال و مغفرت پر ان کا رونا نہیں رونا اپنا اور اپنی محرومی کا ہے کہ ایسا جاذبِ مغفرت خزانہ ہم سے جاتا رہا۔

حضرت مفتی صاحب اپنے علم و عمل کے لحاظ سے یقیناً مردہ نہیں بلکہ زندہ اور زندہ جاوید ہیں۔ مگر فراق بہرحال فراق ہے بلکہ زندہ کا فراق مردہ کے فراق سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مردہ چلا جائے تو صبر آکر اس کی یاد فراموش ہو جاتی ہے۔ لیکن زندۂ جاوید کے انمٹ کارنامے ہمہ وقت سامنے رہتے ہیں جو اسے بھولنے نہیں دیتے اس لئے غم فراق بھی ہمہ وقت تازہ رہتا ہے اس لئے مردہ کا غم نوشگامی ہوتا ہے اور زندہ کے فراق کا دوامی، جس کی تسکین کچھ اس کے تذکرہ و ذکر ہی سے ہوتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وقت کے اُن چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم و فاضل، فقیہہ و محدث، ادیب و شاعر، ناظم و ناثر، وقور و غیور، تقی و نقی، خلیق و مجاہد اور صاحب سعی و عمل ذکاوت و فطانت میں بے مثل۔ ان کی ذکاوت کے نمونے خود بھی دیکھے اور بزرگوں سے بھی سُنے۔ غالباً ۱۳۵۶ھ میں ایک بار میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ کاش اس وقت سارے مسلمان کسی ایک مرکز پر جمع ہوتے اور یہ نہیں تو کم از کم اپنی جماعت کے تو ایک مرکز پر جمع رہتے جس کی سہل صورت یہ ہے کہ آپ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب کسی ایک مشترک نقطہ پر اجتماع فرمالیں تو بڑی آرزو سے فرمایا کہ ہاں میرا جی بھی

چاہتا ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو اور تم اس بارہ میں سعی کرو میں اپنی جماعت میں اس وقت مولانا کفایت اللہ صاحب کے حسن تدبر اور ذکاوت کا معتقد ہوں پہلے ان سے ملو اور پھر انہیں لے کر مولانا حسین احمد صاحب سے ملاقات کرو۔ دہلی جانے کے لئے مجھے اور مولانا شبیر علی صاحب اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب، مفتی خانقاہ تھانہ بھون کو منتخب فرمایا۔ جیب سے پچاس روپیہ نکال کر بڑی امنگ اور آرزو کے ساتھ دیئے اور بہت ہی نرمی کے ساتھ فرمایا کہ خوب مٹھائی کھاتے ہوئے دہلی جاؤ اور اس مقصد میں جد و جہد کرو۔ واقعہ طویل ہے۔ اس کی حکایت مقصود نہیں۔ ظاہر یہ کرنا ہے کہ اکابر جماعت بھی جو حضرت مفتی صاحب سے طبقہ میں اوپر تھے ان کے علم و ذکاء کے گرویدہ اور معتقد تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا تو غایت انکسارِ نفس اور حدود شناسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض و نفرت ہے۔ ان کے بارہ میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں ہے کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے۔ در انحالیکہ قرآنِ حکیم کا فیصلہ ہے کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی اور یہ فرما کر اپنے مخصوص تلامیذ میں سے فتویٰ لکھنے کے لئے جن تین حضرات کا نام لیا ان میں اولین نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ گویا حضرت کو اپنے نفس پر اس بارہ میں اتنا اعتماد نہ تھا جتنا ان پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی یہ عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور احتیاط و تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور اسلئے فتویٰ صادر فرمانا درحقیقت ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔

مگر اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے اکابر جن پر خود اعتماد فرمائیں اور اپنے مقابلہ میں اعتماد کا اظہار کریں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے؟ کسی کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ خواص اہل اللہ کے قلوب میں اس کی وقعت اور منزلت قائم ہو۔

اس سے واضح ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے چھوٹوں یا ہم عصروں ہی میں معتمد علیہ نہ تھی بلکہ اپنے اساتذہ و شیوخ اور اپنے سے اوپر کے طبقات میں بھی قابلِ اعتماد اور لائق بھروسہ تھی۔ اور بڑے چھوٹے سب ہی ان کے علم و فضل۔ اعتدال، رعایت حدود اور موقعہ شناسی کے قائل تھے۔ جن کے چھوٹے ایسے تھے اُن کے بڑے کیسے ہوں گے اور جن کے بڑے ایسے تھے اُن کے چھوٹوں کا کیا کہنا؟

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کی علمی ذکاوت اور تفقہ فی الدین کی خداداد قوت مشکل سے مشکل مسائل کی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھا دیتی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے اجلاس جمعیۃ العلماء لاہور کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی مسئلہ کے ضمن میں حضرت مفتی صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (اہل حدیث) کے درمیان مسلک

کے بارہ میں ایک بحث اٹھ پڑی تو علماء جانتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے برجستگی کے ساتھ کیا کیا باریکیاں اور نکات اس میں پیدا کئے اور کس کس طرح مرتجلاً حقائق فقہیہ بیان فرمائے کہ علماء بھی حیران تھے اور خود مولانا ثناء اللہ صاحب بھی مداح تھے کیوں کہ وہ خود بھی ذہین وفطین تھے۔

فوجوں کی طرف سے وھیل مچھلی کے بارہ میں استفسار کیا گیا جس کا نام وہ نہیں جانتے تھے صرف یہ کہ ایک مہیب قسم کا دریائی جانور جس کی صفات فلاں فلاں ہیں جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحب نے اس کے بارہ میں لغوی فقہی اور تاریخی تحقیقات پر مشتمل جو فتویٰ لکھا اور اس وھیل کو وہ مچھلی ثابت کیا جو قرن اول میں صحابہ کے لئے خدا نے دریا سے نکال کر کنارۂ سمندر پر پھینک دی تھی اور عنبر کے نام سے یاد کی گئی تو علماء جانتے ہیں کہ یہ تدقیق الٰہی کا حصہ تھا۔

۱۳۵۸ھ میں احقر کے سفر افغانستان کے موقعہ پر جب کہ میں کابل میں تھا صدر اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب کے یہاں مدعو تھا۔ حاضرین مجلس میں سے بعض ذمہ داران حکومت نے علماء ہند کو سیاسی اور قومی حیثیت سے کچھ معطل اور جامد ثابت کرنے کی طرف اشارے کئے۔ تو میں نے وقت کے مجاہد اور مفکر علماء کی فہرست اور ان کے کارنامے شمار کرتے ہوئے جب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی فکر و تدبر اور قومی جدوجہد کا ذکر شروع کیا تو سب کے سر جھک گئے اور بالآخر انہیں علماء کی سیاسی، قومی اور ملکی مساعی کو ماننا پڑا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہو کر نکلے جو احقر کی پیدائش کا سال ہے۔ فراغ تحصیل کے بعد ایک عرصہ تک شاہجہاں پور اپنے وطن میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ آپ کے اس دور کے تلامذہ میں جہاں علماء فضلاء ہیں وہیں گریجویٹ بھی ہیں۔ جن میں سے جناب حافظ ذاکر علی صاحب آپ کے ممتاز شاگرد ہیں جو شاہجہاں پور کے با اثر اور مشہور وکلاء میں سے ہیں۔ میں نے ان کی ہی زبانی سنا کہ اسی زمانہ میں شاہجہاں پور میں کوئی عیسائی پادری آگیا۔ اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا۔ وہ اپنی لائن کا فاضل تھا ہر ایک کو اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت ایک غیر معروف مدرس تھے۔ بحثوں اور مناظروں سے الگ تھلگ ہمہ وقت درس و مطالعہ میں وقت گذارتے تھے۔ کسی کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ وہ پادری کے مقابل آجائیں گے لیکن پادری کی تحدی سن کر حضرت مفتی صاحب میدان میں آگئے اور اس طرح اس سے نبرد آزما ہوئے کہ بحث و مناظرہ میں اسے عاجز کر دیا حتیٰ کہ خود انجیل کے حوالوں سے اس پر حجتیں قائم کر دیں۔ یہ انتہائی ذکاوت کی بات تھی کہ وقت کے وقت۔ انجیل کا مطالعہ اس گہری نظر سے کیا کہ ایک آدھ شب ہی میں اس سے استخراج مسائل اور اتمام حجت پر قدرت حاصل کر لی۔ جس سے پادری کا منھ بند ہو گیا اور وہ شکست کھا کر فراری ہوا۔ اس مناظرہ سے حضرت مفتی صاحب کی ذکاوت کا چرچا

ہوا۔ شاہجہاں پور کے بعد حضرت ممدوح مدرسہ امینیہ دہلی میں بحیثیت صدر مدرس تشریف لائے۔ اور تقریباً ۵۲ برس استقامت کے ساتھ دہلی میں مسندِ درس و افتاء پر بیٹھ کر خواص و عوام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے درس، اور بالخصوص درس حدیث کی یہ خصوصیت تھی کہ نہ لمبی تقریریں فرماتے نہ بیان میں طول ہوتا۔ بلکہ اپنے اُستاد (شیخ الہند رحمۃ اللہ) کے نقش قدم پر مختصر تقریر اور توجیہات حدیث کے سلسلہ میں نہایت مختصر جامع اور آخری توجیہہ بیان فرما دیتے جس سے حدیث کا مغز طالب علم کے مغز میں اُتر جاتا تھا اور مستفید کی استعداد مضبوط ترین استعداد بن جاتی تھی۔ اسی ذیل میں تصانیف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اور متعدد مفید رسالے تالیف فرمائے جن میں سے تعلیم الاسلام آپ کی بہترین تالیف ہے جو عموماً دینی اور قومی مدارس میں ابتدائی نصاب کا جزو اور مقبولِ عام ہے۔ آپ کے ادیبانہ قصائد و اشعار سے دینی رسالے مزین ہوئے۔ القاسم دور اول میں بھی آپ کے بعض عربی قصائد طبع ہوئے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے:۔

عرفت اللہ ربی من قریب　　فکم بین الالٰہ والعبید

اردو میں بھی کبھی کبھی اشعار موزوں فرماتے جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی ملتان جیل سے رہائی کے وقت (جب کہ وہ اور مفتی صاحب دونوں اسیر حکومت کی حیثیت سے ملتان جیل میں تھے اور موصوف کے لئے حضرت مفتی صاحب سے پہلے رہائی کا حکم آگیا) اردو کا قصیدہ لکھ کر انہیں ایک جلسہ میں سُنوایا۔ جو جیل ہی میں منعقد کیا گیا۔ مولانا حبیب الرحمان صاحب ممدوح کے نام کا نہایت ہی موزوں سجع بھی حضرت مفتی صاحب نے خود ہی موزوں فرمایا۔ جو یہ ہے۔ ع

خدمتِ خلق بود خلق حبیب الرحمان

جس سے ان کی ادبیت اور طبیعت کی موزونیت واضح ہے۔ ان ہمہ وقت کی علمی اور درسی مصروفیات نے آپ کو قومی درد اور قومی خدمات سے بھی غافل نہیں رکھا۔ تحریک خلافت کے وقت آپ نے نہ صرف ملک وقوم کی سیاسی خدمات انجام دیں۔ بلکہ جماعت علماء میں سیاسی تحریکات اور قومی خدمات کے سلسلہ میں آپ کی حیثیت ایک بانی کی حیثیت ہے۔ ۱۹۱۹ء میں آپ نے جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ڈالی۔ اور امرتسر میں اس کا پہلا اجلاس منعقد کیا جس میں آپ جمعیۃ العلماء کے منتخب صدر[1] قرار پائے۔ اور ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک بلا فصل آپ ہی جمعیۃ علماء کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ جو سیاسی خدمات کی لائن میں علماء ہند کے یہاں آپ کے مقبولِ عام اور معتمد علیہ خاص ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی طبیعت کے اعتدال

---

[1] حضرت مفتی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی وفات تک جمعیۃ علمائے ہند کے عارضی صدر رہے۔ واصف

اور جامعیت نے جمعیۃ علماء ہند کا دائرہ اثر وسیع سے وسیع تر کردیا جس کو نہ صرف ہندوستان کے ہر طبقے کے علماء نے اپنا سیاسی مرکز تسلیم کرلیا۔ بلکہ بیرونِ ہند تک جمعیۃ علماء کی مرکزیت اور سیاسی نہضت تسلیم کرلی گئی۔

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابنِ سعود نے موتمر عالمِ اسلامی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں طلب کیا تو آپ کو بحیثیت صدر جمعیۃ العلماء خصوصی طور پر دعوت دی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں مصر میں جب عالمِ اسلام کا ایک مشترکہ اجلاس بلایا گیا۔ تو آپ کو اس کی صدارت کے لئے چُنا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مذہبی اور ملکی دونوں حیثیت سے علماء ہند، بیرونِ ہند اور سیاسی زعماء بلکہ قائدین سیاست آپ کو اپنا مسلمہ رہنما اور معتمد علیہ زعیم سمجھتے ہیں۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ آپ مرکز علوم دینیہ دار العلوم دیوبند کی انتظامی کونسل (مجلس شوریٰ) کے رکن رکین تھے اور اکثر و بیشتر آپ کی موجودگی میں مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی کے لئے مخصوص رہتی تھی۔ گویا آپ علمی۔ دینی۔ سیاسی اور انتظامی مجالس کے ایک بنے بنائے صدر تھے کہ صدارت آپ سے اور آپ صدارت سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ اس کا منشا حضرت ممدوح کی عظمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ مجلسی تجاویز کے بنانے میں آپ کی قابلیت ممتاز اور مسلمہ تھی۔ ما قل و دل الفاظ کے ساتھ ایسی جامع تجویز لکھتے تھے کہ واقعات کا خلاصہ، مباحث کا نچوڑ اور منشاء مجوزین کا فحویٰ پورا آجاتا۔ اس میں سما یا ہوتا تھا۔ بہت سی ایسی معاملاتی پیچیدگیاں جو بظاہر لا ینحل نظر آتی تھیں ان کے اعتدالِ مزاج اور علمی استحضار کی بدولت با آسانی حل ہو جاتی تھیں۔ رائے فیصلہ کن دیتے تھے۔ اور پھر اسے ایسی خوبصورتی سے قلمبند فرماتے تھے کہ گویا اس میں کوئی نزاع و جدال تھا ہی نہیں۔ اور سب ہی اس پر متفق ہو جاتے تھے۔

اخلاقی حیثیت سے نہایت وقور، غیور اور با وضع تھے۔ اپنے چھوٹوں سے خلق و ادب سے پیش آتے تھے۔ عام حالات میں ساکت و صامت اور خاموش رہتے تھے اور جب بولتے تو سنجیدگی میں ڈوبا ہوا کلام کرتے اور بقدرِ ضرورت بولتے تھے۔ اس علم و فضل پر سادگی اور بے تکلفی یہ تھی کہ اپنے لئے کوئی ممتاز وضع نہیں بنائی عام سادہ لباس بے تکلف معاشرت اور وہی طالب علمانہ زندگی مرتے دم تک قائم رکھی۔ سفرِ دہلی کے موقع پر جب کبھی احقر ان کے دولت خانہ پر ملنے کے لئے چلا گیا تو اس طرح بیٹھ آتے تھے کہ گویا وہ خورد ہیں اور آنے والا بزرگ ہے۔ اس شخصیت اور علم و وقار پر سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر کا سودا اور سامان خود ہی بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ اس دورِ آخر میں دار العلوم دیوبند کے مشہور مفتی اعظم اور میرے استاد حضرت الحاج الشیخ مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی قدس سرہٗ کی سادگی اپنے وقت میں ضرب المثل تھی۔ شیخِ وقت اور مفتیٔ ہند ہونے کے باوجود حضرت ممدوح کا روزانہ کا معمول تھا کہ بعد نماز عصر اپنے گھر کا سودا اور ضروریاتِ خانہ خود

بازار تشریف لے جاکر خرید تے حتیٰ کہ محلہ کی غریب عورتوں اور بیواؤں سے پوچھتے پھر جاتے کہ کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہو تو کہہ دیں۔ غریب پردہ نشین عورتیں روزمرہ کے خورونوش نمک مرچ سبزی ترکاری وغیرہ کے لئے پیسے حوالہ کر دیتیں اور حضرت مفتی اعظم اپنے گھر کی ضروریات کے ساتھ محلہ کے ان گھرانوں کا سامان بھی خود ہی خریدتے۔ خود ہی اٹھا کر لاتے اور گھر گھر گھوم کر خود ہی پہونچا آتے۔ اس بے مثال بے نفسی کا عملی نمونہ اس دور میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ کا بھی علاوہ اور سادگیوں اور بے تکلفیوں کے یہ روزانہ کا معمول تھا کہ اپنے گھر کا روزانہ کا سامان خورونوش سبزی ترکاری وغیرہ اور ساتھ ہی جس نے آپ سے کچھ منگوانا چاہا وہ بھی خود ہی بازار جاکر خریدتے۔ زنبیل ہاتھ میں رہتی۔ سامان سے بھر کر ہاتھ میں لٹکا کر بازار سے لاتے اور کبھی بھی انہیں اپنی شخصیت اور اپنی مسلمہ قابلیت و عظمت کا دھیان نہ آتا تھا کہ وہ مفتی اعظم ہند۔ صدر مدرسہ امینیہ دہلی۔ صدر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور عالم اسلامی کی متعارف شخصیت ہیں۔

اس عظمت پر یہ بے نفسی اور فروتنی اسی ذات سے متوقع ہو سکتی ہے جس میں علم کے ساتھ پاکیزگیٔ نفس کا اخلاقی جوہر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ ورنہ فی زمانہ اگر کسی شخص کو چار آدمی پوچھنے لگیں یا اتفاق سے کسی اخبار یا اشتہار میں اس کا نام آجائے تو اسے سڑک پر پیدل چلنا بھاری ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ہاتھ میں بوجھل زنبیل لٹکا کر اپنے ہی معتقدوں اور عام لوگوں کے درمیان سے بے تکلف گزرجانا اور گزرتے رہنا۔ یہ کسر نفسی انہیں قدسی صفت انسانوں کو دی جاتی ہے۔ جنہیں حق تعالیٰ اپنے دین کی مخصوص مہمات کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں۔ اس کے مخصوصین قباء شاہی اور رسمی کروفر میں نہیں بلکہ گدڑیوں، کملوں اور عام وضع کے سادہ کرتوں ہی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ اس جہان میں مساکین ہوتے ہیں۔ مگر اس جہان میں سلاطین ہیں اور اگر قلوب کی دنیا میں تلاش کیا جائے تو اس جہانِ فانی میں بھی وہ سلطان ہی ہوتے ہیں حتیٰ کہ سلاطین خود بھی ان کے آگے جھکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سلاطین اپنے تیغ و تفنگ سے قبضہ پاتے ہیں، اور وہ بھی صرف اجسام پر اور یہ اپنی خاموش زندگی اور اخلاق کی زبان سے قبضہ پاتے ہیں اور اجسام پر نہیں بلکہ دلوں اور جانوں پر۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم — شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

اسی انتخاب خداوندی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مخلوق بھی ہر اچھے منصب، ہر اچھی خدمت اور ہر اچھی ذمہ داری کے لئے انہیں ہی منتخب کرتی ہے۔ یہ چند سطریں حضرت مفتی صاحب کی سوانح نہیں، ان کے مناقب کی داستان نہیں، اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے۔ یہ توصرف "اذکروا محاسن موتاکم" کے تحت ان کے تذکرہ سے اپنے دلوں کی تسلی اور تسکین ہے اور بس۔ تذکرہ ان کا ہمیشہ رہے گا، ہر زبان اور قلم پر رہے گا جب اللہ کا ذکر ہوگا تو ان اللہ والوں کا بھی ذکر ہوگا، اور اللہ کا ذکر دائمی ہے تو یہ بھی اپنے ذکر کے لحاظ سے دائمی ہیں۔ یہ چند سطری

تذکرہ اسی دوامی ذکر کی ایک شاخ ہے جس کا مقصد محض یاد ہے استقصاء ذکر نہیں۔ اور نہ وہ ان سطروں میں ہو ہی سکتا ہے۔ ایک جامع شخصیت کا ذکر ایک شخص کیا کر سکتا ہے۔ پوری جامعہ بشری کرتی ہے۔ چنانچہ آج حضرت مفتی صاحب کی وفات کو کوئی ایک حلقہ ہی نہیں رو رہا ہے، علمی حلقے الگ ماتم کناں ہیں۔ انتظامی دائرے الگ پژمردہ ہیں۔ خواص الگ اشکبار ہیں۔ اور عوام الگ سوگوار ہیں۔ جامع کو جامع ہی روتے ہیں۔ کیونکہ حضرت مفتی صاحب فرد نہیں تھے بلکہ امت تھے۔ اس لئے یہ رونا پوری ہی اُمت کا ہے کسی فرد کا نہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو اعلیٰ غرفِ فردوس میں جگہ عطا فرمائے، مقام صدق میں اپنی نزدیکی بخشے اور رحمتوں کی بارش ان پر ہمیشہ ہمیشہ برستی رہے۔ آمین

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۶ ربیع الثانی ۷۶ھ

مفتی اعظم

(از جناب غیور احمد صاحب فاخر نوری، غازی آبادی)

(۱)

اِک اور سہارا چھوٹ گیا
دریا کا کنارا ٹوٹ گیا
اِک مردِ مجاہد رُوٹھ گیا
پڑھ کے ستارا ٹوٹ گیا

(۲)

اپنے روئے غیر بھی روئے
ڈھارس سب کی ٹوٹ رہی ہے
دُنیا سُونی سونی رہ گئی،
سر کو اپنے پیٹ رہی ہے

(۳)

بہتی ندیاں چلتی ہوائیں
بہتے بہتے رُک سی گئی ہیں،
موت بھی جیسے رو رہی ہو
پلکیں اُس کی بھیگ گئی ہیں

(۴)

مرحُوم کا وہ پیغامِ عمل اب
ہم سب ہی کو اپنانا ہے
کردار سے ہم کو اپنے اب
مفتیٔ اعظم ہی بن جانا ہے

امام العلما حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

(از حضرت مولانا احمد علی صاحب - امیر انجمن خدام الدین - دروازہ شیرانوالہ - لاہور)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تمام اُن صفات حمیدہ سے متصف فرمایا تھا۔ جو ایک عالم ربانی میں ہونی چاہئیں۔ آپ کی علمی قابلیت ہندوستان بھر میں مسلمہ تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مفتی اعظم سمجھے جاتے تھے۔ میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مفتی صاحبؒ کے جواب استفتاء معلوم ہونے کے بعد کسی بڑے سے بڑے جیّد عالم کو بھی اُس کے خلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی معلومات کی وسعت ہر عالم کے ہاں مسلّم تھی۔ اسی لئے ہر عالم کو اُن کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم ہی کرنا پڑتا تھا۔

علمی صدقہ جاریہ آپ نے عمر بھر درس وتدریس کے ذریعہ جو کتاب وسنت کی خدمت کی ہے۔ اُس سے سینکڑوں علما دین کی خدمت کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ ان فیض یافتہ علماء کرام کی دینی خدمات حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صدقہ جاریہ ہیں۔ جن کی برکت سے بعد از وصال بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات عالیہ قرب الٰہی میں اضعافاً مضاعفہ ہوتے رہیں گے۔

ذکر خیر اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ایک یہ انعام بھی عطا فرمایا کرتے ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان کا ذکر خیر کرتی رہیں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالےٰ نے اس شرف سے بھی مشرف فرمایا ہے ان کے تلامذہ کا سلسلہ انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا اور اُن کے متوسلین فخریہ طور پر اپنی نسبت ان کی طرف کرتے رہیں گے۔

اخلاق حمیدہ انسان کے اخلاق کا صحیح معیار اس وقت معلوم ہوتا ہے۔ جب مصائب میں مبتلا ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر آدمی مصائب میں اپنا اخلاقی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں نیو سنٹرل جیل ملتان میں کچھ وقت ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ کے اخلاق حمیدہ کا منظر جو جیل میں دیکھا وہ جیل سے باہر دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اے کلاس میں تھے۔ اور آپ کی قید با مشقت تھی۔ اے کلاس کا قیدی باہر سے ہر چیز منگوا سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو خدام قیدیوں میں سے ملے ہوئے تھے۔ مثلاً حجام دھوبی کھانا پکانے والے بھنگی وغیرہ وغیرہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہفتہ عشرہ بعد باہر سے اپنی جیب سے تین چار سیر گوشت منگواتے تھے اور گھی وغیرہ ڈال کر بہت اچھی طرح پکواتے تھے اس کے بعد وہ سارا گوشت مذکورۃ الصدر خادموں کو

پیالے بھر بھر کر دیدیا کرتے تھے۔ جب خربوزوں کا موسم آیا تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی جیب سے بیس پچیس سیر متعدد مرتبہ خربوزے منگواتے تھے۔ اور تمام احباب کو تحفتہً تقسیم فرمادیا کرتے تھے اس کے علاوہ گرمی کی شدت کے باعث پنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی مفتی صاحب اپنی جیب سے پنکھے منگواتے تھے۔ اور احباب کو تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔

پان کا لنگر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دہلی سے اعلیٰ درجہ کے پانوں کے ٹوکرے آیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جیل کی کوٹھری ایک لنگر خانہ تھی مسلمان ہند و سکھ عیسائی حتیٰ کہ بھنگی بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پان کے لئے سائل ہو کر آتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت خندہ پیشانی سے ہر ایک کو پان دے دیا کرتے تھے۔

ایک "عجیب" واقعہ نیو سنٹرل جیل ملتان میں فجر کی نماز کے بعد میں جیل خانے کی بالائی منزل پر ٹہل رہا تھا احرار کے کشمیر ایجی ٹیشن کا ایک قیدی جو بی کلاس میں تھا۔ ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا اور نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سر میں درد تھا اور مفتی صاحب چارپائی سے نیچے کھڑے ہوئے اس کا سر دبا رہے ہیں۔ امام العلماء اور ہندوستان کے مفتی اعظم کا یہ واقعہ میرے لئے حیران کن تھا اور آپ کے اخلاق عالیہ کا ایک بہترین نظارہ تھا۔

آپ کی شاعری نیو سنٹرل جیل ملتان میں تقریباً ہفتہ میں ایک دن مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس مشاعرے میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے حسن اتفاق کہ اکثر شاعر مسلمان ہوتے تھے ہندوؤں میں سے بہت آدمی اس مشاعرے میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار بھی پڑھے جاتے تھے۔ اشعار تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہوتے تھے۔ البتہ مجلس مشاعرہ میں آپ تشریف نہ لایا کرتے تھے۔ آپ کی طرف سے مخدوم العلماء و الفضلا حضرت مولانا احمد سعید صاحب دامت برکاتہم سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند وہ اشعار مجلس مشاعرہ میں پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا کرتے تھے۔

سیاست میں بلند پایہ آپ جانتے ہیں کہ وائسرائے ہند کی کونسل میں ہندوستان کے سیاستدانوں کا بہترین جمع ہوتا تھا۔ جو چیزیں وائسرائے ہند کی کونسل میں طے پاتی تھیں ان پر سخت ترین تنقید اور نکتہ چینی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دماغ ایسے گوشے نکال کر سامنے لاتا تھا کہ وائسرائے ہند کے عالی دماغ سیاستدان بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کے اعلیٰ درجہ کے سیاستدان بھی حضرت مفتی صاحب کی تنقید کے منتظر رہتے تھے کہ ان کی تنقید آئے تب اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

سادگی باایں ہمہ کمالات عالیہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس میں اپنی شان کے شایاں کوئی کروفر نہیں ہوتا تھا۔ رفتار اللہ تعالیٰ کے منکسر المزاج بندوں کی سی ہوتی تھی، گفتار میں کوئی متکبرانہ طرز نہیں ہوتا تھا۔

دُعا اللہ تعالیٰ امام العلماء حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس کا مستحق بنائے اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا الہ العالمین۔

ہندوستان دار الامان ہے

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب نسیم دہلوی)

یہ فتویٰ ہے اس مفکر اعظم و مدبر اعظم کا جو سرزمین ہند میں مفتی اعظم کے لقب سے ممتاز تھا۔

"انقلاب عظیم آسمانی" کے بعد جن دنوں راقم الحروف بسلسلۂ فتاویٰ نویسی حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ان ایام میں میری استدعا پر "موجودہ ہندوستان" پر ایک مبسوط تقریر فرمائی اور آخر میں بطور ذنکلہ ارشاد فرمایا:-

"موجودہ ہندوستان شرعی اعتبار سے دار الامان ہے۔"

دار العلوم دیوبند میں میرا زمانہ طالب علمی تھا کہ حضرتؒ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہو کر دیوبند تشریف لے گئے۔ میں سلام کو حاضر ہوا، پوچھا کس حجرے میں مقیم ہے۔ عرض کیا حجرہ نمبر ۲۴ احاطہ مولسری، چونک کر فرمایا اچھا! میں اس گھڑی کی مسرت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جب حضرتؒ نے حجرے میں قدم رکھتے ہی چہار دیواری پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے فرمایا "میں بھی اس حجرے میں رہا ہوں۔"

سخت روحانی قلق ہے کہ بندہ اپنی طویل اعصابی علالت کے باعث آخری خدمات حتیٰ کہ آخری دیدار سے بھی محروم رہا۔ تاہم اپنی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین کی تسکین خاطر کی غرض سے تاریخی قطعات ۸۰ + ۵ + لیل و نہار غم ۱۲۸۷ = ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء موسوم بہ نشانی مفتی اعظم ۱۹۵۲ کتابی شکل میں تیار کئے ہیں۔ جس میں یکصد بارہ غم ۱۳۷۲ھ یعنی تاریخ رحلت کے سو مادے استخراج کر کے درج کئے ہیں ۱۲ مادے آیات سے مقتبس ہیں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں سنترؔ اشعار کا مجموعہ ہشتگانہ اقسام تاریخ سے آراستہ تاریخی نثر عبارت میں سوانح بھی قلمبند کر دیئے۔ غرض کہ حضرتؒ کی روحانی بارگاہ میں

شہرت عام و بقائے دوام کے لازوال پھول بطور ہدیہ پیش ہیں
۱ ۹ ۶ ۵ ۲

اس سبد گل کے ایک پھول سے دماغ معطر کیجئے

قطعہ بہ صنعت ضرب و جمع کہ پانچ تاریخیں برآمد ہیں

مفتی اعظم ، شیخ یگانہ ، مرد مجاہد ، فخر زمن
موت ہے ان کی ، موت جہاں کی ، آپ ہی خود تھے اپنی مثیل
اہل وقار و عقل مجسم ، مہر زمان و فرد جہاں

۳۴۳ ۳۴۳ ۳۴۳ ۳۴۳ = ۱۳۷۲ھ

۴ ۴ ۴ ۴
۱۳۷۲ھ ۱۳۷۲ھ ۱۳۷۲ھ ۱۳۷۲ھ

چاروں کا ماتم چار طرف ہے ، جس سے ہے ظاہر سالِ رحیل

رقمطراز بندہ محمد ادریس نسیم دہلوی کان اللہ لہٗ
۱۳۷۲ھ

آہ! مفتی اعظم!!

(از جناب علامہ انور صابری)

"مفتیٔ اعظم" فقیہہ بے مثال و فخر دیں — سرورِ کون و مکاں کے علم و حکمت کا امیں
وقت کا اونچا مدبر ، رہنمائے باشعور — دانشِ حاضر کے رُخ کا غازۂ حسن آفریں
نبضِ فطرت پر جما کر جس نے اپنی انگلیاں — نفع بخشِ زندگی گہرائیاں معلوم کیں
گلشنِ محمودؒ کی جانِ بہارِ آرزو — جس کے ہونٹوں کا تبسم جس کی تنویرِ جبیں
ظاہر و باطن میں اصحابِ نبی کی یادگار — صورت و سیرت میں ہمرنگِ قرونِ اولیں
ہند کی تحریکِ آزادی کا مخلص پیش رَو — نقشِ پا جس کے نہ بھولیگی وطن کی سرزمیں
فہم و دانش کی ہر اک گتھی کو سلجھاتے ہوئے — پیش جس کے ذہن کو مشکل کوئی آتی نہیں
بات میں نرمی ۔ لب و لہجہ میں دلکش سادگی — شکلِ انساں میں فرشتوں کا جمالِ دل نشیں
اتباعِ سنّت و تائیدِ شرعِ پاک میں — ہر عمل جس کا تقدس زادۂ عرشِ بریں
جس کی چشمِ حق نگر کے اشکِ عصمت ریز سے — سرد ہوجاتا تھا باطل کا مزاجِ آتشیں

دوزخِ دنیا میں انور ہم کو تنہا چھوڑ کر
لے گئی ہے موت اس کو جانبِ خلدِ بریں!

مکتوب مسٹر آصف علی

سفیر حکومتِ ہند متعینہ سوئٹزرلینڈ

ہز ایکسلنسی مسٹر آصف علی دہلوی سے مضمون کی فرمائش کی گئی تھی۔ آپ نے ضابطہ کا مضمون تو نہیں بھیجا لیکن جواب میں جو خط تحریر فرمایا وہ خود مضمون ہے اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

برنادرزرائن۔ ۱۵ئے

برن۔ ۲۱ رجنوری ۵۳ء

مکرم بندہ مولانا محمد میاں صاحب۔ سلام مسنون

آپ کا ۹ رجنوری کا خط مجھے روم (رومتہ الکبریٰ) سے واپسی پر ۱۹ رکو ملا۔ حضرت مفتی اعظم مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر مجھے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے خط سے معلوم ہو گئی تھی جو قلبی رنج ہوا اس کا اندازہ آپ فرما سکتے ہیں۔

مفتی صاحب مرحوم سے مجھے جو ذاتی عقیدت اور نیازمندی کا شرف حاصل تھا وہ بالکل خصوصی تھا۔ کم و بیش ۳۵ برس تک کا قریبی ساتھ تھا۔ اگرچہ حضرت مغفور کی ہم نشینی کی عزت سیاسی تحریکات کے سلسلے میں شروع ہوئی تھی۔ مگر زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا رہ گیا ہو جس میں ان کی بصیرت افروز اور خلوص آموز ہدایتوں کا فیض نہ پہونچا ہو۔

میری ارادت اور عقیدت مندی صرف ان کے بزرگانہ اخلاص اور شفقت پر ہی منحصر نہ تھی بلکہ ان کے اسوۂ حسنہ نے میرے قلب میں گہرا احترام پیدا کر دیا تھا۔ تبحر تو ممکن ہے اور حلقوں میں بھی اس درجہ کا موجود ہو مگر جو اخلاقی اور علمی دیانت اور ذاتی انکسار، قناعت اور قربانی کا پیمانہ میں نے مفتی محمد کفایت اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ہر قول اور فعل میں قریب سے قریب رہ کر دیکھا اس کی نظیر کمیاب ہے۔ مرحوم کی خوبیاں کن الفاظ میں گنواؤں لغت کا جو سرمایہ میرے پاس ہے وہ ان کی ثنائے حقیقی کے لئے ناکافی ہے۔

اگر کبھی زندگی کے حوادث نے مہلت دی تو شاید جو کچھ میرے علم میں ان کے سوانح میں قلم بند ہو سکیں۔ میں اس قابل تو نہیں کہ مفتی صاحب کے دینی تبحر کے متعلق بجز غایت احترام کے کچھ عرض کر سکوں مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ بارہا نازک سے نازک مسائل پر جب کبھی محض دنیوی علوم کے گوشہ سے گفتگو کا موقعہ آیا مفتی صاحب نے ہر قسم کی بحث کو صبر و سکون سے سنا اور جواب شافی عطا فرمایا۔ عموماً عقلی دلائل کو جو نازک مرحلوں تک پہونچ جائیں خطرناک قرار دے کر روک دیا جاتا ہے۔

سیاسی امور میں مفتی صاحب کے مشورے صائب اور روشن ضمیری کا ثبوت ہوتے تھے، سخت سے سخت موقعوں پر ان کے قدم استقلال کی چٹان پر جمے رہے اور ہر قربانی کو انھوں نے خنداں پیشانی سے لبیک کہا۔ وہ تدبّر، دیانت، اخلاص، انکسار اور تبحر علمی کی ایک مشعل تھے۔ افسوس آج اُن کی رحلت نے اس بزم کو سُونا کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میری جانب سے پس ماندگان کو یہ پیام مہربانی فرما کر پہونچا دیجئے کہ میں ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ راہ ہم سب کے سامنے ہے۔

مخلص آصف علی

انین الحزین

لمولانا المحمود الدیروی احد ارکان التدریس بالجامعۃ الاسلامیۃ قاسم العلوم (ملتان)

نُعَزِّیكَ یا من فاز بالخیر والعُلیٰ ... بان افلت شمس الھدایۃ للوریٰ

نعزّیك یا من صار قلبك فُجعۃً ... کذالك بکت اعماق افئدۃ الوریٰ

اذا مانعی الناعی بموت ولیّنا ... کفایۃ مولانا وو ارث من ھدیٰ

وصیّۃ شیخ الھند قسمۃ قاسم ... ورشد رشید فاز بالرشد والتُّقیٰ

واشرف خلق اللہ انور وقتہ ... وبدر سماء العلم والفقہ والفُتیٰ

حملنا من الاحزان مالو بعضھا ... تحمّلہٗ بعض الجبال لانحتیٰ

اراضی دیار الھند والسند اظلمت ... بفقد کریم نورہ اشرق الدُّنیٰ

لہٗ منّۃٌ فی اھل علم کثیرۃٌ ... اشاع علومًا سابقًا کلّ من سعیٰ

مسائلُ مستفتین ایضًا یتیمۃٌ ... کذاك علوم فی المدارس والقُریٰ

وما کان مزعوم الخلائق قبلہ ... ان فی الثریٰ تخفی الکواکب والذکا

وخالقنا الرحمٰنُ اعطی اجرہ ... وخلّدہ اذ ذاك بالعیش والمُنیٰ

وارضٰکم والغابرین ومن بکیٰ ... واخلصھم من سورۃ الحزن والشجیٰ

ولما التقت ذات الالٰہ نفسہٗ ... فاجاب ارضاءً لھا ربُّ الوریٰ

"غفرانك یُوجَبُ" من رفیع جنابنا ... فانت مثیلٌ للملٰئکۃ العُلیٰ

۱۳۷۲ھ

میرے دو محسن

(از جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی)

آہ! دریغا حاجی رشید احمد ـــــ واحسرتا حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ ۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

۳ر دسمبر ۵۲ء کی صبح کو مدرسہ عالیہ پہونچا۔ درس شروع ہو رہا تھا کہ ایک صاحب نے فرمایا "رات پاکستان ریڈیو پر حاجی رشید احمد صاحب کی وفات کی خبر سنی ہے۔"

ان جملوں کے سانھ ایک بجلی سی کوندی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، میں نے کہا کون وہی ہمارے حاجی رشید احمد ؟ جواب ملا ہاں وہی بندوق والے ہمارے مدرسہ کے سابق مہتمم جو ۴۷ء میں ہندوستان چھوڑ کر مشرقی بنگال چلے گئے تھے۔

پھر بھی دل اس خبر کی تصدیق پر آمادہ نہ ہوا۔ مزید تصدیق کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے آخر شام تک حادثہ جانکاہ کا ثبوت مل ہی گیا۔ سب ہی اخبار کے کالموں میں اپنے جیسے ہزاروں کو شریک غم کرنے کے لئے خبر شائع کرادی۔

یکم جنوری ۵۳ء کو خلاف معمول ۴ بجے شب کو اُٹھا۔ زنان خانے کی ڈیوڑھی پر گیا تو دیکھا اخبار والا، اخبار ڈال گیا ہے اسے اٹھا کر پہلے ہی صفحہ پر نظر ڈالی تھی کہ نگاہیں اس خبر پر جم گئیں "آہ! مفتی اعظم علامہ محمد کفایت اللہ کا دس بج کر بیس منٹ پر شب کو انتقال ہوگیا۔" چشم پُرنم ہوئی قلب و دماغ پر جان کنی کی سی کیفیت محسوس ہوئی اور زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوگیا۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

ایک وقت وہ تھا کہ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر ۱۹۳۹ء میں مدرسہ عالیہ فتحپوری میں مقرر ہوا۔ یہی دونوں بزرگ مدرسہ عالیہ کے مہتمم تھے اور میں انہی دونوں محسنوں کی مربیانہ شفقتوں سے لمحہ بہ لمحہ بہرہ اندوز تھا۔ آج وہ وقت ہے کہ بیک وقت دونوں محسنوں کو ہمیشہ کے لئے گم کر بیٹھا ہوں مدرسہ عالیہ میں اپنی ۱۸ سالہ زندگی میں ان دونوں بزرگوں سے میرا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اور بہت قریب سے ان گراں قدر شخصیتوں کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔

حاجی صاحب مرحوم کی شخصیت پر غور کرتا ہوں بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔

در کف جامِ شریعت در کف سندان عشق

دنیاوی معاملات میں انتہائی انہماک اور کامیابی کے ساتھ بدرجہ اتم دینداری حاجی صاحب کی وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا شریک نظر نہ آتا تھا۔ دہلی کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی انجمن ہو جس کے حاجی صاحب رکن رکین نہ ہوں۔ دہلی کے باہر بھی وہ کونسا قابل ذکر ادارہ ہے جس میں حاجی صاحب کی سیاست کارفرما نہ تھی؟ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جیسی مرکزی درسگاہ کے اگر وہ سرپرست اور روح رواں تھے تو دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے اداروں میں بھی ان کی سیاست کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ دہلی میونسپلٹی جو کسی چھوٹے صوبہ کی لیجسلیٹو اسمبلی سے کسی طرح کم نہیں، حاجی صاحب مرحوم کی سیاست کا خاص گہوارہ رہی ہے۔ یہ ان کی خداداد قابلیت تھی کہ چند ہی سال کام کرنے کے بعد کمیٹی کے کہنہ سال و کہنہ مشق ممبروں کو پیچھے چھوڑ کر وائس پریسیڈنٹی کی کرسی پر فائز ہو گئے۔ اور اس حسن و خوبی سے پورے ادارے کے انتظام کو سنبھالا کہ آج تک اس کے در و دیوار پر حاجی صاحب کی یاد تازہ ہے۔

ملکی سیاست میں حاجی صاحب کا رجحان ہمیشہ برٹش سیاست کی طرف رہا اسی بنیاد پر وہ ہمیشہ مسلم لیگ کے دلدادہ تھے اور اس میں ایسے سرگرم عمل رہے کہ مسلم لیگ کے بنیادی ستون سمجھے جاتے تھے برٹش دور میں حکام اور حکومت سے وابستگی بھی حاجی صاحب نے اس طور پر کی کہ ہند کے حکام رس طبقہ کے لئے باعثِ رشک بنے رہے چند ہی روز کی کاوش میں خان صاحبی کے، او۔ بی کے خطاب تک پہونچ گئے۔ حکومت کی نگہ انتخاب ان کے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن جانے کا سبب تھی۔

ان تمام دنیوی جھمیلوں کے ساتھ ان کا عبادت میں شغف دین دار طبقہ کے لئے باعث رشک تھا۔ تمام مصروفیتوں کے باوجود ممکن نہ تھا کہ نماز باجماعت قضا ہو سکے یا معمولات و اوراد میں کوئی فرق آسکے ایک طرف پورے دین دار تھے تو دوسری طرف بفضل خدا مکمل زاہد شب زندہ دار!

موت کی کیفیت جو ان کے صاحبزادے انیس احمد صاحب کے خط سے معلوم ہوئی یقیناً ہر مسلمان کے لئے باعث رشک ہے، چند ماہ کی علالت کے بعد ۲ ردسمبر ۵۲ء کو شب کے چار بجے حسب معمول بیدار ہوئے، تیمم کرا کے تہجد کی نماز کے لئے نیت بندھوائی اور اسی حالت میں روح جسد عنصری کو چھوڑ کر مرکز اصلی کی طرف پرواز کر گئی۔ ۴۷ء میں حاجی صاحب کو دہلی چھوڑنی پڑی اور انھوں نے مشرقی پاکستان کو اپنا مستقر بنایا لیکن اس مکانی تغیر و تبدل سے ان کی شخصیت اور مصروفیت میں فرق نہ آیا۔ وہی مجسٹریٹ اور انجمنوں کی ممبری وہی دینداری اور مدارس دینیہ کے کاموں میں انہماک غرضیکہ اس برصغیر ہندوستان و پاکستان میں دین و دنیا کی سرخروئی کے ساتھ اپنی عمر کے ۷۵

سال پورے کر کے ابدی میٹھی نیند سو گئے۔

حاجی صاحب اور مفتی صاحب کا تعلق بھی پرانی وضعداریوں کا ایک خاص نمونہ تھا۔ دونوں بزرگوں کے سیاسی خیالات میں انتہائی اختلاف۔ پھر بھی شاید ہی کوئی دن جاتا ہو، فتحپوری مسجد کی منتظمہ کمیٹی دونوں بزرگوں کا مستحکم سنگم تھی۔

۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جہاں مسلمانوں کی عظمت و شوکت دفن ہوئی غنی مسلمانوں کی مساجد و اوقاف بھی انجیار کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے تھے فتح پوری مسجد اور اس کے اوقاف بھی ضبطی میں آئے تھے اور نیلام ہو کر دہلی کے مشہور رئیس چھنّامل کی ملکیت قرار پا گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب ذرا حالات بدلے تو مسلمانوں کی درخواست پر چھنّامل سے واگذار کرا کر مسلمانوں کے حکام رس طبقہ میں سے ایک کمیٹی کے سپرد کر دئے گئے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے احوال بھی بدلے اور تحریک خلافت کا دور شروع ہوا تو عام پبلک کے اصرار پر مفتی صاحب مرحوم مسجد فتحپوری کی منتظمہ کمیٹی میں شریک کر لئے گئے۔

کمیٹی میں مفتی صاحب کی شرکت سے مسجد کے انتظام میں بہتری کی طرف نمایاں تبدیلیاں عمل میں آگئیں اور یہ دور گوناگوں ترقیوں کا حامل بنا مسجد سے ملحقہ دوکانوں کی تعمیر جیون بخش ہال فتحپوری مسلم ہائی اسکول کی عمارت اسی دور کے شاندار کارنامے ہیں ـــ!

مدرسہ عالیہ فتحپوری مفتی صاحب کے اہتمام سے قبل ایک معمولی حیثیت کا مدرسہ تھا۔ اس کے ماہانہ مصارف ۵۰۰ سو سے متجاوز نہ تھے لیکن مفتی صاحب کے زریں دور میں مدرسہ اپنے عروج پر پہونچا تو تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کے مصارف جاری ہوئے۔ درس نظامی کی جماعتوں کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل کی کلاسیں بھی جاری ہوئیں تعلیمی معیار اس قدر بلند ہوا کہ مولوی فاضل امتحان کا اسکالرشپ اور تمغہ چند سال کے لئے تو بالکل فتحپوری ادارہ کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر سال ادارہ سے کوئی امیدوار تمام یونیورسٹیوں میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے اسکالرشپ اور تمغے کا مستحق بن جاتا ہے مفتی صاحب کی نظر انتخاب نے درس نظامی کے لئے بہترین قسم کے اساتذہ کو جمع کر دیا تھا درجہ حفظ قرات میں بھی طلبار کا ہجوم رہنے لگا تھا۔

مدرسہ عالیہ کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر فتحپوری مسجد میں دہلی شہر کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں عام مسلمانوں کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی کافی تعداد میں شریک ہوتا تھا۔ اس موقعہ پر مدارس عربیہ کی ضرورت افادیت علم دین کی اہمیت اور مختلف مذہبی مسائل پر مفتی صاحب مرحوم ایسی فاضلانہ تقریریں فرمایا کرتے تھے کہ سال بھر کے لئے غذا روح کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ ان کی تقریروں میں عقل کا امتزاج جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے خاص کشش رکھتا تھا۔

۱۹۳۲ء میں جب مفتی صاحب مرحوم اسیر فرنگ ہو کر ملتان سنٹرل جیل میں نظر بند ہوئے تو اس وقت بھی غائبانہ طور پر مدرسہ عالیہ کی سرپرستی فرماتے رہے اور مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مرحوم کے گرامی ناموں کا یہ مجموعہ میرے پاس محفوظ ہے۔ خوشنویسی اور خوشخطی کا ایک شاہکار ہونے کے علاوہ بہت سی عبرتوں اور موعظتوں کا بھی حامل ہے۔

میں نے کسی عریضہ میں درس قرآن کے ختم کی ایک تقریب اور اس میں شیرینی تقسیم کئے جانے کا تذکرہ کر دیا تھا۔ گرامی نامہ میں اس پر جو تبصرہ فرمایا وہ اصحاب نظر کی موعظت کے لئے درج کرتا ہوں۔ تحریر فرمایا:۔

"درس قرآن مجید کے ختم کی کیفیت معلوم ہوئی۔ مسلمانوں کی غلط روی کے مظاہروں کا قصہ بہت طویل ہے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت کرے۔ بھلا اس وقت جبکہ ملت و وطن کو اشد ضرورتوں کے لئے روپیہ درکار ہے محض شیرینی اور طشتریوں میں دو ڈھائی سو روپیہ خرچ کر کے خدا کی رضامندی حاصل کی جا سکتی ہے؟

این خیال است و محال است و جنوں

ہزار ہا بہترین فرزندان وطن جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں ان کے اہل و عیال فاقے کر رہے ہیں انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔ اصحاب اموال خدا کے امین ہیں۔ دولت خدا کی امانت ہے۔ غیر مصرف میں خرچ کرنا خیانت ہے جس کا مواخذہ قیامت کے دن رب العزت کے دربار میں ہوگا۔"

یہ چند مختصر جملے ہیں جو حضرت مرحوم کے حقیقت نگار قلم سے ضمنی طور پر صفحۂ قرطاس پر آئے۔ اگر انہی پر غور کیا جائے تو حقیقتاً وہ زرین اصول ہیں جو قوموں اور اشخاص کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ خطوط کا یہ مجموعہ تو ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے جس کے جواہر پارے انشاء اللہ مستقل فرصت میں ہدیہ ناظرین کئے جائیں گے عرض کرنا تو یہ تھا کہ یہ دو ڈھائی سالہ زمانہ قید مدرسہ عالیہ فتحپوری اور اس کے متعلقین کے لئے ایک ابتلاء کا زمانہ تھا۔ منتظمہ کمیٹی مسجد فتح پوری میں وہ شخصیتیں بھی کار فرما تھیں جو مدرسہ کے اس عروج کو پیار کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور گلچیں کے لئے موقع تھا کہ اس باغ کے نگہبان کی عدم موجودگی میں برہم زن چمن بنے۔ وقت آتا ہے اور چلا جاتا ہے واقعات تفصیل طلب ہیں بس اس وقت اسی قدر گذارش کی جا سکتی ہے کہ اس عرصہ میں کچھ رخنہ اندازیاں ہوئیں مفتی صاحب نے واپس تشریف لا کر اپنی انتہائی قابلیت اور خداداد ذہانت کے ذریعہ نہایت سہولت سے ان کی اصلاح فرمادی اور مخالف طاقتیں مفتی صاحب مرحوم کی ادنیٰ توجہ سے پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔

علوم و فنون کی مہارت کے علاوہ حضرت مرحوم میں ایک فطری ذکاوت اور ذہانت ایسی تھی جسے حقیقتاً "فراست المومن" ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا ظہور مدرسہ عالیہ کے انتظام میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔

اب سے تقریباً ۱۸ برس پہلے کا واقعہ ہے ایک ادھیڑ عمر غیر مسلم مسجد میں آیا اور مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ امام صاحب فتحپوری نے حسب معمول اسلام کی تلقین کردی اسی زمانہ میں میں اور بعض اساتذہ مدرسہ عالیہ کے دارالطلبہ ہی میں مقیم تھے اور ہم نے اپنے مطبخ کا الگ انتظام کر رکھا تھا جس میں ایک سادہ لوح نیک دل باورچی کام کرتا تھا۔ یہ نومسلم رفتہ رفتہ ہم تک پہونچ گیا اور ہم نے ازراہ تالیف قلب اُسے اپنے پاس ٹھہرالیا۔ کپڑے بنائے کچھ مالی مدد کی ساتھ کھانا کھلانا شروع کردیا اور اس کو مدرسہ کی ابتدائی تعلیم میں شریک کردیا۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے مفتی صاحب مرحوم سے اس نومسلم کا سارا حال بیان کیا۔ تحسین وآفرین کی امید پر اب تک اپنی تمام ہمدردیاں بیان کیں اور درخواست کی کہ مدرسہ کی جانب سے اس نومسلم کا تعلیمی وظیفہ جاری کردیا جائے۔

مفتی صاحب حسب عادت مستفسرانہ انداز میں ہم سے معلومات حاصل کرتے رہے اور آخر میں اپنے ایک خاص انداز میں فرمانے لگے کہ سب سے پہلے تو آپ صاحبان جواب دیں کہ آپ نے بورڈنگ میں اپنے ساتھ کس کی اجازت سے ٹھہرایا ہے؟ گویا مفتی صاحب نے ہماری بے قاعدگی پر گرفت کی۔ اس لئے کہ بورڈنگ میں مہمان کو ٹھہرانے کے ہم مجاز نہ تھے۔

مفتی صاحب کی گرفت اور جواب ہمارے لئے بالکل خلاف توقع تھا۔ ہم تو یہ امید لے کر گئے تھے کہ مفتی صاحب کی مجلس سے اپنے لئے آفرین وتحسین اور نومسلم کے لئے وظیفہ کی منظوری لے کر لوٹیں گے۔ مفتی صاحب کا یہ طرز عمل بہت تلخ اور ناگوار گذرا۔ اور غالباً دلی جذبات ہمارے چہروں پر نمودار ہوگئے۔ تب مفتی صاحب نے بگڑ کر ایک خاص مشفقانہ انداز میں فرمایا۔ بھائی جان اگر اس شخص نے کوئی خطرناک اقدام کردیا تو ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ بس اس گفتگو پر مجلس برخاست ہوگئی اور ہم دل میں کڑھتے ہوئے واپس آئے۔

کچھ مدت کے بعد نومسلم کا بار ہم پر گراں گذرنے لگا۔ پھر مفتی صاحب کے خیالات اس بارہ میں ہمیں معلوم ہی ہو چکے تھے۔ لہٰذا ہم نے نومسلم کو جدا کردینا چاہا۔ اس دوران میں نومسلم ہمارے باورچی سے انتہائی خلا ملا پیدا کر چکا تھا۔ جب ہم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو ہمیں اپنے اس دیانتدار باورچی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

یہ دونوں ہم سے رخصت ہوکر ریاست پٹیالہ میں جا مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ تک تو باورچی کی خیریت معلوم ہوتی رہی لیکن اچانک یہ خبر سننے میں آئی کہ باورچی قید خانے میں ہے اور نومسلم پھانسی پا چکا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پٹیالہ پہونچ کر نومسلم نے اپنے آپ کو ڈاکٹر مشہور کیا اور پریکٹس شروع کردی۔ ایک دن کوئی نوعمر بچی زیور پہنے دوا لینے آئی تو زیور کے لالچ میں نومسلم نے اس معصوم کو قتل کر ڈالا اور اپنی دوکان ہی میں لاش دفن کردی۔ پولیس نے کیس پکڑ لیا۔ اور تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ عادی مجرم تھا بالآخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہونچا اور پھانسی چڑھ گیا

اور ہمارے باورچی صاحب بھی اس سے تعلق کی بنا پر جیل پہونچ گئے۔ جب ہمیں یہ سارا واقعہ معلوم ہوا تو مفتی صاحب مرحوم کی خداداد فراست کا قائل ہونا پڑا اور دل میں سوچا۔

"رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت"

اس قسم کے بیسیوں واقعات جن میں بالآخر مفتی صاحب کی فقید المثال ذہانت اور ذکاوت کا قائل ہونا پڑا اور بارہا قلب نے فیصلہ کیا ہے کہ مفتی صاحب جیسی مجموعۂ علم وفضل قابل قدر ہستیاں شاذونادر ہی اس عالم امکان میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اپنے بزرگوں کے اصرار پر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر اپنے جستہ جستہ خیالات فی الحال پیش کر رہا ہوں اگر سعادت مقدر ہے اور وقت نے فرصت لینے دی تو انشاء اللہ آئندہ مفتی صاحب کی خصوصیات پر کوئی مستقل چیز پیش کروں گا۔ اللھم ارحمھما رحمۃ واسعۃ کاملۃ وتغمدھما بغفرانک یا ارحم الراحمین۔

جذباتِ غم

(از جناب مولانا ظہور الحسن صاحب فنا استاذ جامعہ حسینیہ راندیر۔ سورت)

همنشین با تو چه گویم حالِ غم — شد پراگنده نظامِ هستیم
اُف چه کرد این گردشِ لیل و نهار — چه بلاها ریخت بر جان و دلم
تو کجائی مفتیٔ اعظم کجا — یادِ تو لحظہ بہ لحظہ دمبدم
جانِ من در فرقتِ تو مضطرب — وز تپ ہجرت چو نَے در آتشم
مسندِ تدریس بے تو سوگوار — سر خمیده بے تو اربابِ حِکَم
ایکه هر مشکل به نزدت سہل بود — ایکه فکرت بود ہمچون جامِ جم
بادِ لطفِ حق بروئے جانِ تو — بر تو بارد ابرِ رحمت دمبدم

گفت ہاتف سالِ رحلت اے فنا
شد مقامِ برترش دارِ نعم
۱۹۵۲ء

سفر مصر کے چند مشاہدات

(از جناب مولانا عبدالحق صاحب مدنی مدیر جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی مراد آباد)

آپ کا ارشاد ہے کہ میں حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق کچھ لکھوں۔ میں متردد ہوں کہ کیا لکھوں۔ اگر میں مفتی صاحب کے مرتبہ کا ہوتا یا ان کے بلند مرتبہ کے کچھ قریب ہی ہوتا تو کچھ لکھ سکتا تھا مگر یہاں تو کوئی نسبت ہی قائم نہیں ہوتی، لکھوں تو کیا لکھوں —— بہرحال چند واقعات عرض کر رہا ہوں۔ شاید اس طرح آپ کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے۔

حضرت الحاج مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۲۴ء میں ہوئی تھی، جب مراد آباد میں جمعیۃ علماء ہند کا مشہور اجلاس ہوا تھا اور میں مدینہ طیبہ سے نووارد تھا۔ کراچی میں مقیم تھا۔ شرکت اجلاس کے لئے کراچی سے مراد آباد آیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے مجھے اجنبی صورت دیکھ کر لوگوں سے میرے متعلق دریافت فرمایا۔ اگلے روز احاطہ اجلاس سے باہر ایک خیمہ کے پاس میں کھڑا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ حضرت مفتی صاحب ادھر سے گذرے۔ مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے معانقہ کیا۔ پھر مصافحہ کرکے خیریت دریافت فرمائی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر خیمہ میں لے گئے۔ تقریباً پون گھنٹہ تک بڑی بے تکلفی، محبت اور ہمدردی سے اس طرح باتیں کرتے رہے جیسے کوئی بہت پرانا دوست عرصہ کا بچھڑا ہوا ملا ہو۔ میں حیران تھا کہ ایک عجیب غریب الوطن پر یہ شفقت؟ حضرت مفتی صاحب کی اس غریب نوازی اور شفقت نے میرے دل کو عظمت و احترام سے بھر دیا۔ آپ کی اس مخلصانہ شفقت کا غیر فانی نقش میرے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلی ملاقات تھی اس کے بعد بارہا ملاقات و زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن ہر دفعہ کی تازہ شفقت و نوازش پہلے نقش کو ابھارتی اور مستحکم سے مستحکم تر کرتی رہی۔

مؤتمر قاہرہ

حسنِ اتفاق! مجھے ایک طویل رفاقت کا موقعہ ملا۔ یہ سفر مصر کی رفاقت تھی۔ جب قاہرہ میں ایک اسلامی کانفرنس کی گئی تھی۔ اور اس میں شرکت کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے نمائندے طلب کئے گئے تھے۔ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے حضرت صدر یعنی حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا اور رفاقت اور دوسرے نمائندہ کی حیثیت سے "قرعہ فال بنام من بیچارہ زدند"۔

اس حسن اتفاق کے ساتھ سوء اتفاق یہ تھا کہ جیسے ہی بحری جہاز پر سوار ہو کر بمبئی سے روانہ ہوئے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ملیریا کا حملہ ہو گیا۔ اور تیسرے روز ملیریا میعادی بخار میں تبدیل ہو گیا۔ بخار شدید تھا۔ اور ہر وقت غفلت رہتی تھی۔ ایک بزرگ شخصیت کی خدمت کا موقعہ تو ملا۔ مگر جاتے وقت علمی فیوض و برکات

سے استفادہ کا موقعہ نہیں مل سکا۔

میں ایک عجیب وغریب تماشہ دیکھا کرتا تھا اور حیران رہتا تھا۔ وہ تماشہ یہ کہ بخار کی شدید غفلت میں قلب مبارک یادِ خدا سے غافل نہیں تھا چنانچہ جیسے ہی نماز کا وقت آتا خود ہوشیار ہوتے اور تیمم کرکے نماز ادا کرتے اور پھر اسی طرح دنیا و ما فیہا سے غافل ہو جاتے۔

جب پورٹ سعید کے قریب جہاز پہونچا میں نے اطلاع دی۔ فوراً ہوشیار ہو کر اٹھے۔ بکس میں سے کپڑے اور شیروانی نکلوا کر زیب تن کئے اور تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک جماعت استقبال کے لئے آئی تھی۔ آپ نے ہر ایک سے ملاقات اور گفتگو کی اور پھر بلا کسی سہارے کے اپنی چھڑی لے کر جہاز سے بندرگاہ پر اتر آئے۔ چند گھنٹے کے لئے ایک ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ جیسے ہی آپ قیام گاہ پر پہونچے۔ اسی طرح غفلت طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا۔ ٹائیفائڈ تجویز کیا۔ شام تک بہت تکلیف رہی۔

پورٹ سعید سے قاہرہ تک ٹرین سے جانا ہوتا ہے۔ شام کے وقت ٹرین جاتی تھی۔ جب گاڑی کا وقت آیا۔ پھر اسی طرح تیار ہو گئے۔ اس وقت غفلت بھی نہیں رہی۔ اور خود ہی پلیٹ فارم پر چل کر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ لیکن ٹرین میں سوار ہونے کے بعد غفلت کی وہی حالت تھی کہ کہیں کی خبر نہ رہی۔

اسمٰعیلیہ کا اسٹیشن آیا تو وہاں "انجمن اخوان المسلمین" کی جانب سے استقبال کا عظیم الشان انتظام تھا۔ نعروں کی آواز نے حضرت مفتی صاحب کو بیدار کر دیا۔ آپ نے ملاقات کرنے والوں سے اطمینان سے گفتگو کی ہر ایک بات کا صحیح جواب دیا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو غفلت کی پھر وہی حالت تھی۔ قاہرہ اسٹیشن پر پہونچے تو ایک ہجوم نے استقبال کیا۔ آپ قیام گاہ تک اچھی حالت میں پہونچ گئے۔ مگر قیام گاہ پر پہونچ کر پھر غفلت ہو گئی۔ پورٹ سعید۔ اسمٰعیلیہ اور قاہرہ کے اسٹیشنوں پر اترتے چڑھتے اور گفتگو کے وقت قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ پر غفلت کا یہ اثر ہے۔ مگر جب واپسی میں میں نے تذکرہ کیا تو حضرت مفتی صاحب کو کوئی چیز یاد نہیں تھی۔ استقبال کرنے والوں سے جو گفتگو ہوئی جن حضرات سے ملاقاتیں فرمائیں، میں نے ان کا تذکرہ کیا حضرت مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے ان تمام باتوں کو سنا۔ مفتی صاحب کو خود تعجب تھا کہ انہیں کوئی بات یاد نہ تھی۔ بہر حال ایک عجیب وغریب طاقت ان تمام موقعوں پر کارفرما رہی۔ اس کو روحانی طاقت کہنا چاہیئے یا احساس فرض کا وہ قوی جذبہ جو غفلت کی حالت میں بھی دل و دماغ سے محو نہیں ہوا۔

بہر حال قاہرہ اسٹیشن پر آپ کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ ہندوستانی دوست جو اپنی ضرورتوں کی وجہ سے "مصر" میں مقیم تھے ان کا بیان تھا کہ اتنا شاندار استقبال دنیا کے کسی نمائندہ کا نہیں کیا گیا۔ عربی بولنے والوں کی فضا "مفتی اکبر زندہ باد" ــ "ہندی وفد زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی

تھی۔ ایک عظیم الشان جلوس نے آپ کو قیام گاہ تک پہونچایا۔۔۔ لیکن قیام گاہ پر پہونچ کر بخار کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔

۷؍ اکتوبر ۳۸ء کو شام کے پانچ بجے اجلاس شروع ہوا۔ صدر کے دائیں جانب آپ کے لئے کرسی مخصوص کی گئی تھی۔ سبجیکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے لکھا گیا تھا، مگر علالت کے باعث آپ اجلاس میں شریک نہیں ہوسکے۔ اور آپ کا بیان آپ کے رفیق سفر کو پڑھنا پڑا۔

عرب اور مصر کے باشندے رکھ رکھاؤ کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ کسی غیر عربی کا احترام مشکل سے کرتے ہیں، مگر اہلِ مصر کے دلوں میں آپ کا احترام یہاں تک تھا کہ مصر کے سب سے زیادہ واجب الاحترام پیشوا یعنی شیخ الازہر آپ کی مزاج پُرسی کے لئے دو مرتبہ قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اس زمانہ میں شیخ الازہر علامہ مصطفےٰ المراغی تھے۔ شیخ الازہر کی حیثیت مصر میں بادشاہ سے بلند مانی جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ الازہر سے ملاقات کے لئے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں آتے تھے۔ شیخ الازہر کسی سے ملنے کے لئے کہیں نہیں جاتے۔ یہ حضرت مفتی صاحب کا غیر معمولی اعزاز تھا کہ شیخ الازہر دو مرتبہ مزاج پرسی کے لئے آئے۔

مصر سے واپسی اور فوٹو کا مسئلہ

واپس ہونے سے ایک دو روز پہلے بخار اُترا مگر نقاہت اور کمزوری بہت تھی۔ ضرورت تھی کہ جب تک صحت بحال ہو قاہرہ میں قیام کریں، مگر ہندوستان کے مشاغل اور مصروفیتوں نے مزید قیام کی اجازت نہیں دی۔

واپسی کے وقت کافی تعداد میں علماء اور عمائدین مصر جو پہونچانے کے لئے تشریف لائے تھے، مصر کے عام قاعدہ کے مطابق ان کی خواہش ہوئی کہ پارٹی کا فوٹو لیا جائے۔ حضرت مفتی صاحب نے منع فرما دیا۔ علمائے مصر کا ایک گروہ فوٹو کو جائز قرار دیتا ہے۔ ان حضرات نے بحث شروع کردی۔ بحث مختصر مگر بہت دلچسپ تھی۔ سوال وجواب کے مختصر جملے اب تک ذہن میں ہیں۔ جہاں تک حافظہ کام کررہا ہے، سوال وجواب کے الفاظ یہ تھے:۔

علماء مصر	علماء مصر
التصویر الممنوع انما هو الذی یکون بصنع الانسان ومعالجة الایدی وهذا لیس کذالك انما هو عکس الصورة	ممانعت تو صرف اُس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کاریگری سے ہو۔ فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا، یہ تو صورت کا عکس ہوتا ہے۔
حضرت مفتی صاحب	**حضرت مفتی صاحب**
کیف ینتقل هذا العکس من الزجاجة الی الورق	یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے۔

علماء مصر

بعد عمل کثیر

بہت کچھ کاریگری کرنی پڑتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب

ایّ فراق بین معالجۃ الایدی وصنع الانسان والعمل الکثیر

انسان کے عمل، ہاتھوں کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے۔

علماء مصر

نعم ھو شیءٌ واحد

کوئی فرق نہیں، صرف الفاظ کا اختلاف ہے۔ مفہوم سب کا ایک ہے۔

حضرت مفتی صاحب

اذاً حکمھا واحد

لہٰذا حکم بھی سب کا ایک ہے۔

علمائے مصر حضرت مفتی صاحب کی حاضر جوابی سے بے حد متاثر ہوئے اور کچھ ایسے خاموش ہوئے کہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

اس سفر میں روحانی قوت، بیدارئ قلب، احساسِ فرض، حاضر جوابی کا جو مشاہدہ کیا اس کے علاوہ حضرت موصوف کی رقتِ قلب نے بھی مجھے متاثر کیا۔

واپسی کے وقت طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ خوب باتیں رہتی تھیں۔ بزرگوں اور اولیاء اللہ کے تذکرے بھی ہوتے تھے۔ میں بھی مدینہ طیبہ کی زندگی۔ مدینہ طیبہ کے علماء اور صلحاء اور جنگِ عظیم کے زمانہ میں اہلِ مدینہ کی پریشانیاں اور شریف حسین وغیرہ کے باعث جو انقلاب رُونما ہوا تھا اس کے واقعات بیان کیا کرتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ قلبِ حساس ہر واقعہ سے اثر لیتا تھا اور بسا اوقات رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بہرحال یہ مجلسیں بہت ہی پُر لطف اور سبق آموز تھیں۔ اس وقت دہلی پہونچ کر یہ مجلسیں ختم ہوگئی تھیں اور آج افسوس ہے کہ ان مجلسوں کا امکان بھی ختم ہو گیا۔

حلم وتواضع اور احترامِ اکابر

آپ کا حلم، سنجیدگی، تواضع، دوسروں اور بالخصوص اپنے سے بڑوں کا احترام ایسے نمایاں اوصاف ہیں جن کا مشاہدہ ہزاروں لوگوں نے سینکڑوں بار کیا ہوگا۔ مجھے اس وقت ایک خاص واقعہ یاد آرہا ہے۔ جو حضرت حافظ محمد یعقوب صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے مرادآباد میں بیان فرمایا تھا۔ جب کہ حافظ صاحب مرادآباد میں غریب خانہ پر قیام فرما تھے۔ اور رات کو اکابر اور بزرگوں کے تذکرہ سے ہم فرصت کے عزیز لمحات کو متبرک بنا رہے تھے۔ حافظ صاحب نے ہندوستان کے اکابر علماء کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب کا بھی ذکر فرمایا۔ اور آپ کے حلم اور تواضع کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ

بیان کیا جو ۱۹۱۹ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات پر پیش آیا تھا۔
حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے زیر علاج تھے۔ یہیں آپ کی وفات ہوئی۔ وفات کے بعد دیوبند جنازہ لے جانے کے بارہ میں اہل دیوبند اور اہل دہلی کے طبعی تقاضے مختلف تھے۔ فتویٰ اہل دہلی کی تائید کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت شیخ الہند رحمہما اللہ سے گفتگو کی نوبت آئی۔ حکیم صاحب کا غصہ مشہور تھا۔ وہ مفتی صاحب پر بہت خفا ہوئے۔ اور غصہ میں ایسے الفاظ بھی زبان سے نکل گئے جن سے مفتی صاحب کے حامیوں میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ حضرت مفتی صاحب نے فوراً مجمع کو سمجھایا کہ حکیم صاحب میرے استاد ہیں۔ ان کو اس سے زیادہ سخت الفاظ کہنے کا بھی حق ہے۔ اور یہ بھی حق ہے کہ اس مجمع میں میری گوشمالی کریں۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب کی زندگی کے واقعات اور آپ کے کمالات میری طاقتِ تحریر سے باہر ہیں۔ اس وقت تعمیل ارشاد کے لئے یہ چند سطریں درج کر دی ہیں۔

مفتیٔ دین

(از جناب سجاد صاحب قادری۔ ایم۔ اے۔ رُڑکی)

مفتیٔ دین و شانِ حُسنِ عمل — مجتہد العصر و عالم افضل
اب بھی ملتے ہیں تجھ سے لاکھ مگر — کوئی اُن میں نہیں ہے تیرا بدل
تیرے پُر نور چہرے کا جلوہ — تھا امینِ بہارِ صبح ازل
تیرا دل یوں تھا تیرے سینے میں — جیسے دریا میں کھل رہا ہو کنول
حسنِ اخلاق وہ ترے آگے — آئے دشمن تو آئے سر کے بل
خدمتِ مُلک اور ملت سے — تو نہ غافل ہوا کبھی اِک پل
تو نے فرمادیا جو بعد از غور — واقعی مستند تھا اور اٹل
مفتیٔ ہند کا لقب بے شک — ہے لیاقت کا تیری اچھا پھل
قادری کی دُعا ہے صبح و مسا — اب سر بارگاہِ ربِّ اجل

قربِ رحمت میں اپنے خاص جگہ
تجھ کو بخشے خُدائے عزّ وجل

(آمین)

فطری ذہانت و ذکاوت اور دورِ طالب علمی

(از جناب مولانا سید فخر الحسن صاحب اُستاد دارالعلوم دیوبند)

میرے والد بزرگوار جناب مولانا سید فیض الحسن صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مراد آباد میں میں نے اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ساتھ پڑھا ہے۔ غالباً حضرت مولانا احمد حسین صاحب امروہی جو کچھ عرصہ تک شاہی مسجد مراد آباد میں مدرس رہے ہیں اور حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ مراد آبادی (مغلپوری) سے ان دونوں بزرگوں نے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔

شرح وقایہ ایک کتاب مجھے یاد ہے ساتھ ہی پڑھی ہے۔ والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ سبق میں بالکل بے پرواہ ہو کر پیچھے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی سبق کے وقت بھی ٹوپی بنتے رہتے تھے لیکن سمجھ اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی مجھے ضرورت ہوتی اور کتاب سمجھ میں نہ آتی تو حضرت مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوتا۔ مفتی صاحبؒ کتاب کی بعینہٖ وہی تقریر فرما دیتے جو حضرت اُستاد سے سُنی تھی۔

حافظہ اور ذکاوت کی والد صاحب قبلہ بہت تعریف فرمایا کرتے تھے (حالانکہ خود والد صاحب بھی ذکی اور فہیم تھے) طالب علمی کے زمانہ میں حضرت مولانا محمد حسنؒ مراد آبادی ثم بھوپالی ناظم اوقاف ریاست بھوپال کے یہاں قیام تھا اور کھانا مولانا ممدوح کے یہاں کھایا کرتے تھے۔ یہ صورت حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے محترم اُستاد موصوف کے اصرار سے قبول فرمائی تھی۔ اُوپر کے خرچ کے لئے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بُن کر بازار میں فروخت فرماتے تھے اور نہایت خودداری کے ساتھ طالبِ علمانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔

مراد آباد مدرسہ شاہی مسجد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد باقی تعلیم حضرت مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں اُس زمانہ کے مایۂ ناز اساتذہ سے حاصل کی خصوصیت سے علم حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے حاصل کیا۔ اور اُسی دور سے وہ اپنے شیخ کی نظر میں سما گئے۔ دُنیا جانتی ہے کہ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے اس شاگرد رشید نے کس طرح علم اعلیٰ کردار اور حضرتِ اُستاد کے نصب العین کی تکمیل میں زندگی صرف کردی۔

حضرت مفتی صاحب کے یہاں بخاری شریف کے درس میں حاضری کا اتفاق خود راقم سطور کو بھی ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نہایت مختصر مگر جامع اور پُر مغز تقریر فرماتے تھے اور حنفیہ کے مسلک کو ایسے دلائل سے مدلل فرماتے تھے کہ سُننے والا یہ خیال کرتا کہ جب حنفیہ کا مسلک حدیثِ نبوی کے اس قدر مطابق ہے تو پھر دُنیا امام ابو حنیفہؒ کو متبعین قیاس میں کیوں شمار کرتی ہے۔

علم ادب میں اس قدر مہارت اور رسوخ حاصل تھا کہ آپ کے اشعار پر شعراء متقدمین کے کلام کا شبہ ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس احقر سے کسی یونیورسٹی کے امتحان کے لئے دیوان متنبی کا پرچہ سوالات مرتب کرایا۔ میں اپنے نزدیک بہترین سوالات عربی زبان میں لکھ کر لے گیا۔ اور بڑا خوش تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ پسند فرمائیں گے اور خوش ہوں گے۔ سوالات کو تو بہت پسند کیا لیکن اس کے ساتھ پہلی ہی نظر میں میری کچھ ایسی فحش غلطیوں پر متنبہ فرمایا کہ میری نظر نیچے سے اُوپر نہ اُٹھ سکی۔ ایک مرتبہ تبلیغ کے سلسلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے خورجہ ضلع بلند شہر کا سفر کیا۔ واپسی کے وقت احقر بھی ہمراہ تھا۔ مختلف مسائل علمیہ پر بحث و تذکرہ ہوتا رہا۔ اسی اثناء میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا تذکرہ بھی آگیا۔ اس وقت ان کے بارہ میں اس قسم کا چرچا بالکل نہ تھا جو آج ہے۔ یہ آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ آدمی بڑے ذہین اور ذکی ہیں، اب مطالعہ اچھا ہو گیا ہے، شروع میں جب یہ اخبار "الجمعیۃ" میں تھے تو ان کی عربی استعداد کچھ نہ تھی، اکثر جب میں بعد عصر دفتر الجمعیۃ میں جایا کرتا تھا تو عربی مسائل اور جرائد کی عبارتوں کا ترجمہ اور مطلب دریافت کیا کرتے تھے، پس عربی کی استعداد ان کی یہاں اخبار میں رہ کر اس طرح ہو گئی، آدمی بہت اچھے ہیں، لیکن بے استادے ہیں، کاش وہ کسی اُستاد کی خدمت میں باقاعدہ رہ کر علم حاصل کرتے، یہی وجہ ہے کہ ہر نئے مسئلہ میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔

اس سفر میں احقر نے دریافت کیا کہ فقہ میں کون سی کتاب مطالعہ کے لئے موزوں ہوگی، جس سے فقہ اور حدیث دونوں میں مدد مل سکے؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے بدائع صنائع کی بہت تعریف فرمائی اور فرمایا کہ بہت عجیب کتاب ہے۔ اور اس کی بہت سی خصوصیات ذکر فرمائیں، جن کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خواہش تھی کہ حضرت مفتی صاحب ان کی تحریک تبلیغ میں کچھ اپنا قیمتی وقت دے کر اس کو دیکھ لیں کہ یہ کام صحیح ہے یا نہیں، یہ کام حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے اس احقر کے سپرد کر رکھا تھا۔ احقر نے مختلف مجالس میں گفتگو کر کے حضرت مفتی صاحبؒ کو اس کے لئے تیار کر لیا، چنانچہ ایک جلسہ مدرسہ امینیہ میں مختصر سا ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ چونکہ اولاً اس تحریک کے بالکل مخالف تھے اس لئے حضرت مفتی صاحبؒ بادلِ ناخواستہ اُوپر کتب خانہ سے نیچے مسجد میں تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے کچھ تقریر فرمائی، پھر آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے تائید میں تقریر فرمائی، یہ اس سلسلہ میں پہلی تقریر تھی (یہ تقریر ملتان جیل سے واپسی کے بعد ہوئی ہے، جب مدرسہ کی مسجد نئی تعمیر ہو چکی تھی)۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں میوات اور دوسرے مقامات کے بھی

سفر فرمائے جن میں یہ احقر بھی شریک رہا کرتا تھا۔ یہ عجیب و غریب واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ ایک مرتبہ علاقہ میوات میں تشریف لے گئے۔ واپسی میں فتویٰ کے سلسلہ میں ایک شہادت دہلی کے کورٹ میں دینی تھی۔ عجلت کے خیال سے ایک صاحب اپنی کار میں لے کر روانہ ہوئے۔ یہ قریشی صاحب کے نام سے مشہور تھے اور آج کل پاکستان میں قیام فرما ہیں۔ راستہ کچا تھا۔ کار نے حضرت مفتی صاحب کی ضرورت کا احترام اس طرح کیا کہ ریت میں پھنس کر جلدی کے بجائے تین بجے دہلی پہونچایا جب کچہری کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو اس سفر میں اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ آپ کو افسوس اس کا تھا کہ وقت پر نہیں پہونچ سکے۔ تبلیغی جماعت کے مقصد کی اہمیت کو حضرت مفتی صاحبؒ پوری طرح محسوس فرماتے تھے، مگر فرمایا کرتے تھے ضرورت یہ ہے کہ اس میں سمجھدار اور صاحب اخلاص حضرات لگیں کہیں عوام تبلیغ کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر علماء سے بدظن نہ ہو جائیں۔ اس طرح علماء کے لئے فرمایا کہ ان کو اپنی اپنی جگہ اس کی اہمیت کا احساس کرنا چاہیئے اور اس کو کرنا چاہیئے۔ اس احقر کا قیام مدرسہ عالیہ فتح پوری میں تقریباً چودہ سال تک رہا ہے مجھ کو وہاں بلانے والے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے اس احقر کو وہاں سفارش تحریر فرما کر بھیجا تھا۔ اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جمعیۃ العلماء کے سالانہ اجلاس واقعہ امروہہ ضلع مُراد آباد میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس احقر کا ذکر فرما کر سفارش فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر فخر الحسن لائق ہے تو انشاء اللہ ضرور بلاؤں گا لیکن تعلق کی وجہ سے نااہل کے لئے کوشش نہیں کروں گا۔

غرضیکہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ والد صاحب کا بہت زیادہ خیال فرماتے تھے لیکن معاملات ان کے اس قدر صاف تھے کہ جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک اور ان کی زندگی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی معاملہ میں حَکَم اور ثالث نہیں بنتے تھے۔ یوں دہلی والوں کے گھریلو معاملات بھی بہت سے آپ نے اپنی زندگی میں سُلجھائے لیکن فریقین میں حَکَم بننا پسند نہیں فرمایا۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جب بھی دفتر جمعیۃ العلماء یا کسی دوسری جگہ چندہ کے لئے اہل شہر کا مجمع کیا گیا یا صرف اہل علم مجتمع ہوئے تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چندہ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے اور بڑی رقم سے امداد فرما دیتے تھے۔ مجھے پانچ سو تک کی رقم چندہ میں دینی یاد ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے اقدام سے علماء کرام کو تحریص ہوتی تھی اور دوسری جانب فائدہ یہ ہوتا تھا کہ تاجر اور اہل ثروت حضرات اس چندہ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب شاہجہانپوری نے باڑہ ہندو راؤ میں اپنے مکتب کے بچوں کے امتحان اور معائنہ کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ کو بلایا۔ مفتی صاحبؒ بچوں کا امتحان لے کر بہت خوش ہوئے اور ایک

بڑی رقم بچوں کے لئے انعام میں عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا (جس کی تعداد مجھے اس وقت یاد نہیں ہے) تیسری خصوصیت حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ تھی کہ جب کوئی دوست خورد و بزرگ مشورہ کے لئے حاضر ہوتا تو کبھی بھی یہ نہیں فرماتے تھے کہ ایسا کرلو، میرا یہ مشورہ ہے، ہاں البتہ ایک پہلو کے محاسن بیان فرما کر اشارۃً ایک پہلو کو بہتر قرار دے دیتے اور آخر میں فرماتے کہ بھائی اب تم کو اختیار ہے، جیسا چاہو اختیار کرلو۔

اب تقسیم ملک کے بعد کس قدر خاص خاص لوگ مشورہ لینے کے لئے گئے کہ حضرت کیا کریں، یہاں ہندوستان میں رہیں یا پاکستان چلے جائیں، یہاں یہ دقتیں اور پریشانیاں ہیں۔ فرماتے کہ بھائی میں تو یہاں ہی ہوں اور یہاں ہی انشاء اللہ مروں گا۔ تم جاتے ہو تو جاؤ اللہ حافظ ہے۔ اس جزئیہ سے آپ نے ان کے مشورہ دینے کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ بہرحال ان کی مخصوص زندگی کی بہت سی مخصوص باتیں ہیں یہ احقر بھی اگر ان کو لکھتا ہے تو ایک دفتر تیار ہو جائے گا۔ اُمید ہے کہ ان سے قریب اور حالات سے واقف لوگ ضرور ان پر روشنی ڈالیں گے۔ میں تو اس قدر جانتا ہوں کہ عالم کی موت سے تو عوام یتیم ہو جاتے ہیں لیکن مفتی صاحبؒ کی وفاتِ حسرت آیات سے علماء حق فقیہان دین اور مشائخ وقت یتیم رہ گئے۔ اب ان کے لئے بظاہر حال اُلجھے ہوئے مسائل میں رہنمائی فرمانے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام مرحمت فرما کر اپنی رضامندی کی دولت سے نوازے۔ آمین۔

قطعۂ تاریخ

(از جناب مولوی عبدالقیوم صاحب ارشق شیرکوٹی)

آج سدھارے خلد بریں کو ۔۔۔ مرشدِ برحق مفتیٔ اعظم
موت سے کس کی آہ ہوا ہے ۔۔۔ نظمِ عالم درہم برہم
فتویٰ لینے کس سے جائیں ۔۔۔ مسئلے کس سے پوچھیں گے ہم
کس کے مرنے سے برپا ہے ۔۔۔ مشرق سے مغرب تک ماتم
ہجری عیسوی دو تاریخیں ۔۔۔ ارشق نے لکھی ہیں باہم
سالِ غم ہے قول سے نکلا ۔۔۔ موت العالِم موت العالَم
۱۳۷۲ھ

بھر کر آہ کہا ہاتف نے ۔۔۔ ارم میں ہیں مفتیٔ اعظم
۱۹۵۳

موتُ العالِم موتُ العالَم

(حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مدظلہٗ)

مفتیٔ اعظم نمبر کے لئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایک خصوصی مقالہ لکھنا چاہتے تھے، لیکن گذشتہ ایک ماہ کی مسلسل علالت کے باعث موصوف کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔

حضرت مولانا کو مفتی اعظم سے جو گہرا اور خصوصی تعلق تھا، اس کے پیش نظر ہم حضرت مولانا کی ہدایت کے مطابق وہ پیغام درج کررہے ہیں جو اس سے قبل بھی الجمعیۃ میں شائع ہوچکا ہے۔

(ادارہ)

آہ حضرت العلامہ محمد کفایت اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کس قلم اور کس زبان سے یہ لکھوں اور یہ کہوں کہ آج دنیائے اسلام کی ایک مایۂ ناز ہستی اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئی، روح علم و تقدس نے ہم سے منھ موڑ لیا۔ علم و تقویٰ کا بحر ناپیدا کنار مسند افتاء کا مفتیٔ اعظم آج ہم سے جدا ہوگیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

طویل علالت کے دوران صبح و شام کی حاضری میں قلب مضطر کے لئے یہ منظر کس درجہ حسرت آمیز اور درد انگیز ہوتا تھا کہ ایک طرف مرض کی شدت و کرب اور دوسری جانب یادِ خدا اور رجوع الی اللہ کا رقت انگیز جذبہ کارفرما تھا۔ مفتی صاحب کی ذات ستودہ صفات ایسی جامع اور کامل تھی کہ اجتماعی و انفرادی شعبہ ہائے حیات کا ہر پہلو جس میں نمایاں نظر آتا تھا۔

جنگ آزادی کا راہنما، قانونی اور دستوری معاملات کا بہترین مدبر و مفکر، مسند علم کا متبحر، جادۂ عمل کا پیکر، تقویٰ و تقدس کا امام اس مجموعہ حسنات کا دوسرا نام "کفایت اللہ" تھا۔ جس کے فیضان سے آج دنیا محروم ہوگئی۔

قلب حزیں میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ اس مردِ باخدا کی جدائی اور فراق کا تحمل کرسکے۔ اور نوکِ قلم کو یہ جرأت ہی کب ہے کہ آج اس مقدس ہستی کا مرثیہ کہہ سکے۔ اب درگاہِ باری میں یہی دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس مردِ حق آگاہ کو فردوسِ اعلیٰ نصیب فرمائے اور ان کے پسماندگان اور ہم جیسے مجروح قلب خدام کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ

دِل کو روؤں کہ یا جگر کو میں　　　میری دونوں سے آشنائی ہے

(از جناب مولانا سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصرؔ۔ خلف اکبر حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ مدیر رسالہ "دار العلوم" دیوبند)

آج سے بائیس تیئیس سال پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقفیت اس ماحول میں ہوئی جو مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری کے نفوس قدسیہ سے قائم تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنے وقت کے ان دو بے مثال عالموں میں گہرے، مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات قائم تھے جو اس وقت کی سردی اور گرمی کے باوجود ایک رفتار پر قائم رہے۔ ہر دو بزرگوں کے ان تعلقات کی بنیاد یہ تھی کہ دونوں سیدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور ازہر ہند دار العلوم کے فاضل تھے۔ دونوں مذہبی اور سیاسی عقائد میں فکر و مذاق کی یکسانیت رکھتے تھے۔ دونوں جمعیۃ علماء کے صف اوّل کے رہنما تھے۔ دونوں علم و فضل کے بحر بیکراں کے شناور تھے اور دونوں ایک دوسرے کی علمی اور عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری نے "اگر دعالم الدین والدنیا" کہہ کر مفتی صاحب کو خراج تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت و دوستی کا حق ادا کیا۔ ہمیشہ انکے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں ہمیشہ ذاتی معاملات میں انہیں خیر خواہانہ مشوروں سے مستفید فرمایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات (جون ۳۳ء) پر حضرت مفتی صاحب مرحوم نے سہ روزہ "الجمعیۃ" میں خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپرد قلم فرمایا تھا اور اس حادثہ عظیم پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کچھ ایسے وزنی اور وقیع الفاظ میں فرمایا تھا کہ آج تک میں اپنے قلب و دماغ میں ان کا اثر محسوس کرتا ہوں۔

آج سے پچاس سال پہلے (دار العلوم دیوبند کے انعامی جلسہ منعقدہ ۱۳۲۸ھ) سے پہلے کی بات ہے دار العلوم سے چند نوعمر فاضل نکلے۔ مولوی امین الدین صاحب۔ مولانا محمد انور شاہ صاحب۔ مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی اور مولانا حافظ محمد ضیاء الحق صاحب۔ ابتداءً ان حضرات نے مختلف مقامات پر کام کیا پھر اس ارادہ سے دہلی میں جمع ہو گئے کہ یہاں ایک مدرسہ قائم کریں گے اور فکر و نظر کی آزادی کے ساتھ دینی اور علمی خدمت انجام دیں گے۔ سنہری مسجد دہلی میں "مدرسہ امینیہ" کے نام سے انھوں نے چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا۔ مولوی امین الدین صاحب اس مدرسہ کے مہتمم قرار پائے۔ مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی ضیاء الحق صاحب مدرس اور مولانا محمد انور شاہ

صاحب صدر مدرس۔ دہلی میں اس وقت فتحپوری مسجد کا مدرسہ بھی قائم تھا۔ امینیہ کے قیام کے بعد فتحپوری مسجد کے مدرسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم۔ مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدرس بن کر آ گئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبدالسمیع صاحب رحلت فرما چکے ہیں۔ اس قافلہ کے صرف ایک مسافر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دیوبند میں موجود ہیں۔ انھوں نے ہی حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ہمیں سنایا کہ سنہری مسجد میں مفتی صاحب کس طرح درس دیتے تھے، مولوی امین الدین صاحب مدرسہ کا اہتمام و انتظام کس طرح کرتے تھے اور بے مائگی اور بے سروسامانی کے باوجود یہ حضرات کس طرح اپنے مقصد پر اکھٹے رہے، انھوں نے کتنی تکلیفیں جھیلیں مگر نہ ایک دوسرے سے جُدا ہوئے اور نہ اپنے مدرسہ کو خالص دینی مسلک اور سادہ و صاف زندگی کی راہ سے ہٹایا۔ امینیہ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا امین الدین مرحوم نے حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کو بھی اپنے پاس بلالیا تھا۔ امینیہ کے پاس اس وقت نہ کوئی عمارت تھی اور نہ چندہ، دفتر تھا اور نہ کتب خانہ، مطبخ تھا اور نہ دارالاقامہ۔ مگر یہ چند نوخیز علماء جنھیں مستقبل میں رازی و غزالی اور ابن دقیق العید، ابن حجر و ابن ہمام کی حیثیت اختیار کرنی تھی، روکھی سوکھی روٹیوں پر سنہری مسجد میں جمع رہے۔ دس اور پندرہ روپے ماہوار سے زائد کسی مدرس کی تنخواہ نہیں تھی اور یہ معمولی سی تنخواہ بھی قلت آمدنی کے باعث کئی کئی ماہ تک نہیں ملتی تھی۔ آج کے دور میں جب امیرانہ شان و شوکت اور بنگلہ، موٹر، فرنیچر، ریڈیو اور ٹیلیفون کے ساتھ چند تقریریں کرنے اور چند بیانات شائع کرنے کو بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قومی اور ملکی خدمت کہا جاتا ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے کے اس تصور کو کون سمجھ سکتا ہے کہ چند نوجوان، جن کی جبینوں میں مستقبل کی عظمت و کامیابی اور عظیم الشان شخصیت کا نور جھلک رہا تھا، روٹیوں سے محتاج، لباس سے محروم اور ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور مطلق بے مائگی اور تہی دستی کے ساتھ سنہری مسجد میں جمع تھے اور دینی علوم کی خدمت کے لئے اپنے دن رات ایک کر رہے تھے۔

مظفر نگر میں حکیم فتح محمد خاں صاحب، حضرت شاہ صاحب کی اس زندگی کے ایک شاگرد اب تک موجود ہیں علاج کے سلسلہ میں کئی دفعہ حکیم صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا اور اس دور کے کچھ حالات ان سے بھی سنے۔ حکیم صاحب کی یہ بات کبھی مجھے نہیں بھولتی کہ "اس وقت ادب عربی اور فنون میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کی قابلیت مسلم تھی اور دہلی میں انہی کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں شرح چغمینی پڑھنے کے ارادہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا مگر انھوں نے پیرانہ سالی کی وجہ سے اس محنت سے معذوری ظاہر کی۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ پھر میں سنہری مسجد میں شاہ صاحب کے پاس گیا اور یہ کتاب انہی سے پڑھی۔"

حضرت شاہ صاحب چند سال امینیہ میں رہے۔ پھر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تجویز پر دارالعلوم میں تشریف لائے مگر مفتی صاحب سے آخر دم تک بہترین تعلقات قائم رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے ۸ سال پہلے دارالعلوم سے جدا ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے تھے۔ اس ہجرت میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد صاحب۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت شاہ صاحب کے ہم قدم تھے۔ ڈابھیل آتے جاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب ایک دو روز امینیہ میں مفتی صاحب کے پاس ضرور قیام فرماتے تھے۔ یہ بات آج سے بیس بائیس سال پہلے کی ہے مگر تصور کی نگاہ اس منظر کو اب بھی دیکھ رہی ہے کہ صبح ۱۰ بجے حضرت شاہ صاحب کشمیری دروازہ میں امینیہ کی عمارت کے سامنے تانگہ سے اُترے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ مدرسہ کے مہمان خانہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آٹھ دس سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ مدرسہ کی بالائی منزل پر اپنے ایک کمرہ میں کتابوں اور کاغذوں کے ڈھیر میں عینک لگائے ایک صاحب کو بیٹھے دیکھا، قریب پہونچا تو یاد آیا کہ ابھی ایک دو سال پہلے انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں ان صاحب نے تقریر بھی کی تھی۔ ان صاحب سے کسی نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ بڑے شوق و محبت کے ساتھ یہ صاحب اُٹھے اور مہمان خانہ میں آ کر شاہ صاحب سے برادرانہ بے تکلفی مگر کمال متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملے۔ دوپہر کا کھانا مفتی صاحب کے لئے گھر سے آتا تھا مگر شاہ صاحب کی مہمانداری امینیہ میں ہوتی تھی اور مہمان خانہ ہی میں کوئی صاحب کھانا تیار کرتے اور دونوں دوست جمع ہو کر کھانا کھاتے۔ شاہ صاحب کو اپنے ذاتی معاملات میں مفتی صاحب کی رائے پر اعتماد کامل تھا۔ اپنے گھر کی ضروری باتیں بھی مفتی صاحب سے فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ کسی موقع پر شاہ صاحب کی اہل خانہ نے اپنی بچیوں کے لئے کچھ زیور اور کپڑے مہیا کرنے کی فرمائش کی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی پہونچ کر حضرت شاہ صاحب نے مفتی صاحب سے اس کا ذکر فرمایا اور ان کا دانشمندانہ مشورہ حاصل کیا، دیوبند میں حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کے گھر پر تشریف فرما تھے۔ مکان سے متصل شاہ صاحب کی ایک افتادہ زمین تھی وہاں لے جا کر مفتی صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہاں ایک چھوٹا سا مکان مہمانوں کے لئے بنانے کا ارادہ ہے! مفتی صاحب نے انکار فرمایا اور شاہ صاحب نے پھر کبھی اس کا ارادہ نہیں کیا۔ ان واقعات سے دونوں کے باہمی تعلقات کی پختگی کا اندازہ کیجئے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب آخر زندگی میں بعض انتظامی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دارالعلوم سے الگ ہو کر ڈابھیل تشریف لے گئے تھے۔ جن مسائل میں انھیں ذمہ داران دارالعلوم سے

اختلاف تھا - ان میں ایک یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں کارگذار ارکان جمع کئے جائیں۔ حضرت شاہ صاحب نے حضرت مفتی صاحب حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ممبری میں لینے کا واضح الفاظ میں مطالبہ فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے اعتدال فکر، سنجیدگی و متانت، حق گوئی اور مختلف الخیال افراد کو باہم جمع کر لینے کی صلاحیت میں مشہور ہیں۔ ان کی ان صفات کا بڑا اچھا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے اس زمانۂ اختلاف میں ہوا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں - ایک طرف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے بھی ان کے تعلقات تھے اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحب اور ان کی جماعت کے بھی وہ معتمد تھے، اختلافات کے اس زمانہ میں کئی بار دیوبند تشریف لائے۔ معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی اور کئی دفعہ بڑے ہولناک فتنوں کو اپنے تدبر و تفکر سے پیچھے ہٹا دیا۔ مگر معاملات میں جانبداری کی بو کبھی پیدا نہیں ہوئی - خالص تعمیری نقطۂ نظر سے دارالعلوم کے مفاد کی حفاظت فرمائی۔ شخصیات سے کبھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا - اور پھر دو مخالف طاقتوں سے اس طرح نباہ کی کہ حق گوئی کے باوجود دونوں کی نگاہ میں معزز و مکرم رہے - دنیاوی معاملات کا تجربہ رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ دو فریقوں کے درمیان حق گوئی کے ساتھ اپنی آزادانہ اور غیر جانب دارانہ رائے کو محفوظ رکھنا اور پھر دونوں کی نگاہ میں مقبول رہنا کتنا مشکل کام ہے -

مجھے یاد نہیں کہ یہ ملتان کی اسارت کے وقت کا واقعہ ہے یا گجرات کا - بہرحال حضرت مفتی صاحب جیل گئے - تحریک کشمیر کے سلسلہ میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لئے رنگون سے آئی ہوئی ایک امدادی رقم ان کے پاس تھی جو کئی ہزار پر مشتمل تھی جیل جانے سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادہ مولانا حفیظ الرحمان واصف کو تاکید فرمائی کہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کے پاس منتقل کر دی جائے وہ اس کے مصرف میں اسے خرچ کریں گے - اور واصف صاحب نے حکومت کی قید و بند سے بچ بچا کر آہستہ آہستہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کو بھیج دی -

یہ واقعہ بہت پرانا ہے - مگر بعض واقعات حافظہ میں اپنا اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ ماہ و سال کی گردشیں ان کی تر و تازگی کو فنا نہیں کر سکتیں -

دیوبند میں ملتان سے کھلا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں - آج دہلی روانہ ہو رہا ہوں - پرسوں صبح دہلی پہونچوں گا - یہ دو سطریں حضرت شاہ صاحب کے لئے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں، وسیع علمی مشاغل اور بے حد سنجیدگی و وقار کے باوجود مسکراہٹ

ان کے چہرہ پر کھیل گئی۔ فرط مسرت سے غنچۂ نورس کی طرح کھل کھل گئے۔ تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینیہ کے دروازہ پر علم وفضل کے یہ دو سرمایہ دار پر تپاک طریقہ پر ایک دوسرے سے ملے۔

حضرت مفتی صاحب نے عمر بھر کے ان تعلقات کی پاسداری اس حد تک فرمائی کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا چھوٹا بچہ "انظر" جب دہلی گیا تو اس کے ماہانہ اخراجات کا انتظام مفتی صاحب نے فرمایا۔ ماہ بماہ اسے اپنے پاس بلا کر خرچ کے لئے ضروری رقم دیتے رہے اور قدم قدم پر اس کی اصلاح و تربیت کا خیال رکھا۔ پھر جب کبھی انظر نے انہیں دہلی خط لکھا تو واپسی ڈاک سے جواب عنایت فرمایا۔ اس کی، اس کی والدہ اور بہن بھائیوں کی خیریت اور حالات دریافت فرماتے رہے۔

دنیا کی بے ثباتی اور فنا پذیری، موت کی گرم بازاری اور دردناک سانحات کی کثرت نے ولولۂ حیات کو سرد کر دیا ہے۔ کہنا چاہیئے کہ دل بالکل مر گیا ہے۔ طبیعت بجھ گئی ہے۔ اب نہ جینے کی آرزو ہے اور نہ اسباب زندگی کا شوق۔ جن بزرگوں کے زیر سایہ زندگی کی آنکھ کھولی اور جوانی کا قدم اٹھایا تھا۔ جن کے دامن علم وفضل پر ہمارے بچپن نے شوخیوں کی اجازت پائی تھی اور جن کے تفریحی کلمات، حوصلہ افزا اور محبت آمیز لفظوں سے ہم بے شعوروں، ناسمجھوں اور نامرادوں نے کام کرنے کے ولولے حاصل کئے تھے۔ آج ان میں سے کتنے نکہت گل کی طرح فضائے چمن میں بکھر کر رہ گئے ہیں۔ کتنے شہاب ثاقب کی طرح آسمان سے نیچے گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ کتنے شمع سحر بن کر بجھ گئے ہیں۔ کتنے آفتاب سرکوہ کی طرح ڈوب گئے ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی اگر انسان اپنے دل کو زخمی اور مجروح نہ پائے تو اور کیا ہو؟ سچ کہا ہے حفیظ جالندھری نے کہ

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ
دنیا چلی گئی مری دنیا لئے ہوئے

آج دل غم زدہ اپنے بزرگوں کے مزارات پر، ہجر و فراق کے آنسو بہا رہا ہے۔ نگاہیں ایثار و تقویٰ کے ان بلند میناروں کو ڈھونڈتی ہیں جن کی بدولت اس آتش زار حیات میں سایہ تھا، چھاؤں تھی، خنکی تھی اور راحت تھی۔ ادھر حضرت مولانا انور شاہ کا علم وفضل یاد آتا ہے۔ ادھر مولانا شبیر احمد عثمانی کی رعد آسا آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اب تک ہمارے درمیان ہی میں موجود ہیں۔ دارالعلوم کے جلسۂ شوریٰ میں اب پھر کسی قریبی تاریخ میں وہ مولانا حفظ الرحمن اور مولانا مفتی عتیق الرحمن کے ساتھ ان کی کار میں تشریف لائیں گے۔ کار دارالعلوم کے احاطہ میں آکر رکے گی اور مفتی صاحب اپنے پُروقار انداز میں لمبے لمبے قدم زمین پر رکھتے ہوئے میرے دفتر کے سامنے سے گذر کر دارالمشورہ میں تشریف لے جائیں گے۔ ہائے موت کے سخت گیر ہاتھ نے ہم سے بہت بڑی دولت چھین لی۔ ایک ایسا شخص ہم سے

جدا ہوگیا جس نے معمولی سی چٹائی پر بیٹھ کر دین و شریعت کے مسائل سلجھائے، حکمت و سیاست کی گرہیں کھول دیں، معاملات کی پیچیدگیوں کو سلجھا دیا، جو خاموش رہ کر صرف اپنے شخصی اثر اور ذاتی وجاہت سے مسائل کو ان کی اصل ضرورت کے معیار پر حل کر لیتا تھا، حق تعالےٰ ان سے راضی ہو کہ انھوں نے اللہ کے دین کے لئے بڑی محنت کی اور پرایوں سے نہیں اپنوں سے بھی دکھ اٹھائے۔

ایک تاریخی اور ادبی نکتہ

(از جناب مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف)

آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر کی تاریخ وفات

بُجھا ہے چراغِ دہلی
۱۲۷۹ھ

کہی گئی تھی۔

حکیم اجمل خاں مرحوم کی تاریخ وفات کسی نے کہی تھی:-

دلّی کا چراغ گُل ہوا ہے

حضرتِ مفتی اعظم کی تاریخِ وفات مولوی مقبول الرحمٰن خیال سیوہاروی نے نکالی:-

ہوگیا گُل آہ دہلی کا چراغ
۱۳۷۲ھ

یہی مادۂ تاریخ لوحِ مزار پر لکھوایا جا رہا ہے۔

قطعۂ تاریخ

(از جناب ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب خوشتر میونسپل کمشنر - کھنڈوہ - ایم - پی)

رہبر وہ قوم کے تھے سیاست میں لاجواب
اس دور میں تو انکی ضرورت تھی بے حساب

سچ پوچھئے تو رونقِ بزمِ وطن تھے وہ
اِک یادگارِ عظمتِ دورِ کُہن تھے وہ

خوشتر نکلنے پائے نہ تھے دل کے حوصلے
محفل سے اپنی مفتئ اعظم ہی چل بسے
۱۹۵۲ء

زہد۔ تقویٰ۔ سادگی۔ اصابت رائے وقومی انہماک

(از جناب مولانا عمر دراز بیگ صاحب مینجنگ پروپرائیٹر ڈیلی جدت مراد آباد)

راقم الحروف نے حضرت مفتی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تین زمانوں میں خصوصیت کے ساتھ معائنہ کیا ہے۔ میں ہر زمانہ کے مختصر حالات اس مختصر صحبت میں سپرد قلم کرتا ہوں۔

ابتدائی دور جمعیۃ علماء ہند جمعیۃ علماء ہند کا قیام جب عمل میں آیا تھا اس وقت اس کا دفتر بلیماران میں[1] ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل میں تھا۔ یہ مکان دفتر الجمعیۃ کے بالکل سامنے ہے۔ اس وقت مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ تھے۔ مجھ کو جمعیۃ علماء سے روز اول سے دلچسپی رہی ہے۔ اس بناء پر دہلی کی ایک ملاقات میں حضرت مفتی صاحب و مولانا احمد سعید صاحب نے مجھ کو جمعیۃ علماء کی خدمات انجام دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس مشورہ پر میں جمعیۃ کی خدمات آنریری طور پر انجام دینے لگا۔ میرا قیام دفتر جمعیۃ میں ہی تھا۔ اس زمانہ میں میں نے حضرت مفتی صاحب کے عزم راسخ۔ اتقاء۔ اصابت رائے کا بچشم خود معائنہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب مدرسہ کی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ فتاویٰ نویسی کا کام بھی کرتے تھے۔ اپنے کتب خانہ کی دیکھ بھال بھی ان کے ذمہ تھی۔ اور اس کے ساتھ جمعیۃ علماء کے دفتر میں روزانہ تشریف بھی لایا کرتے تھے۔ اور مجھ کو ضروری ہدایات دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات مفتی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اراکین جمعیۃ کی توسیع و تنظیم پر غور کرتے تھے۔ میں مضطربانہ شان میں حضرت مفتی صاحب سے عرض کیا کرتا تھا کہ علماء مختلف عقائد میں بٹے ہوئے ہیں جن کو ایک سطح پر لانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ مفتی صاحب نہایت استقلال و عزم راسخ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ مرزا صاحب۔ دیکھیے یہ خدا کا کام ہے علماء جمعیۃ کے ساتھ ضرور آجائیں گے۔ اور انشاء اللہ جمعیۃ ایک دن سارے ہندوستان پر حاوی ہو جائے گی۔ چنانچہ دور حاضرہ میں جمعیۃ ہی مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جس پر مسلمان بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ اپنے دینی و دنیوی مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ جمعیۃ کی حضرت مفتی صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ روز روشن کی طرح ہویدا ہیں۔ اور اس کی تفصیل و توضیح اس مختصر وقت میں کسی طرح بیان نہیں کی جا سکتی۔

مؤتمر اسلامی مکہ معظمہ کا سفر حضرت مفتی صاحب کی اعلیٰ قابلیت کا ہندوستان کے علماء و عامۃ المسلمین نے تو اچھی طرح مطالعہ کیا ہی ہے۔ مؤتمر اسلامی کے اجلاسوں میں

[1] جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے بعد کافی عرصے تک اس کا دفتر مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی اعظم کے کمرے میں رہا۔ (واصف)

عالمِ اسلام کے وفود پر مفتی صاحب نے اپنی نکتہ سنجی، اعلیٰ قابلیت، تبحرِ علمی کا سکہ جما دیا تھا۔ میں بھی اس وفد میں مکہ معظمہ گیا تھا۔ موتمر اسلامی کے تمام ہی اجلاسوں میں شرکت کی تھی جس قدر بھی مسائل آئے تھے۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی جیسے مسلم لیڈر بھی حضرت مفتی صاحب سے مشورہ کرتے تھے۔ قبّوں کو ابنِ سعود (شاہ حجاز) نے چونکہ گروا دیا تھا۔ اس پر جمعیۃ کے وفد نے اعتراض کیا تھا۔ ابن سعود نے کہا کہ ہمارے علماء سے اس پر بحث و مباحثہ کر لیجئے۔ چنانچہ جمعیۃ کے وفد اور سعودی علماء کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی و حضرت مفتی صاحب نے احادیثِ نبوی کی روشنی میں اپنے دلائل و براہین سعودی علماء سے منوا لئے۔

مدینہ منورہ ہم سب اونٹوں پر گئے تھے اور اس وقت بسیں نہ تھیں نہ موٹر تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب چونکہ فربہ زیادہ تھے۔ اس لئے اونٹ پر ان کے جیسے وزن کا کوئی دوسرا ساتھی نہ ملتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لئے پالکی تیار ہوئی۔ مگر راستہ کی منزلوں میں خلافت کمیٹی و جمعیۃ علماء کا وفد ایک ساتھ ہی قیام کرتا تھا۔ منزلوں پر کھانے پکانے کا انتظام ہوتا تھا۔ اس نظم میں حضرت مفتی صاحب بعض معمولی کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔ جس سے ان کی سادگی کا پتہ چلتا تھا۔ مفتی صاحب اپنے مکان پر بھی بعض گھریلو کام خود انجام دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ انھوں نے اپنے دولت خانہ پر مجھے چائے پر مدعو کیا۔ میرے سامنے کچھ چیزیں خود تیار کیں۔ حضرت مفتی صاحب میں قدرت نے بیک وقت بہت سے اوصاف جمع کر دیئے تھے وہ قوم و ملک کے فدا کار بھی تھے اور بہترین مدرس بھی، مفتیٔ اعظم بھی تھے اور حد درجہ مفکر و مدبر بھی۔ وہ اہل قلم بھی تھے اور گھریلو کاموں کے منتظم بھی۔ وہ متقی بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی۔ آپ کے اتقا کا حال یہ تھا کہ اپنے رفیقوں سے جیل میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ قیدی جو ہماری خدمت کے لئے مامور کئے گئے ہیں ان کا حق المحنت ہمیں ادا کرنا چاہیئے اگرچہ گورنمنٹ نے انہیں ہماری خدمت کے لئے مقرر کیا ہے۔ مگر ہمیں بغیر اجرت کام نہ لینا چاہیئے۔ سب جیل والوں کے ساتھ مفتی صاحب بہت بہتر اور مساویانہ برتاؤ فرماتے تھے اور عام قیدی حضرت مفتی صاحب کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ یہ جیل کا حال تو بطور جملہ معترضہ آ گیا۔ دراصل تذکرہ تھا موتمر اسلامی کے سفر کا۔ واقعی حضرت مفتی صاحب نے موتمر اسلامی میں وہ اہم خدمات انجام دی ہیں جن کی مثال دوسرے ممبران نے بہت کم پیش کی ہے۔ وقت بھی کم ہے۔ اخبار کے صفحات بھی محدود۔ پوری تفصیل اس سفر کی کہاں تک لکھی جا سکتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے اعلیٰ فہم۔ خداداد ذہانت۔ قابلِ رشک فراست۔ بے مثال تبحر علمی کا سرزمین عرب پر ڈنکا بجا دیا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس مراد آباد جمعیۃ علماء کا جو شاندار اجلاس مراد آباد میں منعقد ہوا تھا حضرت مفتی صاحب

نے اجلاس کے زمانہ میں غریب خانہ پر ہی قیام کیا تھا۔ اس زمانہ میں مجھ کو مفتی صاحب کی محنت۔ علمی تبحر۔ سیاسی غور و فکر کو اچھی طرح دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مفتی صاحب صبح سے رات کے دو بجے تک حد درجہ مصروف رہتے تھے! اجلاسوں کی شرکت، اجلاسوں کے لئے تجاویز کا مرتب کرنا اصل کام تھا۔ مگر اس کے ساتھ راتوں کو اجلاس کے اختتام پر مقدس علمائے کرام کے پاس جانا اور ان کی خبرگیری کرنا ضروریات کو دریافت کرنا، یہ کام بھی حضرت مفتی صاحب انجام دیتے تھے۔

تجاویز (رزولیوشن) بنانے میں حضرت مفتی صاحب کو حد درجہ ملکہ تھا۔ بڑے بڑے لیڈر رزولیوشن کے معاملہ میں اپنے تنازعات مفتی صاحب سے ختم کرایا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے جامع مسجد دہلی کے سامنے بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا سر شفیع صاحب (پنجاب) اور مولانا محمد علی صاحب کے درمیان کسی رزولیوشن پر اختلاف ہوا۔ دونوں اصحاب نے رزولیوشن کو حضرت مفتی صاحب کے سپرد کر دیا۔ مفتی صاحب نے ایسے الفاظ میں رزولیوشن بنا دیا جس سے ملک کے یہ دونوں مسلمہ لیڈر مطمئن ہو گئے۔

چھوٹوں پر شفقت

اجلاس کے زمانہ میں ایک روز کھانے کے وقت فرمانے لگے۔ مرزا صاحب (مجھ کو حد درجہ شفقت کے ساتھ مرزا صاحب فرمایا کرتے تھے) یہ کھانا مہمان خانہ سے آتا ہوگا۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ نہیں یہ تو میرے گھر کا ہے۔ اس پر فرمایا۔ ہم آپ کو اس قدر زیر بار نہیں کرنا چاہتے۔ آپ جمعیۃ کی اس قدر تو خدمات انجام دیتے ہیں کہ رات دن ایک کر دیتے ہیں اور اپنی جیب سے خرچ بھی کریں۔ مگر میں نے وہی سلسلہ جاری رکھا۔ میری منشا اس واقعہ کے لکھنے سے صرف یہ تھی کہ مفتی صاحب اپنے خوردوں کا اور قومی ورکروں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ کسی کو تکلیف مالایطاق نہ دیتے تھے۔

اس مختصر صحبت میں حضرت مفتی صاحب کی اعلیٰ قابلیت۔ تدبر۔ فہم۔ فراست۔ ذکاوت۔ خدمت قومی۔ نکتہ سنجی کی تفصیل کسی طرح نہیں لکھی جا سکتی کس کس وصف کی طرح سرائی کی جائے۔ اب تو صرف ان کے لئے جنت الفردوس عطا ہونے کی دعا کرنی چاہیئے۔ اور انکے متوسلین کو انکی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہیئے اور بس۔۔

قطعہ تاریخ وفات

(نتیجہ فکر جناب ابوالوفا مولانا جلال الدین صاحب سابق مجسٹریٹ ٹونک۔ مرسلہ منظور الحسن صاحب برکاتی۔ ٹونک)

فکرِ تاریخ وفاتِ مفتی اعظم میں جب
ہر طرف برپا تھا شور و غل دیارِ ہند میں
اے زہے عزّ و شرف یہ غیب سے آئی صدا!
شمع افتا ہو گئی ہے گُل دیارِ ہند میں

۲ ۷ ۳ ۱ ھ

ملتان جیل میں حضرت مفتی صاحب کا علمی شاہکار

(از جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی فاروقی - امروہی)

مفتی اعظم نمبر کے لئے سوچتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس سے ایسی نزدیکی حاصل نہ تھی کہ میں ان کی سیرت کا تفصیلی مطالعہ کر سکتا۔ نہ ہی براہ راست معتدبہ عرصہ تک علمی استفادہ کا موقع مل سکا کہ میں ان کی زندگی کے کسی پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈال سکوں۔ ہاں جمعیۃ علماء کے کئی اجلاسوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا۔ مجلس مضامین میں ان کی باتوں کو سنا۔ ان کے متعدد فتاویٰ نظر سے گزرے۔ اور ان کی ذکاوت و ذہانت، تقویٰ و امانت اور معاملات کی صفائی کے واقعات دوستوں اور بزرگوں سے سنتا رہا۔ جس کی وجہ سے میرے قلب میں ہمیشہ ان کی عظمت و محبت جاگزیں رہی۔ سب سے پہلے ۱۳۴۹ھ میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے دستار بندی کے جلسہ میں ان کو دیکھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب مدظلہ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔

دستار بندی کے جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عام مجمع کے اندر بھی تقریر فرمائی تھی۔ میں اس وقت ابتدائی تعلیم پا رہا تھا۔ لیکن میں نے اس وقت حضرتؒ کی تقریری خصوصیت کا جو اندازہ لگایا تھا آخر تک درست نکلا۔ اور وہ یہ کہ اگر ان کی تقریر کو من و عن لکھ لیا جائے تو قلم بند ہونے کے بعد وہ ایک مستقل مضمون کی شکل میں نظر آئے حشو و زوائد کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ یہ بات مقررین میں بہت کم حضرات کو نصیب ہوتی ہے۔

دستار بندی کے جلسہ میں چونکہ جمعیۃ علماء کے صدر و ناظم دونوں تشریف لائے تھے۔ اس لئے اہل امروہہ نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ہم کی بات چیت ابتدائی درجہ میں ان حضرات سے کر لی تھی۔ بالآخر درخواست منظور ہوئی اور امروہہ کی سرزمین پر ایک تاریخی اجلاس حضرتؒ کی آمد کے طفیل میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد مراد آباد۔ جون پور اور دہلی کے جلسوں میں حضرت کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ جب ایک کتاب "نفحۃ العرب" کی طباعت کے سلسلہ میں دہلی گیا تو کتب خانہ رحیمیہ میں حضرتؒ سے یہ مشورہ لینے حاضر ہوا تھا کہ کتاب کا ٹائیٹل جو لکھوایا جائے تو کتاب کا نام کس طرز کا ہو۔ آیا سادہ رسم الخط میں یا طغرا کے طریقہ پر۔ حضرتؒ نے کئی طریقہ پر نام اپنے دست خاص سے لکھ کر جس طرز کو تجویز فرمایا اسی کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔ کتاب کی کاپیاں میرے ہمراہ تھیں اپنی نظم کی کتابت کو ملاحظہ فرما لیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے بہ کمال مشاہدہ کیا کہ حضرتؒ نے ایک سرسری نظر تمام صفحہ پر ڈال کر فوراً ایک زبردست غلطی کا پتہ چلا لیا۔ اور اس غلط لفظ کو کاٹ کر حاشیہ پر صحیح لفظ بنایا۔ اور فرمایا کاتب نے اس مصرعہ میں "یناغی" غلط لکھ دیا ہے "یغانی"

ہونا چاہیئے۔ مصرع یہ ہے :۔

وکم بین حزا دیعانی غزالۃ

میری معلومات بہت محدود ہیں لیکن اس ناقص اور محدود معلومات کے مطابق اگر تمام اوصاف قلمبند کروں تو ایک مستقل رسالہ بن جائے۔ فی الحال مفتی اعظم نمبر میں شرکت کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ کی عربی نظم کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ نظم خود ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ نظم ملتان سنٹرل جیل کی یادگار ہے۔ یہ نظم عید کے موقعہ پر سنٹرل ملتان جیل میں لکھی گئی ہے۔ میجر فضل الدین اس نظم کے مخاطب ہیں۔ میجر فضل الدین کے متعلق خود حضرت مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ وہ عربی سے خوب واقف اور بہت قابل آدمی تھے۔ اس نظم کا جواب انھوں نے عربی نثر میں حضرت مفتی صاحبؒ کو لکھا تھا۔

ترجمہ سے پہلے اتنا اور عرض کردوں کہ اس نظم میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جس فصاحت و بلاغت کو استعمال فرمایا ہے اور جس موثر اسلوب سے اپنے جذبات کو ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اصلی نظم سے ہی ہوسکتا ہے۔ میں اپنے ترجمہ میں وہ تاثیر کہاں سے لاؤں جو عربی نظم میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

اصل نظم از دل خیزد بر دل ریزد کا صحیح صحیح مصداق ہے۔ سچ ہے۔ ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس نظم کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب ملتان جیل میں ہیں۔ عید آئی ہے۔ پوری رعنائی کے ساتھ۔ مسرت اس کے جلو میں ہے عیش و سرور اس کے ہم رکاب ہے لیکن تمام مسرت پاشیاں جیل کے باہر ہی باہر ہیں۔ جیل میں ایک ضعیف اور بیمار انسان اہل و عیال سے دور اعزا و اقربا سے مجبور بیٹھا ہوا ہے نہ وہ عید کی نماز با جماعت ادا کرسکتا ہے۔ نہ اپنے بیوی بچوں سے مل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں۔ جنھوں نے قید و بند کے مصائب جھیلے ہیں۔ قید کی حالت میں راحت کہاں لیکن اگر راحت کے ظاہری سامان مہیا بھی کر دیئے جائیں۔ تب بھی قلب کا وہ چین کہاں نصیب ہوسکتا ہے جو گھر بار کی یاد آوری میں برباد ہو کر رہ گیا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہزار اسباب راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آہی جاتا ہے خیال آشیاں پھر بھی

حضرت مفتی صاحبؒ میجر فضل الدین (جو کہ جیل کے افسر تھے) کو تہنیت عید بھیجتے ہیں اور اس میں اپنے

سچے جذبات کا بھرپور نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی حمیت اسلامی اور حریت طلبی اور اپنے بلند نصب العین کو ظاہر فرما رہے ہیں۔ اور اسی ضمن میں یہ بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ "الدین النصیحۃ" کو پیش نظر رکھ کر میجر فضل الدین کو بھی ضروری نصیحت فرمائیں۔ میں پچیس اشعار میں سے صرف چودہ کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔
شروع میں بطور تمہید چند اشعار ہیں جن میں میجر فضل الدین کو عید کی مبارکباد پیش کی ہے اسکے بعد فرماتے ہیں:

اذا العید یاتی المرأ والمرأ محتظٍ — باھلٍ ومغنیً اورث اللطف والھنا

جب عید آتی ہے ایسی حالت میں کہ انسان اہل وعیال اور گھر بار سے بھی محظوظ ہو رہا ہو تو بڑی خوشگوار و مسرت بخش ہوتی ہے

ولکنہ ان حل والسجن مؤصدٌ — علی المرأ لم یورث سوی الحزن والشجی

لیکن جبکہ عید اس حال میں آئے کہ انسان قید خانہ میں محبوس ومقید ہو تو عید سوائے رنج وغم کے اور کچھ نہیں ہو پاتی۔

وکم بین حر اذ یغانی غزالۃً — وبین المعانی محنۃ السجن والعنا

بہت بڑا فرق ہے اس شخص میں جو بیوی بچوں میں آزادانہ زندگی بسر کر رہا ہو اور اس شخص میں جو قید خانہ کی مصیبت جھیل رہا ہو۔

وکم بین حر قرّ عیناہ بالھوی — وبین اسیر یصطلی ضرمۃ النوی

بہت بڑا فرق ہے اس شخص میں جو من بھاتی چیزوں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہو اور اس شخص میں جو جدائی کی آگ سے ہاتھ تاپتا ہے

ولکننا قوم نلاعب بالظبی — ونقلی ظباء اذ تداعت الی الونی

لیکن ہم تلوار کی دھار سے کھیلنے والی قوم ہیں۔ ہم بگڑ جاتے ہیں غزال صفت بیویوں سے جبکہ وہ مداہنت کی دعوت دیتی ہیں۔

ونحن کرام نملک الخیر فی الندی — ونحن لیوث نحسم الشر فی الوغی

اور ہم شریف و نجیب ہیں داد و دہش کے وقت مال ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے اور شیر ہیں جو جنگ میں شر و فساد کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

ابینا اباء اللیث ذلّ التعبد — فلا سبۃ اخزی من الذلّ للعدی

ہم نے غلامی کی ذلت قبول کرنے سے شیر کی طرح انکار کر دیا۔ دشمن کے سامنے جھکنے سے زیادہ عار کی کوئی بات نہیں۔

حُبسنا واوذینا بغیر جریمۃ — فما ذنبنا الا الدفاع عن الحمی

ہم بلا کسی جرم کے قید کئے گئے اور ایذا دیئے جا رہے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ وطن عزیز سے دشمن کو نکالنا چاہتے ہیں

؎ بلوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے — کہ این مظلوم را جز بے گناہی نیست تقصیرے

وان غاشم عد الدفاع جریمۃً — فانا نری ھذا لک من سودد الفتی

اگر ظالم (انگریز) نے دفاع کو جرم قرار دیا ہے تو ہم اس کو عین عزت خیال کرتے ہیں۔

وان خاننا الدھر الغشوم فلا تکن — ید الخون واقفُ حقا اذا انجلی

اگر ظالم اہل زمانہ نے ہمارے ساتھ خیانت کی ہے تو اے فضل الدین جب حق تمہارے سامنے واضح ہو گیا ہو تو خائن کے مددگار نہ ہو۔

فانت کریم ابن الکریم و لم نجد | کریما معینا للذی جار و اعتدیٰ

تم کریم ابن کریم ہو اور ہم نے کسی کریم شخص کو ظالم و جابر کا معین و مددگار بنتے نہیں دیکھا۔

نری الاسر للحر الوفی کرامۃ | و ان کان رجزا للمواقع فی الخنا

ہم قید کو احرار کے لئے کرامت تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی مجرم کے لئے قید عذاب ہوتی ہے۔

وما السجن للمظلوم الا عطیۃ | یمن بہا المولیٰ علی عبدہٖ اصطفیٰ

جیل خانہ مظلوم کے لئے ایک عطیہ ربانی ہے۔ جس کو وہ اپنے کسی منتخب بندے کو ہی عطا کرتا ہے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں | یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

(ایضاً) شہپر زاغ و زغن زیبائے قید و بند نیست | ایں سعادت از پئے شہباز و شاہیں کردہ اند

فیارب تثبیتا و صبرا علی البلا | و یارب عونا و انتصارا من العدیٰ

اے اللہ! ہمیں ثابت قدم رکھ اور بلاؤں پر صبر نصیب فرما۔ ہماری مدد فرما اور دشمنوں سے ہماری طرف سے خود ہی انتقام لیلے۔

قطعہ سوانح حیات و تاریخ وفات حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ

(از مولانا قاری ثروت حسین صاحب ناظم مکتبۂ اسلامیہ و مدرسہ فیض عام سیوہارہ)

بود دہلی مسکنش شاہ جہاں پور زاد بوم | دفن نزد قطب عالم قطب دین قطب العلوم

فیضیاب از بحر شیخ الہند محمود الحسنؒ | مفتیٔ اعظم بہر فن بود ماہر بالعموم

مہر رخشان علومش از امینیہ بتافت | طالباں را شمع فضلش بود باعث للہجوم

پیکر ایثار حق پروانۂ شمع ہدیٰ | لم یخف فی اللہ حینا جور سلطان ظلوم

بود او وقت ظہور اختر کمال و نیک زیست | رحلتش واضح شود از خاتم فقہ علوم

۱۳۷۲ھ

دیگر

آں مفتیٔ دین مبیں | شد با ملائک ہم نشیں

ثروت بگو تاریخ او | زینت دہ خلد بریں

۱۳۷۲ھ

دیگر

چل دیئے حیف مفتیٔ اعظم | جامع صد کمال عقل و نقل

ہاتف غیب نے کہی تاریخ | بجھ گئی آہ آہ شمع فضل

۱۳۷۲ھ

جامع اوصاف بزرگ

(از مولانا ضیاء الحق صاحب دہلوی مدرس مدرسہ امینیہ ۔ دہلی)

میں یوں تو ۱۹۳۶ء میں کالج چھوڑنے کے بعد ہی حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ عاطفت میں آگیا تھا مگر زیادہ قریب سے دیکھنے اور ساتھ رہنے کا موقع ۱۹۴۴ء میں نصیب ہوا جبکہ دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوکر حضرت رح سے فتویٰ نویسی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ میں تقریباً نو سال حضرت کی خدمت میں رہا۔ میں نے ان نو سالوں میں کیا کچھ دیکھا اسے تو احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ کیونکہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ تھا جو حضرت نے چھان نہ ڈالا ہو اور ترقی کا وہ کونسا زینہ تھا جو آپ نے چڑھ نہ لیا ہو۔ میں نے تو حضرت کو ایک ایسا خزانہ پایا کہ جس میں سے ہر ضرورت مند اپنی ضرورت کی چیز بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ پا سکتا تھا ــــــ!

آج دنیا آپ کو ایک مفتی، فقیہ اور بہترین مدبر کی حیثیت سے جانتی ہے یہ تو ہے ہی کہ آپ الجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں اس طرح سلجھا دیا کرتے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ قدرت نے آپ کو وہ علمی کمال دیا تھا۔ اور وہ ذہانت و فطانت عطا فرمائی تھی کہ بہت کم لوگوں کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے عالم آپ کے سامنے سرنگوں بیٹھے رہتے تھے۔

ہند اور پاکستان کیا بر اعظم ایشیا کے مسلمان اگر بھروسہ کرتے تھے تو حضرت رح کے قلم پر اور بے چون و چرا اگر مانتے تھے تو حضرت رح کا فتویٰ۔ اور کیوں نہ ہو آپ کے قلم نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھکر یا کسی ماحول سے متاثر ہوکر کبھی لغزش نہ کھائی۔ اور آپ کا دل و دماغ کبھی کسی کی حیثیت یا رائے سے مرعوب نہ ہوا۔ بات کی تہ تک پہنچنے کا آپ میں خاص ملکہ تھا۔ اس لئے مستفتی الٹی سیدھی باتیں بناتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ دل کا چور آپ فوراً پکڑ لیتے تھے۔ جو جواب ایک مرتبہ لکھدیتے تھے اس میں مستفتی کے کہنے سننے سے کبھی ایک لفظ کی بھی تبدیلی نہ کرتے تھے۔ اکثر حضرات کو دیکھا ہے کہ فتویٰ کا جواب وعظ کے طرز میں دیا کرتے ہیں۔ میں خود بھی اس مرض میں مبتلا تھا۔ حضرت رح کو اس بات سے بڑی کوفت ہوتی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ فتوے کی جگہ اور وعظ وعظ کی جگہ مناسب ہے۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ اجتہادی قوت اور ملکہ ہونے کے باوجود آپ پکے مقلد اور حنفی المسلک عالم تھے۔ اس مسلک سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے باریک بینی اس درجہ کی تھی کہ حدیث اور فقہ کی چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں سے بیسیوں معانی و مطالب و مسائل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ علماء حیران رہ جاتے تھے۔ مجھے ایک سال تک متواتر حضرت کے درس بخاری و ترمذی میں بیٹھنے کا شرف نصیب ہوا۔ آپ کی تقریر نہایت مختصر اور جامع ہوتی تھی۔ آپ سے دورۂ حدیث پڑھنے سرحد و پنجاب کے طالب علم زیادہ

آتے تھے۔ ویسے جاوا، سماترا، بدخشاں اور حجاز کے طالب علم بھی شریک درس رہتے تھے۔ طالب علموں کے بے جا سوال اور ان کی دور از کار بات پر آپ اکثر "دلدّر" کہا کرتے تھے۔ گاہ بگاہ طالب علموں سے مذاق کر لیتے تھے۔ مگر مذاق نہایت پاکیزہ اور لطیف ہوتا تھا۔ کیا حدیث، کیا فقہ، کیا ادب، کیا منطق و فلسفہ ہر فن میں آپ تیرے ہوئے تھے۔ بڑی تنخواہوں پر آپ کو مختلف درسگاہوں نے لینے کی کوشش کی، مگر آپ نے اس تھوڑی سی تنخواہ پر جو مدرسہ امینیہ سے ملتی تھی قناعت کی اور ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا کہ محض روپے کی خاطر میں امینیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

آپ کے توکل کا یہ عالم تھا کہ آپ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ مدرسہ کے لئے آپ کوئی اپیل شائع کر دیجیے تو آپ فرما دیتے تھے کہ بھئی خدا کا کام ہے وہ خود جب تک چلانا چاہے گا چلائیگا اور واقعہ یہ ہے کہ حضرتؒ کی اپیل کے بغیر لوگ افریقہ، امریکہ، اور ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ دیانت اور امانت کا یہ حال تھا کہ مدرسہ کا ایک ایک پیسہ نہایت احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ کبھی کسی کو انگلی رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی نے حساب فہمی کا مطالبہ نہیں کیا۔

خودداری کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی کسی کا احسان اپنے اوپر نہ رکھتے تھے۔ خیر یہ سب باتیں تو تھیں ہی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور کمالات آپ میں ایسے تھے کہ جو آپ سے قریب رہنے والوں ہی کو معلوم ہیں۔ دوسرے لوگ انھیں سن کر ششدر رہ جاتے ہیں۔

دنیاوی کاموں میں آپ کو بڑا تجربہ تھا۔ کھانا آپ بہترین پکا لیا کرتے تھے۔ کپڑا نہایت عمدہ کاٹ اور سی لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے تو اکثر خود ہی سیتے تھے۔ گھر کی صفائی کرنے اور برتن تک مانجھ لینے میں آپ عار محسوس نہ کرتے تھے۔ بازار سے دو پیسے کا سودا بھی خود ہی خرید لاتے تھے۔ آپ کو کوئی اجنبی تنکوں کی ٹوپی اوڑھے۔ کھڑاویں پہنے سادہ لباس میں پھرتے دیکھ کر کبھی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دنیا کی اتنی مقبول اور برگزیدہ ہستی ہے۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے اس لئے کسی کا کیا ہوا کام مشکل سی پسند آتا تھا۔

آپ معمولات کے بہت پابند تھے۔ وقت پر کھانا وقت پر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا۔ وقت پر لیٹ جانا۔ وقت پر بیدار ہونا۔ یہاں تک کہ وقت پر پان کھانا اور پانی پینا آپ کا معمول تھا۔ اسی لئے ضعیفی میں بھی آپ کی صحت بہت اچھی تھی۔

یکم اکتوبر ۵۲ء مطابق ۹ محرم ۱۳۷۲ھ کو طبیعت گرنی شروع ہوئی۔ مرض نے طول پکڑا۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے پوری توجہ اور پوری عقیدت مندی کے ساتھ علاج کیا۔ مگر جو مقدر تھا پیش آیا اور تین ماہ کی سخت علالت کے بعد ۳۱ دسمبر ۵۲ء مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو یہ علم و عمل کا چراغ گل ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی سادگی اور فتوے

(از جمیل الدین صاحب دہلوی)

میری قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ آپ کی کسی خصوصیت کے متعلق تحریر کر سکوں لیکن جس سادگی، خلوص اور ہمدردی کا نظارہ آنکھوں نے دیکھا ہے طبیعت مجبور کر رہی ہے کہ جس ٹوٹے پھوٹے انداز میں ممکن ہو اس کو پیش کر دوں۔

آپ نے جو علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ سیاسی اور مذہبی خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں لیکن آپ کی خدمات کا بڑا حصہ مذہب سے وابستہ رہا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جو نصب العین مقرر کیا تھا وہ صرف مذہبی تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو مذہب سے ایک خاص قسم کی وابستگی اور دلچسپی تھی۔ مذہبی حکم کے مطابق آپ نے انسانیت کو بھی سینہ سے لگایا اور ہر ایک کے ساتھ نہایت ہی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں آپ کا کوئی نام لیوا نہ ہو۔ آپ کی "تعلیم الاسلام" اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ آپ نے مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے پیش نظر ہی اسے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے چاروں حصوں کے مطالعہ کے بعد ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں الحمدللہ پکا مسلمان ہو گیا ہوں اور اس پر وہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ مجھے جب کبھی کسی مسئلے کے متعلق الجھن پیدا ہوئی ہے تو اسی کتاب نے راہ دکھائی ہے۔

مفتی صاحب نے مذہبی معلومات کے ساتھ ساتھ مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں پر خود سختی سے عمل کیا ہے۔ دنیا کی نعمتوں کو آپ نے مذہب کی خاطر ٹھکرا دیا اور ان سے کوسوں دور ہو گئے۔ طرز زندگی میں بھی آپ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ آپ نے ان کے ہر طریقے کو اختیار کر کے دلی محبت کا ثبوت دیا۔ جو لوگ مفتی صاحب سے اچھی طرح واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مفتی صاحب کے ہاں کتنی سادگی پائی جاتی تھی۔ آپ کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہ تھا جس میں سادگی نہ ہو۔ اسی وجہ سے جب میں نے مفتی صاحب سے پہلی ملاقات کی تو میں اتنی بزرگ ہستی کو پہچان بھی نہ سکا۔ آج سے تقریباً سات سال پہلے جبکہ ہندوستان کا بچہ بچہ آزادی کے لئے چلا رہا تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک خوب زور شور سے چل رہی تھی اور غیر لیگی علما کو سر بازار گالیاں دی جا رہی تھیں آپ کا احترام اس وقت بھی دلوں میں تھا اور ہمت نہیں ہوتی تھی کہ آپ کی شان میں گستاخی کی جائے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک امنگ پیدا ہوئی کہ مفتی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ اس وقت

نہ تو آپ کے مکان کا علم تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ آپ کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ ہاں صرف اتنا جانتا تھا کہ آپ "تعلیم الاسلام" کے مصنف ہیں۔ آخر دو سال کے بعد وہ وقت آیا جبکہ میری یہ آرزو پوری ہوئی یعنی ۱۹۴۰ء میں ایک کام کی غرض سے آپ سے ملنے گیا اور آپ کو مکان پر آواز دی۔ اس وقت میرے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ نہ معلوم آپ کیسے ہونگے؟ آپ کے ہاں کی محفل کیسی ہوگی؟ آپ کا رعب و دبدبہ کتنا ہوگا؟ لیکن اس وقت میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جبکہ آپ باہر تشریف لائے۔ آپ کا لباس نہایت ہی معمولی سفید رنگ کا تھا۔ سر پر ٹوپی اور پاؤں میں غالباً گھر ڈاوین تھیں اس حلیے میں آپ کو دیکھ کر میں بیوقوف یہ سمجھا کہ آپ مفتی صاحب کے ملازم ہیں۔ اُن سے میں نے کہا کہ "کیا مفتی صاحب اندر تشریف فرما ہیں"؟ آپ نے فرمایا "فرمائیے کیا کام ہے"۔ تب میں سمجھا کہ آپ ہی مفتی صاحب ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی شخصیت کا آدمی جس کی شہرت کے ڈنکے دنیا میں بج رہے ہوں اور جس کا نام دنیا عزت سے لیتی ہو اتنی سادگی سے زندگی بسر کر سکتا ہے، جبکہ انسان ذرا سی قابلیت ولیاقت کی وجہ سے ہی مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو نہ جانے کتنا بلند سمجھتا ہے اور نہایت ہی رعب و دبدبہ کے ساتھ زندگی گذارتا ہے۔ اس واقعہ نے میرے دل پر کافی اثر کیا اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر واقعی کوئی بزرگی کے لائق اور عزت کے قابل شخص ہے تو وہ آپ ہی ہیں اور آپ "مفتی" بالکل حق بجانب ہیں۔

جب بھی آپ سے کسی امر کے متعلق کوئی فتویٰ منگایا ہے تو آپ نے فتویٰ ارسال کرنے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اسے ہمیشہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے سرانجام دیتے رہے ہیں۔ آپ کے فتوے میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ فتویٰ نہایت ہی مختصر مگر ٹھوس سلیس زبان میں صادر کیا کرتے تھے جس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل فتوؤں سے بخوبی لگا سکتے ہیں:۔

(۱)

بلیک مارکیٹ کے متعلق شرع کیا کہتی ہے۔ یعنی بلیک کرنی جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ کسی حالت میں بھی جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آج کل آٹے و کپڑے پر راشن ہے تو اس کی بلیک کرنی جائز ہے یا نہیں مفصل تحریر فرمائیں؟

الجواب:۔ بلیک مارکیٹ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں مخلوق کے ساتھ ناانصافی اور بے رحمی ہے اور جھوٹ بولنا بھی پڑنے کا قوی امکان ہے۔

(۲)

بہت سے لوگ مہینوں کے خاص دنوں میں اللہ کے واسطے دینا زیادہ افضل سمجھتے ہیں، مثلاً

ماہ شعبان کی چودہ تاریخ کو ساہ محرم کی دس تاریخ کو۔ بارہ وفات کے مہینے میں بارہ تاریخ کو۔ تو کیا واقعی ان خاص دنوں میں دینا زیادہ ثواب ہے؟ یا ان مہینوں میں سے جا ہے جس دن دیا جائے۔ اور اکثر لوگ جمعرات کے دن خیرات دیتے ہیں تو اس دن خیرات دینا بہ نسبت اور دنوں کے کیا زیادہ ثواب ہے۔

الجواب:۔ خیرات کرنے کے لئے کوئی دن مخصوص نہیں۔ نہ جمعرات کی کوئی تخصیص ہے جب چاہے خیرات کر سکتا ہے۔ رمضان میں خیرات کرنے کی فضیلت ہے۔

(۳)

بہت سے لوگ کسی چیز کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے یہ کلمے کہتے ہیں کہ "اللہ محمدؐ کے سپرد" مثلاً کوئی خطرہ کی جگہ جاتا ہے تو اس کے عزیز و اقارب کہتے ہیں کہ "اللہ محمدؐ کے سپرد" یہ کلمات کہنے درست ہیں یا نہیں، اور کیا کہنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اللہ اور محمدؐ کے سپرد۔ یہ الفاظ نہ کہنے چاہئیں۔ صرف اللہ کے سپرد کہنا ٹھیک ہے۔

(۴)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے متعلق کہ فوٹو کھینچنا اور کھنچوانا شرعی نقطۂ نظر سے کیوں حرام ہے؟ جبکہ زید کہتا ہے کہ متحرک کو ہم ساکن کر دیتے ہیں یعنی شیشے میں دیکھنے سے جو ہماری صورت نظر آتی ہے اسے ہم مستقل کر دیتے ہیں تو وہ فوٹو کہلاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں حرام ہے؟ اور اس سے ایک یادگار بھی قائم رہتی ہے۔

الجواب:۔ تصویر بنانا اور اس کو استعمال کرنا شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دیا۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کا ایک طریقہ ہے۔ پس وہ ناجائز ہے۔ جبکہ اس سے جاندار کی تصویر بنائی جائے۔ ہاں مکانات اور غیر ذی روح مناظر کا فوٹو لینا جائز ہے جیسے کہ ان کی ہاتھ سے تصویریں بنانی جائز ہیں۔

شریعت مقدسہ نے جانداروں کی تصویریں بنانا اور فوٹو لینا ایک مصلحت سے حرام فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم اور توقیر کا شائبہ بھی مسلمانوں میں نہ رہے۔

ان اوصاف کو دیکھتے ہوئے اگر ہم مفتی صاحب کو اپنے زمانہ کا ولی کہیں تو مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی بلکہ بالکل درست ہوگی۔ مگر حیف آج آپ اس دنیا میں پہونچ چکے ہیں جہاں سب کو جانا ہے۔ آپ کے کوچ کر جانے سے جو نقصان عظیم دنیا کے مسلمانوں کو ہوا ہے اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

رحلت بوحنیفۂ ثانی

(از جناب مولانا عبدالقیوم صاحب آرشق شیرکوٹی)

آوخ آوخ کہ مفتیٔ اعظم — رخت بستہ ز عالمِ فانی

کاشفِ معضلات فقہ و حدیث — واقفِ نکتہائے قرآنی

فخر رازی و بیہقیٔ زماں — بوعلی و معلّمِ ثانی

عندلیبِ حدیقۂ اسلام — گلِ بستانسرائے ایمانی

عالمے آبروئے علم و عمل — عارفے رونق مسلمانی

متّکیٔ اریکۂ تحقیق — مسند آرائے بزم عرفانی

از جبینِ مبین او ساطع — لمعاتِ فروغ ایمانی

ذاتِ پاکش کہ منبعِ علم است — فیض بخشائے قاصی و دانی

سالکِ مسلکِ رضائے خدا — عارجِ سُلّمِ خدا دانی

آنکہ خاکِ درش بصیرت را — روکشِ سرمۂ صفاہانی

بود افتاء او مطابقِ شرع — بحدیث و نصوص قرآنی

از حریمِ فطانتش مے شد — اکتسابِ فنونِ سبحانی

کرد نہضت ازیں سرائے سپنج — پئے سیرِ ریاض رضوانی

شد غروب آفتابِ فضل و کمال — گشت تاراج گنجِ عرفانی

قدسیاں گشتہ اند خاک بسر — بوفاتِ امامِ ربّانی

دارالافتا شدست بیتِ حزن — مدرسہ مصدرِ پریشانی

از سمک تا سماک شورِ نشور — گشت برپا ز انسی و جانی

پئے سالِ وصال علامہ — دل محزوں نمود حیرانی

از سرِ حزن و درد آرشق گفت

رحلتِ بوحنیفۂ ثانی

۲ ۷ ۵ ۳ ۱

یادِ ایام

(از جناب مولانا محمد ظہور علی صاحب بھوپال)

۱۹۱۸ء ختم ہو رہا تھا۔ دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کانگریس کے صدر پنڈت مدن موہن مالویہ اور لیگ کے صدر مسٹر فضل الحق منتخب ہو چکے تھے۔ دونوں کی استقبالیہ کے صدر علی الترتیب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری رحمہم اللہ تھے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کا مطب اس زمانہ میں مسجد فتحپوری کے مشرقی دروازہ کے شمالی حصہ میں تھا۔ کبھی ڈاکٹر صاحب کے مطب میں اور کبھی حکیم صاحب کے دواخانہ پر غیر رسمی جلسے ہوتے تھے اور دونوں اجلاسوں کو کامیاب بنانے کے لئے غور کیا جاتا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر صاحبؒ کے مطب میں جناب حکیم صاحبؒ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور حاجی حافظ نور الدین احمد صاحب مہاجر، حاجی عبد الغفار صاحب (مالک کوٹھی حاجی علی جان صاحب) شیخ عبد اللہ صاحب آٹے والے، لالہ دیش بندھو گپتا، شعیب قریشی اور چند دوسرے بزرگ شریک تھے۔ راقم الحروف بھی حاضر تھا۔ باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ دونوں اجلاسوں کو کامیاب بنانے کے لئے حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو (جو اپنے علمی تبحر اور بے لوث سادہ زندگی کے لحاظ سے شہر میں بڑی عزت کے مالک ہیں اور اہل شہر پوری عقیدت کے ساتھ ان کے ارشادات کو مانتے ہیں) اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو (جو اپنی خوش بیانی سے سامعین کو مسحور کر لیتے ہیں) ان اداروں میں شریک کیا جائے تاکہ دونوں اجلاس زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو سکیں۔ اس وقت تک دونوں حضرات اگرچہ اپنا ایک سیاسی مسلک رکھتے تھے۔ لیکن عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات سے عرض کیا گیا اور دونوں عملاً شریک ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب چونکہ عام جلسوں میں زیادہ نہیں بولتے تھے اس لئے وہ تو کم لیکن حضرت سحبان الہند برابر اشاعتی جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کا خطبۂ استقبالیہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہی مرتب فرمایا تھا۔ جو اپنی اہمیت اور جامعیت کے لحاظ سے مسلم لیگ اور سیاسیات ہند کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔

اسی سال پنڈت نہرو نے الہ آباد وغیرہ سے پانچ سو کسانوں کو پہلی مرتبہ کانگریس کے اجلاس میں لاکر شریک کیا۔ جو قرول باغ میں ٹھہرائے گئے تھے۔ اس وقت قرول باغ دہلی سے بالکل علیحدہ تھا۔ اور

باڑہ ہندوراؤ سے قرول باغ تک کوئی آبادی نہیں تھی ۔ اس وقت حاجی حافظ نورالدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہمان نوازی اور اس کے متعلقہ انتظام میں ایک مسلمہ شخصیت سمجھے جاتے تھے چنانچہ کانگریس اور لیگ دونوں حافظ صاحب کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں ۔ لیکن کافی بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ لیگ کا کام حاجی عبدالغفار صاحب بہ مشورہ حافظ صاحب انجام دیں ۔ اور قرول باغ میں کسانوں کی خدمت وتواضع کا کام حافظ صاحب انجام دیں ۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے تھے اور پورے انہماک سے حصہ لیتے تھے ۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۲ء تک دہلی میں کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حضرت مفتی صاحب کی رہبری پوری صداقت وصفائی کے ساتھ نظر نہ آئے ۔ اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی راست بازی اور استقامت کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں لیکن کبھی مرحوم کا قدم مبارک صراط مستقیم سے نہیں ڈگمگایا ۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے عقیدۂ سیاسی کی بدولت چند بار جیل بھی جانا پڑا لیکن ان کو غالباً انفرادیت کا ممتاز درجہ حاصل ہے کہ کبھی جیل جاتے کے وقت یا رہائی کے وقت نہ تو کوئی جلوس نکالا گیا اور نہ نعرے لگائے گئے ۔ ورنہ وہ اس طبقہ کے بزرگوں میں سے تھے ۔ اگر پسند فرماتے تو صرف دہلی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی فضا آپ کے لئے نعروں سے گونج اٹھتی ۔ وہ اگر چاہتے تو اپنی اس پوزیشن سے مختلف طریقوں سے فائدہ حاصل فرماتے لیکن انہوں نے کبھی اپنے کام کو اپنے لئے اشتہار نہیں بنایا ۔

آج کی جمعیۃ العلماء، مرحوم کی سیاسی ومذہبی اعلیٰ بصیرت اور فداکاری کی زندہ نشانی ہے ۔ مرحوم تقریباً بیس سال تک اس کے صدر ایسے وقت میں رہے جبکہ جمعیۃ کا نام لینا بھی خطرناک اور ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا ۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ غالباً آخری مرتبہ اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے جو امرت پتریکا کے رسوائے عالم فعل پر اظہار نفرت کے لئے اردو پارک دہلی میں ۱۴ اگست ۵۲ء کو منعقد ہوا تھا ۔

مفتی اعظم نمبر کے مضامین ختم ہوئے ۔

الوداع

(از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند)

مفتی اعظم نمبر دل بہلانے کا اچھا مشغلہ تھا وہ ختم ہوا تھا تو بقایا مضامین کے سلسلہ سے دل بہلایا گیا۔ آج یہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ اب دعاء مغفرت اور ایصال ثواب ہی وہ مرہم ہے جس سے زخم فراق کو مندمل کیا جا سکتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے اس میں عوام کی زبان سے نہیں بلکہ ان خواص کی زبان سے جو دور حاضر کے قابل اعتماد و پاکباز مانے جاتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق چند شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان سے حضرت مفتی صاحب کے روحانی مدارج اور اخروی مراتب کا اندازہ ہو سکتا ہے مثل مشہور ہے:۔ "زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" رضی اللہ عنہ۔ وطاب مثواہ وقدس سرہ

تقریباً نو ماہ بیشتر حضرت مفتی صاحب کی زبان مبارک سے چند کلمات صادر ہوئے تھے، وہ میرے دل و دماغ سے آج تک محو نہیں ہوئے اور نہ کبھی محو ہو سکتے ہیں اور یقین ہے کہ سوانح نگار و مورخین بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے اور اس فروتنی اور انکسار، خوف و خشیۃ اور اپنے نفس سے بدظنی کا بہترین نمونہ ہیں جو پاک باطن۔ اہل اللہ کی خاص صفت پائی جاتی ہے جس کو تمام عبادتوں اور ریاضتوں کا کامیاب نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ الفاظ یہ تھے:۔ "میں نے تو ڈوبنا سیکھا ہے۔ مجھے تیرنا نہیں آتا"۔ ان الفاظ کا شان نزول بھی عجیب ہے۔

گذشتہ ماہ شعبان میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ سے واپسی ہوئی تھی۔ جب بذریعہ کار دیوبند جانا ہوتا تھا تو راستہ میں نہر کے پل پر تھوڑی دیر قیام ضرور ہوا کرتا تھا کھاتولی میں نہر کے پاس ایک نل (اور دلی والوں کی زبان میں "برما") ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں، سبک اور بہت ٹھنڈا ہے۔ جاتے آتے اس برمے کا پانی ضرور پیا جاتا تھا۔

واپسی کے وقت پانی پینے کے لئے یہاں قیام ہوا۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب میرٹھی ساتھ تھے۔ ماہ مئی کی آخری تاریخیں تھیں۔ گرمی شدید، شام کا وقت تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی جلد باز پھرتیلی طبیعت نے نہر کا صاف شفاف پانی دیکھا تو ایک دم لنگی باندھ کر غسل کرنا شروع کر دیا۔ اسی پر کچھ تیرنے اور غوطہ لگانے کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ کچھ بزرگوں کے واقعات بھی زبان پر آئے۔ جو تیراکی کے ماہر تھے

غالباً حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے بھی دریافت کیا تھا "کیا جناب کو بھی تیرنا آتا ہے؟"

حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان مبارک سے برجستہ وہ فقرہ صادر ہوا جو اُوپر نقل ہو چکا ہے۔ یہ فقرہ زبان پر تھا۔ اور چشم مبارک میں آنسو تھے۔ تفریح کے موقع پر یہ سنجیدگی اور یہ حضوری قلب کہ فوراً ہی رقت طاری ہوگئی۔ اس کی قدر وہ کر سکتے ہیں جو ریاضت اور مجاہدہ کی غرض و غایت سے واقف اور اس کے متلاشی ہوں۔ یہ دیوبند کا آخری سفر تھا جو کم از کم ان کو تو ہمیشہ یاد رہے گا جن کو اس سفر میں شرف رفاقت حاصل تھا۔

رمضان شریف کے بعد نزلہ و زکام کی شکایت شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کرلی آپ اپنے معمولات برابر انجام دیتے رہے۔ لیکن ۱۱ محرم ۷۲ھ یکم اکتوبر ۵۲ء سے آپ صاحب فراش ہو گئے۔ دہلی کے مشہور اطباء حکیم ظفر احمد خاں صاحب، حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ، حکیم محمد اسماعیل صاحب (پرنٹر و پبلشر الجمعیۃ و مالک صدیقی دواخانہ) حکیم ذکی احمد خاں صاحب (جید برس دہلی) حکیم الیاس خاں صاحب صدر جامعہ طبیہ، حکیم شریف الدین صاحب مالک بقائی دواخانہ، حکیم فضل مبین صاحب، حکیم مظہر الدین صاحب اجملی کبھی ساتھ ساتھ اور کبھی یکے بعد دیگرے معالجہ کو آئے۔ بیرونی اطباء میں سے حکیم محمد صدیق صاحب بریلی۔ حکیم محمد یامین صاحب سہارنپوری نے بھی آخر میں علاج کیا۔

دہلی کے تقریباً تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں کا معائنہ کرایا گیا خصوصاً ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے تقریباً دو ماہ تک ایسی ہمدردی و خلوص اور جانفشانی سے علاج کیا جس کی مثال مشکل سے پیش کی جا سکتی ہے لیکن قضائے الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی کی جا سکتی تھی نہ کی جا سکی۔ یہاں تک کہ ۱۳ ربیع الثانی ۷۲ھ ۳۱ دسمبر ۵۲ء چہار شنبہ شب کو دس بج کر پچیس منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے "حیات طیبہ" اور پاک زندگی کا سبق پسماندگان کے لئے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ (رضی اللہ عنہم و ارضاہ۔

صاحبزادگان کے علاوہ مولانا ضیاء الحق صاحب تلمیذ خاص حضرت مفتی صاحب نے خدمت کی سعادت خوب خوب حاصل کی تھی۔ مولانا اختر صاحب شاگرد رشید اور جناب حکیم شریف الدین صاحب بھی تقریباً ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب ساری عمر کے رفیق اور پڑوسی۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب معالجہ اور طبی مدارات میں مشیر خاص رہے۔ چند روز بیشتر حکیم محمد یامین صاحب سہارنپوری حکیم محمد اسمٰعیل وغیرہ نے نئے انداز سے علاج شروع کیا۔ ابتداءً مرض میں تخفیف معلوم ہوئی اور یہ اطمینان دلایا گیا کہ مرض رو بہ تنزل ہے۔ لہٰذا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے سی پی کا دورہ شروع کر دیا جس کا تقاضہ اور تیاریاں تقریباً چھ ماہ پہلے سے

ہوری تھیں ۲۰ چہارشنبہ کے روز شام تک طبیعت حسب معمول رہی تقریباً پونے نو بجے دفعتہً تغیر پیدا ہوا اور تھوڑی دیر بعد مایوسی کی شکل پیدا ہوگئی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناگپور ٹیلیفون سے خبر دی گئی۔ لیکن ہوائی جہاز سے سیٹ نہ مل سکی۔ ٹرین سے پہونچنا ناممکن تھا۔ یہ حسرت ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئی۔

دیوبند سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب نماز جنازہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستہ میں ایسی رکاوٹ پیش آئی کہ جب دہلی پہونچے تو نماز جنازہ ختم ہو چکی تھی۔ اسی وقت سہارنپور سے حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم مولانا مفتی سعید احمد صاحب اور ان کے رفقاء بھی تشریف لائے۔

جنازہ تیماردار حضرات کی یہ دوراندیشی قابل قدر ہے کہ وفات کے بعد فوراً ہی غسل دے کر جنازہ تیار کر لیا تھا۔ چنانچہ صبح صادق کے وقت سے ہی ہجوم شروع ہوگیا اور جب ۲ بجے نماز ظہر کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی تو پریڈ کا وسیع میدان ایک لاکھ خدا پرستوں سے پٹا ہوا تھا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ شریف کے زیر سایہ قبر پہلے سے تیار تھی۔ یہ جگہ دہلی شہر سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے مگر یہاں بھی کم و بیش دس ہزار مسلمان پہونچ گئے جو دفن میں شریک ہوئے۔ رحمۃ اللہ تعالےٰ وقدس سرہٗ ۔

(اخبار الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۲ مارچ ۱۹۵۳ء)

مکتوب شیخ عبدالحق صاحب پراچہ

برادر محترم مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف - السلام علیکم

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کوئی مجموعہ مضامین حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر شائع کر رہے ہیں۔ اس موقع پر چاہتا ہوں کہ ایک واقعہ اپنے مشاہدہ کے مطابق پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ امید ہے کہ مجموعہ میں شامل فرما کر ممنونیت کا موقع دیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا حضرت مفتی اعظمؒ کی وفات سے کچھ روز قبل حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند دہلی تشریف لائے تھے۔ مولانا موصوف کو آنکھوں کا آپریشن کرانا تھا۔ ڈاکٹر سوگا کے ہسپتال واقعہ علی پور روڈ میں داخل ہوکر آپریشن کرایا تھا۔ میں تقریباً روزانہ شام کو عیادت کے لئے ہسپتال جاتا تھا۔ اور رات گئے تک وہاں رہتا تھا۔ مولانا موصوف روزانہ حضرت مفتی اعظم کا حال دریافت فرماتے

تھے۔ اور بیس دن کی کیفیت سنایا کرتا تھا۔ وفات سے دس بارہ روز قبل حضرتؒ کی حالت کچھ سدھر گئی تھی۔ اور مرض میں افاقہ معلوم ہوتا تھا جس روز وفات ہوئی ہے اس روز بھی میں ہسپتال گیا مولانا موصوف نے حضرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا اب خدا کے فضل سے رو بصحت ہیں۔ اس کے بعد میں مولانا کے فرزند مولوی سید محمد میاں صاحب شاہجہاں پوری سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اور مولانا موصوف کو نیند آ گئی۔

ساڑھے دس بجے شب یکایک آنکھ کھلی۔ مولوی محمد میاں کو آواز دی اور دریافت کیا کہ عبدالحق براچہ ہیں۔ میں نے عرض کیا حاضر ہوں۔ فرمایا شیخ صاحب حضرت کا کیا حال ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پہلے سے کچھ افاقہ ہے۔ فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت مفتی اعظمؒ تو رحلت فرما گئے۔ یہ کہہ کر مولانا موصوف رونے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ میں نے ابھی ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر پوری ہو چکی۔ میں نے دیکھا کہ ایک مکان میں اکابر اسلام کا اجتماع ہے اور حضور انور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جلوہ فرما ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ کیا کفایت اللہ نہیں آئے؟ کسی نے عرض کیا جی ہاں! یا رسول اللہ وہ بھی آ گئے۔ اسی وقت حضرت العلامہ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ بھی وہاں آ گئے۔ اور اسی اجتماع میں شامل ہو گئے۔

یہ خواب مولانا موصوف بیان کر کے زار وقطار رونے لگے۔ اور فرمانے لگے کہ مفتی اعظمؒ تو اپنے اکابر سے جا ملے ان کا وصال ہو گیا۔ یہ سن کر میں اور مولوی محمد میاں سکتے میں رہ گئے۔ میں مولانا موصوف سے اجازت لے کر واپس آیا۔ شہر میں آ کر معلوم ہوا کہ واقعی ٹھیک اسی وقت حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا ہے۔

خادم عبدالحق براچہ
۵۳ / کباڑی بازار۔ جامع مسجد۔ دلی

فقیہ الامت مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

(از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ)

ولادت ۱۲۹۲ھ وفات ۱۳۷۲ھ۔ عیسوی سال ۱۹۵۲ء کے ختم کو ایک گھنٹہ ۵۰ منٹ باقی تھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو دس بج کر ۵ منٹ پر حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اپنے گھر واقع کوچہ چیلاں دہلی میں وفات پائی، یہ خبر یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی صبح کو کراچی پہنچی، اور لوگوں کو اس حادثۂ فاجعہ کے علم سے بڑا صدمہ ہوا مختلف علماء نے اپنے تاثرات اخباروں میں چھپوائے، اور جمعیۃ علمائے اسلام کی مجلس عاملہ اور ۳۲ علماء کی دستوری مجلس نے جس میں سارے پاکستان کے منتخب علماء موجود تھے، اس حادثہ پر غم کا اظہار کیا

اور دعائے خیر کی۔

مرحوم کے نام سے واقفیت مجھے ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ جب ندوۃ العلماء کا اصلاحی اجلاس حکیم اجمل خاں صاحبؒ کی طلب پر دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اور ارکان کی باہمی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی، کہ مولانا شبلی کی تکفیر کا فتویٰ دہلی میں مرتب ہوا، جس پر مفتی صاحب مرحوم کے دستخط تھے۔ اس کے بعد یہ نام ذہن سے اتر گیا۔ اور یکا یک ۱۹۱۹ء میں جب مسلم لیگ کا استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر انصاری نے پڑھا اور اس میں خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق فقہی اور لغوی بحث پیش کی تو خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ مواد کس نے بہم پہنچایا۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحب کا نام پھر سنا، اور اتفاق وقت دیکھئے کہ ایک ہی سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت کی تحریک کے سلسلے میں حکیم صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک جلسہ تھا جس میں مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سب سے اول ان کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بنا پر قیافہ نے ان کے فضل وکمال سے حسن ظن پیدا نہ ہونے دیا، مگر تھوڑی بات چیت سے پتہ چل گیا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے، اس کے بعد خلافت اور جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں میں بار بار ملاقات اور خلط ملطان کے علمی، ذہنی اور اخلاقی علوئے شان کی نشان دہی کرتا چلا گیا، پھر تو یہ حال ہوا۔

يَزِيدُكَ وَجْهُهُ حُسْنًا   إِذَا مَا زِدْتَهُ نَظَرًا

(ترجمہ) ممدوح کا چہرہ حسن میں اتنا ہی ترقی کرتا چلا جاتا ہے، جتنا تم اس کو دیکھتے جاؤ۔

کئی دفعہ مرحوم کے ساتھ یکجائی سفر کا اتفاق ہوا، جس میں سب سے طویل سفر ۱۹۲۶ء میں حجاز کی موتمر اسلامی میں شرکت اور حج کی غرض سے کیا گیا تھا، ایک جہاز سے ہم سب کا جانا اور آنا اور مکہ معظمہ میں قریب قریب قیام اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں پر ایک ہی قافلہ میں روانگی اور عرفات میں ایک ہی اونٹ پر مسجد نمرہ تک سواری نصیب ہوئی۔

دوسرا موقع یہ آیا کہ مفتی صاحب کے صاحبزادے کی بات میں نے اعظم گڈھ میں ایک خاندان میں چھیڑی اور مفتی صاحب مع حافظ احمد سعید صاحب اعظم گڈھ میں دارالمصنفین آکر میرے مہمان ہوئے اور چند روز قیام فرمایا، وہ بات پکی نہیں ہوئی، لیکن اس اثنا میں ہماری دوستی پکی ہو گئی۔ آخری ہمراہی و ہمسفری ۱۹۴۱ء میں دہلی سے بھوپال تک ہوئی، جہاں ہم دونوں ریاست کی دعوت پر اس کے نکاح و طلاق کے ضابطوں پر نظر ثانی کرنے کو بلائے گئے تھے، اور ساتھ ہی سرکاری مہمان خانہ کے ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے۔

وطن اور خاندان مرحوم کا وطن شاہجہاں پور تھا۔ مرحوم کا وجود اسلام کے عظیم الشان معاشرتی مساوات

کا عملی ثبوت تھا۔ مولوی حافظ احمد سعید صاحب نے جو اُن کے سب سے زیادہ قریب رہنے والے اور ان کے دست راست تھے۔ مجھے بتایا کہ مرحوم کے مورث اعلیٰ یمن سے آئے تھے۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ یمن سے سوداگروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی میں بیٹھ کر، ہندوستان کی جانب روانہ ہوا لیکن ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک طوفان میں پھنس کر تباہ ہوگیا۔ اس قافلہ میں شیخ جمال نام ایک کم سن لڑکا بھی سوار تھا، وہ کشتی کے ایک تختہ پر بیٹھ کر کنارہ لگ گیا۔ وہاں بھوپال کا ایک شخص اس کو اپنے ساتھ بھوپال لے آیا۔ اور اس کو اپنی تربیت میں رکھ کر اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے اس کی شادی کردی۔ یہی شیخ جمال، مفتی صاحب مرحوم کے مورث اعلیٰ تھے۔ بھوپال سے یہ خاندان شاہجہاں پور میں منتقل ہوا۔ اور محلہ سن زئی میں سکونت اختیار کی، اور گزربسر کے لئے ایک معمولی پیشہ اختیار کیا، اور یہ اسلام کی علمی تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں، اسلام کی تاریخ میں کتنے ہی علمائے حدیث و فقہ اور مسند نشینان فضل و کمال جوتہ بنانے والے، کپڑا بننے والے، تیل بیچنے والے، جوتہ گانٹھنے والے اور دوسرے معمولی پیشہ کرنے والے بزرگ تھے، اور آج تک وہ خصاف، نساج، حلاج، دباغ، حلوائی، صیرفی، حریری کے نام سے پکارے جاتے ہیں، اور درس و ارشاد کی مسند پر قریش و سادات کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جاتے ہیں، اور ساری دنیائے اسلام، ان کے آگے اپنے احترام کا سر جھکاتی ہے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ اسلام کی گذشتہ روایات کا سماعی واقعہ ہے، مرحوم مفتی صاحب کا وجود اسلام کی معاشرتی مساوات کا آج بھی ناقابل تردید واقعہ ہے، انھوں نے مسلسل بیس برس تک سارے علمائے ہند کے رئیس کی حیثیت سے جمعیۃ العلماء کی صدارت کی، اور کسی نے ان کے اس استحقاق سے سرتابی نہیں کی۔ اور وہ بڑے سے بڑا احترام جو ایک انسان، دوسرے انسان کو دے سکتا ہے، وہ تمام عمر مسلمانوں میں ان کو حاصل رہا، اور دنیا نے مفتی اعظم ہند کہہ کر پکارا۔

مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا، اور شیخ جمال یمنی تک ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ۔

بھوپال کا شہر، امیر دوست محمد کی حکومت میں ۱۱۲۰ھ میں آباد ہوا، اس سے ظاہر ہوا کہ شیخ جمال یمنی کی بھوپال میں آمد زیادہ سے زیادہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز کا ہوسکتا ہے، جو انیسویں صدی کے مطابق ہے۔[۱]

---

[۱] شہر بھوپال کا بانی راجہ بھوج ہے جو بیران دھار کا راجہ تھا۔ اس نے یہاں ایک بندھ باندھ کر شہر آباد کیا، پال بندھ کو کہتے ہیں۔ بھوجپال نام ہوا۔ کثرت استعمال سے بھوپال رہ گیا۔ اس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی کا ہے، حضرت شاہ عبداللہ چنگال المتوفی ۴۹۴ھ کے ہاتھ پر اس کا مشرف باسلام ہونا ثابت ہے، اس سے پہلے یہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ راجہ بھوج کے زمانے سے اس کی آبادی شروع ہوئی۔ اور ایک زمانے تک برہمنی علم و فن کا مرکز رہا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر ملاحظہ ہو)

تعلیم و تربیت مرحوم کے والد گو غریب تھے، مگر ہمت عالی رکھتے تھے۔ اور بچہ کو عالم دین بنانے کی تمنا دل میں رکھتے تھے، پانچ سال کی عمر میں شہر کے ایک محلہ میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے۔ اور انہیں قرآن مجید ختم کیا۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم محلہ ورگ زئی میں حافظ نسیم اللہ کے مکتب میں ہوئی، اسی زمانہ میں محلہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن صاحب کا مدرسہ اعزازیہ قائم ہوا تھا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر اسی مدرسہ میں داخل کئے گئے۔ یہاں انھوں نے فارسی کی اعلیٰ اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن صاحب سے پڑھیں یہاں کے اساتذہ میں ایک ولایتی افغان عالم مولانا عبید الحق خاں صاحب[۱] تھے۔ (جو مولانا فضل اللہ خاں صاحب شاہجہاں پوری کے جن کو بمبئی اور کراچی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں، اور جو بالفعل جمعیۃ الفلاح کراچی کے ناظم ہیں، والد بزرگوار تھے) بچپن ہی سے مفتی صاحب مرحوم کی ذہانت و طباعی آشکارا تھی، ان کے استاذ اُن سے محبت کرتے تھے۔ مولانا عبید الحق صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کی طرف بیش از بیش توجہ کی، اور شیخ عنایت اللہ صاحب کو مجبور کر کے ۱۳۱۰ھ میں ان کو مراد آباد کی شاہی مسجد کے مدرسہ میں بھجوا دیا، جہاں انھوں نے وہاں کے مدرسین مولانا عبد العلی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) پھر جب ویران ہوا تو علم و حکمت کا چراغ گل ہو گیا۔ اس کی موجودہ آبادی سردار دوست محمد خاں بانی ریاست بھوپال کے ہاتھوں ۱۱۲۰ھ میں عمل میں آئی۔ انھوں نے راجدھانی بنا کر قلعہ فتح گڈھ اور شہر کی چار دیواری تعمیر کی اور باہر سے اہل کمال لوگوں کو مدعو کر کے ترقی دینا شروع کیا۔ انکے بیٹے نواب یار محمد خاں کے زمانے میں خوب رونق ہو گئی، پھر نواب حیات محمد خاں و فیض محمد خاں و غوث محمد خاں کے دور میں مرہٹہ افواج کی شورشوں میں گھرا رہا۔ نواب وزیر محمد خاں کے زمانے سے امن و امان کا دور دورہ رہا۔ اور بیگماتی عہد میں ہند اور بیرون ہند میں پرچم شہرت بلند ہوا۔ اور اب مدھیہ پردیش کی راجدھانی ہے۔

(تاج الاقبال، سراج الاقبال وغیرہ بشکریہ صدیق محترم مولانا سید عابد وجدی الحسینی قاضی ریاست بھوپال)

حضرت مفتی اعظمؒ کے مورث اعلیٰ شیخ جمال یمنی کے والد موتیوں کے تاجر تھے، جہاز میں تجارتی قافلہ سوار تھا۔ جمال یمنی بھی نو عمر میں تجارتی مقصد سے اپنے باپ کے ساتھ ہم سفر تھے۔ شیخ عباد اللہ براہ راست شیخ جمال کے فرزند نہیں ہیں بلکہ درمیان میں کئی پیڑھیاں ہیں۔ اور یہ معلوم نہیں کہ جہاز کی تباہی کا حادثہ کونسے سنہ میں ہوا۔ لیکن یہ زمانہ اب سے تخمیناً تین سو برس پہلے کا ضرور ہے۔ سید صاحب مرحوم کا اندازہ صحیح نہیں ہے۔ اور بھوپال چونکہ بہت قدیم شہر ہے اسلئے کوئی تعارض بھی نہیں

(واصف مورخہ ۳۰ جون ۱۹۵۶ء)

[۱] افغانستان وطن تھا حصول تعلیم کے لئے ہندوستان آئے۔ مولانا مفتی لطیف اللہ صاحب علی گڑھی سے تلمذ تھا، اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت کی، ۷۲ برس کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں شاہجہاں پور میں وفات پائی۔ اُن کے معاصرین اور رفقاء میں مجاہد شہیر مولانا سیف الرحمٰن صاحب اور مدرس شہیر مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری تھے۔

صاحب میرٹھی، مدرس اول سے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد تھے، اور بعد کو مدرسہ عبدالرب دہلی میں صدر مدرس ہوئے اور مولوی محمد حسن صاحب اور مولوی محمود حسن سہسوانی سے کتابیں پڑھیں۔

مفتی صاحب دو سال کے بعد یہاں سے ۱۳۱۲ھ میں مدرسۂ دیوبند چلے گئے۔ اور وہاں کے مدرسین میں مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی، مولانا حکیم محمد حسن صاحب (حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی) اور مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی اور مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہارنپوری سے اسباق پڑھے، اور کتب حدیث کا درس مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے حاصل کیا۔

صحاح ستہ کے دورہ میں اٹھارہ حضرات شریک تھے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی) مولوی محمد امین الدین صاحب (مولوی بانی مدرسہ امینیہ دہلی ۱۳۱۵ھ میں ۲۲ برس کی عمر میں دیوبند سے فراغت ہوئی۔ مولانا عبیدالحق صاحب نے شاہجہانپور میں ۱۳۱۴ھ میں ایک مدرسہ عین العلم قائم کیا تھا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب جب فراغت کے بعد وطن واپس آئے شفیق استاد نے انکو اسی مدرسہ میں جگہ دی۔ اور تقریباً ۵ سال اس میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں شاہجہانپور میں قادیانیت کی تحریک پنپی تو اسکے رد میں ۱۳۲۱ھ میں البرہان نام ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ مدرسۂ عین العلم میں جن اصحاب نے آپ سے پڑھا۔ ان میں سے حسب ذیل اصحاب کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب استاذ الادب والفقہ دیوبند مولانا مفتی مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔

مدرسہ امینیہ دہلی کو جس سے مفتی صاحب کا پچاس برس تعلق رہا، ان کے رفیق درس مولوی امین الدین صاحب مولوی نے ۱۳۱۵ھ میں قائم کیا تھا۔ موصوف ابولہ احاطہ بمبئی کے باشندے تھے، مگر اپنی علمی و عملی کوششیں دہلی میں خرچ کیں۔ اس مدرسہ کے سب سے پہلے مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مقرر ہوئے تھے۔ حضرت شوق نیموی عظیم آبادی کی کتاب آثار السنن جب شائع ہوئی ہے تو مولانا کاشمیری یہیں مدرس تھے۔ چنانچہ انکی منظوم تقریظ اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب کی تشریف بری کے بعد مولوی امین الدین صاحب شاہجہانپور جاکر مفتی کفایت اللہ صاحب کو ۱۳۲۱ھ میں یہاں لے آئے، اور مولوی صاحب کی زندگی تک وہ صرف مدرس رہے۔ ۱۳۲۸ھ مطابق ۷ رجون ۱۹۱۰ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اہل شوریٰ نے مفتی صاحب کو مہتمم بھی بنا دیا جس کے کام کو وہ آخر تک نباہتے رہے۔

یہ مدرسۂ امینیہ پہلے سنہری مسجد میں تھا، یہاں جانے کا مجھے صرف ایک دو دفعہ اتفاق ہوا۔ آخر میں مفتی صاحب کے اہتمام میں ایک اور مسجد کے پاس مدرسہ کی موجودہ عمارت بنی، اس میں بھی مفتی صاحب کی ملاقات کا جذبہ کئی دفعہ مجھے کھینچ کرلے گیا۔[1]

---

[1] علم و فضل کا ماتم گذار یہیں تک پہنچ پایا تھا کہ خود اس کے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ دفعتہً علالت شروع ہوگئی۔ اور قلم رک گیا۔ پھر شرح نے بھی کچھ دنوں کے بعد جسم کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ نوحۂ غم انکی زندگی کا آخری ماتم ثابت ہوا، اس کے بعد تو خود ان ہی کا ماتم بپا ہوگیا۔

ابو عاصم ناشر یادرفتگان مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

والد مرحوم کی یادیں

اُن کی وفات کے کئی برس کے بعد

(از واصفؔ)

زمانہ بدلا ہے آہ ایسا ان کے جھگڑے سے چل رہے ہیں
فضائیں مسموم ہو رہی ہیں فلک کے تیور بدل رہے ہیں

اٹھایا گردوں نے ایسا طوفاں کہ عقل و تدبیر ہے ہراساں
کچھ ایسا بھڑکا ہے داغ حرماں جگر کے ٹکڑے بھی جل رہے ہیں

نہ کی کبھی ہم نے قدر اُن کی بڑا سہارا تھی جن کی ہستی
گئی ہے ہاتھوں سے دولت ایسی کہ بیٹھے اب ہاتھ مل رہے ہیں

نگاہیں تم نے جو پھیر لی ہیں تو سارا سنسار پھر گیا ہے
رفیق آنکھیں دکھا رہے ہیں عزیز پہلو بدل رہے ہیں

جو خواب غفلت سے آنکھ کھولی عجب نظارہ یہ ہم نے دیکھا
ابھی کچھ آیا نہیں سمجھ میں ابھی تو آنکھیں مسل رہے ہیں

تمہاری وہ اک نگاہ رحمت جو تھی کبھی زخم دل کا مرہم
وہ یاد آئی ہے آج ایسی کہ دل پہ تیشے سے چل رہے ہیں

کہاں ہے اب آشیاں ہمارا فلک نے چھوڑا نہ ایک تنکا
یہ بال و پر اب جو رہ گئے ہیں زمین والوں کو کھل رہے ہیں

وہ ظرف عالی کہاں سے لائیں وہ ضبط و تمکین کس سے سیکھیں
کسے خبر تھی کہ زیر دامن مہیب فتنے بھی پل رہے ہیں

کمال احساں سے جن کو تم نے سکھائے احسان کے طریقے
وہ اُن طریقوں کو پانوؤں سے اچھل اچھل کر کچل رہے ہیں

سنبھالا اس کارواں کو جس نے ثبات و ایقان تھا تمہارا
بڑے بڑے رہبران دانا قدم قدم پر پھسل رہے ہیں

ہزار ہا سنگ راہ آئے تمہاری فکر رسا کے آگے
مگر یہ دیکھا کہ سوکھے پتے ہوا سے گویا اچھل رہے ہیں

کہاں وہ ایثار و جاں فشانی کہاں وہ اخلاق و مہربانی
یہاں تو اوضاع زندگانی ہوس کے سانچوں میں ڈھل رہے ہیں

اگرچہ روشن دماغ بھی ہیں اگرچہ دل بھی بہت منور
مگر یہ شعلے ہیں سازشوں کے چراغ کینے کے جل رہے ہیں

کہاں وہ نباض دین و ملت کہاں وہ نکتہ رس سیاست
یہ اہل دانش یہ اہل حکمت دماغ سب کے پگھل رہے ہیں

نہیں کھلونا یہ جام عرفاں امین بننا نہیں ہے آساں
یہ جانے کیا چاہتے ہیں ناداں کہ طفل صورت مچل رہے ہیں

نہ تھے کبھی ہم بھی ایسے عاجز چٹان تھا حوصلہ ہمارا
پڑی مصائب کی چوٹ ایسی کہ دل سے چشمے ابل رہے ہیں

نہیں ہے واصفؔ مجال گفتن کرے گا کیا کوئی چارہ سازی
اگرچہ سُن سُن کے میرا قصہ ہر اک کے آنسو نکل رہے ہیں

مندرجہ بالا نظم میرے ذاتی حالات کے لحاظ سے لاتقتدنا بعدہ کی عدم مقبولیت کا ایک نقشہ اور ایک مختصر سی تفسیر ہے۔ (واصفؔ)

لو! وہ ستارہ بھی چھپ گیا۔

(از حفیظ الرحمان واصف)

(یہ مقالہ اخبار روزنامہ الجمعیۃ میں مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء سے ۵ نومبر ۶۱ء تک ہفتہ وار ایڈیشنوں میں مسلسل شائع ہوا۔ اب نظر ثانی کرکے اس مجموعہ میں شائع کیا جارہا ہے)

حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ اور مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا کہ دل پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

مولانا احمد سعید اجڑی ہوئی دلّی کی ایک عظیم الشان یادگار تھے۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہ دلّی کی رہی سہی عظمت کا کھنڈر بن کر رہ گئے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان پر مقالہ لکھنے بیٹھا تھا قلم اٹھایا اور لکھا۔ اور لکھتا ہی چلا گیا۔ اور معلوم نہیں کیا لکھا؟ اور کتنا لکھا؟ یہ منثور مرثیہ مولانا مرحوم کا ہے؟ یا دہلی مرحوم کا؟ یا ماضی مرحوم کا؟ میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بہر حال جو کچھ قلم کی زبان سے نکلا وہ جذبات کی ترجمانی اور ایک متاع گم شدہ کی کہانی ہے۔

مولانا احمد سعید کا تذکرہ بغیر حضرت مفتی اعظم رح کے تذکرے کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ میرا اللہ از تحریر میرے قدرتی انتساب کا اقتضا تھا۔ مجھے معذور سمجھا جائے۔

ہائے دلّی دلّی کی ہوا کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ مرطوب ہے۔ مگر اب سے بیتے ہوئے سو برس کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مرطوب آب وہوا میں فولادی آئینہ زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس کے جوہر غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن دلّی کی ہوا میں پوشیدہ جوہر ابھرتے ہیں۔ دلّی اپنے اندر بھی بے انتہا جوہر رکھتی ہے اور اس کی ہوا جوہر قابل کو صیقل کرکے ابھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ کہاں تک نام شمار کروگے۔ سو برس کی تاریخ کو جتنا کھنگالو گے لعل والماس ہی نکلیں گے اور اس کی خاک کو جتنا رول کرو دیکھو گے موتی ہی موتی نظر آئیں گے۔ دلّی کی خاک نے جہاں حضرت شاہ عبد العزیز جیسے علماء۔ مولانا اسمٰعیل شہید جیسے مجاہد۔ غالب وداغ جیسے شاعر۔ نواب ضیاء الدین احمد جیسے مورخ ونساب حکیم اجمل خاں جیسے طبیب۔ منشی ذکاء اللہ جیسے ماہر ریاضی۔ سر سید احمد خاں جیسے مدبر وایثار پیشہ۔ مفتی صدر الدین خاں جیسے مفتی۔ شاہ محمد اسحٰق جیسے محدث پیدا کیے۔ وہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے جوہر قابل کو صیقل دیکر

چمکایا۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۔ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ جیسے اکابر ملت کو اپنی آنکھوں کا تارا بنایا۔ جوہر شناسی اور قدر افزائی بھی اس اُجڑی ہوئی دلی کا خاصہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کی ناسازگاری کے باوجود کارزار حیات میں قدم بڑھاتے ہیں اور آگے بڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ملک وقوم کے ممتاز اکابر کی صف اول میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی شدید مجاہدات میں گزرتی ہے۔ ان کو بڑی بڑی اذیتوں اور حوادث سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر ان کی ہمت کبھی جواب نہیں دیتی۔ اور وہ اپنی ایک شاندار تاریخ اور عظیم الشان کردار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

زمانہ حاضرہ پر جب ہم نگاہ ڈال کر تجسس کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی ان مجاہد ہستیوں میں سے جنھوں نے اپنی ذاتی محنت و کاوش سے ایک عظیم الشان کردار پیدا کیا۔ اور دلی کی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھا۔ مولانا احمد سعید کی ہستی ایک آخری نمونہ تھی۔ اس شمع کے گل ہو جانے کے بعد محفل تاریک ہے فضا اداس ہے اور جگہ خالی ہے۔ معلوم نہیں یہ جگہ کب تک خالی رہے گی۔ اور دلی کی خاک سے مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا احمد سعید۔ مسٹر آصف علی۔ خواجہ حسن نظامی جیسے فرزند کب پیدا ہوں گے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

خاندانی حالات اور ابتدائی تعلیم

مولانا مرحوم کا سن پیدائش ۱۳۰۶ھ ہے۔ یہ خود مولانا مرحوم نے ہی راقم الحروف کو بتایا تھا۔ فرماتے تھے کہ دن اور تاریخ معلوم نہیں مگر مہینہ ربیع الثانی کا تھا۔ از روئے تقویم یہ دسمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ یکم ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ کو ۵ دسمبر ۱۸۸۸ء ہوتی ہے۔ شمسی حساب سے پیدائش کا مہینہ بھی دسمبر ہے اور وفات کا بھی دسمبر۔ اس حساب سے اکہتر سال کی عمر پائی۔ اور قمری حساب سے تہتر سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ مولد و منشا کوچہ تاہر خاں دریا گنج دہلی ہے۔

آپ کے والد حافظ نواب مرزا زینت المساجد میں منصب امامت پر فائز تھے۔ اور مکتب بھی پڑھاتے تھے۔ آپ کے دادا خواجہ نواب علی دلی شہر کے مشہور صوفی خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کے بزرگوں کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے عرب سے کشمیر میں بلایا تھا۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان کشمیر سے آگرہ آیا۔ اور کچھ عرصے وہاں رہ کر دہلی میں منتقل ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے تک کشمیری کٹرہ میں سکونت پذیر تھا۔ کشمیری کٹرہ لال قلعے کے سامنے پتھر والے کنوئیں کے میدان میں (پارلیمنٹ بلڈنگ آفس کے آس پاس) آباد تھا۔ انگریزوں نے دلی کو فتح کرنے کے بعد کشمیری دروازہ سے لے کر دلی دروازہ تک کی آبادی کو مسمار کر دیا۔ اس کی زد میں یہ کشمیری کٹرہ بھی آگیا۔ آپ کے آباو اجداد کو مغل دربار میں رسائی حاصل تھی اور خواجہ زادہ مغل کا خطاب عطا

ہوا تھا۔
آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفےٰ آبادی سے حاصل کی۔ اور تکمیل حفظ قرآن کی دستار بندی مدرسہ حسینیہ بازار مٹیا محل میں ہوئی۔
مدرسہ حسینیہ کو ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں مولانا محمد حسین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں مولانا محمد ابراہیم وغیرہ نے شیخ کریم بخش ساکن ترکمان دروازہ اور دیگر مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر کیا تھا۔ وہاں مولانا محمد حسین فقیرؒ کا وعظ ہوتا تھا۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم کا وعظ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احمد سعید کی عمر ۱۶۔۱۷ برس کی ہوگی۔ آپ مولانا فقیرؒ کے اور ان کے بیٹے مولانا راسخ اور مولانا محمد ابراہیم کے وعظ سنتے تھے۔
مولانا فقیر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں بڑے صاحبزادے مولانا حبیب الرحمٰن اور ان سے چھوٹے مولانا عبدالرحمٰن راسخ پہلی بیوی کی اولاد تھے۔ اور دوسری بیوی کی اولاد میں مولانا محمد ابراہیم بڑے اور مولانا محمد اسحٰق چھوٹے تھے۔ مولانا راسخ فن شعر و سخن کے بھی امام تھے اور وعظ و تقریر میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ ان کا وعظ اردو بازار کی مسجد میں بعد نماز جمعہ ہوا کرتا تھا۔ یہ مسجد اب مولانا احمد سعید کی مسجد کہلاتی ہے۔ پہلے بہت مختصر تھی۔ مولانا راسخ کے انتقال کے بعد اس میں مولانا احمد سعید کے وعظ شروع ہوئے۔ پھر مسجد کی توسیع اس طرح ہوئی کہ پڑوس میں ایک حاجی عبدالوہاب رہتے تھے انھوں نے اپنا آدھا مکان مسجد کو دے دیا اس کو شامل کر کے مسجد کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔
غرضکہ جب آپ مولانا راسخ کے وعظ سنتے تھے چونکہ آپ کے اندر فطرۃً جوہر قابل موجود تھا، وعظ سنتے سنتے خود بھی وعظ کہنے لگے۔ علمی قابلیت حفظ قرآن سے آگے نہ تھی۔ لکھنا بھی غالباً نہیں آتا تھا۔ مدرسہ حسینیہ میں مولانا محمد ابراہیم کا اور مدرسہ حسین بخش میں مولانا کرامت اللہ خاں کا وعظ ہوتا تھا۔ مولانا کرامت اللہ خاں اگرچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ مگر رضاخانیت کی طرف میلان زیادہ تھا دونوں حضرات اپنے اپنے وعظوں میں اختلافی مسائل بیان کرتے اور ایک دوسرے کا رد کیا کرتے تھے اُس زمانے میں سماع موتٰی کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ بڑے زور کی جھڑپیں ہورہی تھیں۔ مدرسہ حسینیہ میں تعلیم پانے والے لڑکے بھی اس قسم کے معرکوں کی نقل کر کے مناظرہ سیکھتے تھے چنانچہ مولانا احمد سعید، مولوی محمد ابراہیم بنتے تھے اور صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی (مولانا احمد سعید کے برادر نسبتی) مولوی کرامت اللہ خاں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ دونوں کھڑے ہوکر مناظرہ کرتے تھے۔
اُس زمانے میں وعظ و تذکیر کا طریقہ عصر حاضر سے کچھ مختلف تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں وعظ اور مولود شریف کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ وہ محض محفلیں ہی ہوتی تھیں ان کو جلسہ نہیں کہا جاسکتا، اور غالباً لفظ

جلسہ جو مفہوم اب رکھتا ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا۔ کیونکہ ان محفلوں کے لئے عام پوسٹر شائع نہیں کئے جاتے تھے۔ صرف محلے میں زبانی اعلان کرادیا جاتا تھا۔ یا کچھ مسجدوں میں خاص خاص علماء کا وعظ مقرر تھا۔

ابتدائی مشاغل اور ذریعہ معاش شروع شروع میں مولانا کو ایسی ہی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ بعد میں کوچہ چیلاں کی مسجد جو اب مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی مسجد کہلاتی ہے اس میں بھی مولانا نے ہر جمعرات کو وعظ کہنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا:۔

"بھئی! ہماری زندگی تو شروع سے ہی قلندرانہ زندگی ہے۔ جب ہم کسی کے گھر پر جا کر وعظ کہتے تھے تو دو روپئے نذرانہ ملتا تھا۔ کچھ تارکشی کا کام کر لیتے تھے اس طرح عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوتی تھی۔"

گوٹہ ٹھپہ وغیرہ میں جو چاندی سونے کا یا تانبہ کا ملمع شدہ تار استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل مشینوں سے باریک کیا جاتا ہے۔ اب سے چالیس سال قبل یہ مشینیں نہیں آئی تھیں۔ دو چرخیاں ہوتی تھیں جو ایک چوکی پر لگی ہوتی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی چرخی پر تار لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ دائیں ہاتھ کی چرخی کو ایک فولادی کیل کے ذریعے ہاتھ سے گھمایا جاتا تھا۔ بیچ میں بارہ لگا ہوتا تھا۔ تار اس میں سے کھنچتا ہوا دائیں ہاتھ کی چرخی پر منتقل ہوتا تھا بارہ ایک گول ٹکلی پیتل کی بنی ہوئی ہوتی ہے جس کے بیچ میں ہیرے وغیرہ کا چھوٹا سا سوراخ دار جوئل ہوتا ہے اس میں سے تار کو نکال کر کھینچتے اور باریک کرتے ہیں۔ غرضکہ یہ محنت طلب طریقہ تھا تارکشی کا۔ اور آپ کے والد بھی یہ کام کرتے تھے۔ مولانا کا نوعمری کا زمانہ تھا جبکہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی اور متعلقین کی کفالت کا بار آپ کے ہی کندھوں پر آ گیا۔

مناظروں کا دور ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو انھوں نے ایک طرف تو عام مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ دوسری طرف یہ کیا کہ سیاسی اثر ڈالنے کے لئے انگریزی کالج کھولنے شروع کئے اور ان میں اپنی مرضی کا نصاب تعلیم رائج کیا۔ اور مذہبی و دینی حیثیت سے ذہنوں کو مسخ کرنے کے لئے عیسائی مشن بھیجنے شروع کئے۔ تبادل مذہب کے لئے ان کا طریقہ یہ تھا کہ روپئے اور نوکریوں اور لڑکیوں کا لالچ دے کر عیسائی بناتے تھے۔ اور اس مہم پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ قابل اور مستعد پادری ہندوستان میں آ کر اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اردو میں تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے اور عام مجمعوں میں اسلام پر اعتراضات کرتے تھے اور خوب کیچڑ اچھالتے تھے۔ علمائے اسلام نے جوابی تقریریں شروع کیں اور مناظروں کا دور شروع ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علمائے اسلام پر جو بیتی اس کی داستان بڑی دردانگیز ہے تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں کہ حکومت متسلطہ نے ان کو بالکل پیس ڈالا تھا۔ اور صدیوں تک کے لئے ابھرنے کی سکت نہ

چھوڑی تھی۔ انگریز بڑی دانا قوم ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جتنی قوت و شدت سے ان کو برباد کیا گیا ہے اتنی ہی قوت سے ابھریں گے۔ اور ممکن ہے کہ جلد ہی ابھریں پادریوں کو کھیج کر ان کو مناظرے میں الجھا دیا۔ بہر حال اس یورش کا مقابلہ کرنا علماء کا ایک اہم فریضہ تھا۔ انھوں نے پوری جواں مردی و ہمت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ پادریوں سے مقابلہ ہو ہی رہا تھا کہ آریوں نے بھی وار کرنے شروع کر دیئے۔ اور کچھ عرصے کے بعد ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ پادریوں اور پنڈتوں سے عوام بھڑکتے تھے۔ کیونکہ وہ غیر مذہب کے لوگ تھے۔ اور پادری تو ویسے بھی سات سمندر پار سے آئے تھے۔ اس لئے تبدیل مذہب میں کچھ نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ اب اسلام کی گود میں ہی پرورش پایا ہوا ایک سورما نمودار ہوا جس نے پہلے مجددیت کا اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اور اسلام کی تبلیغ کے عنوان سے یعنی گھونسہ بن کر ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کر کے سلطنت برطانیہ کا وفادار بنایا۔ (عیسائی مشنریوں کی مکمل تاریخ کتاب "فرنگیوں کا جال" مصنفہ مولانا امداد صابری کے صفحات پر ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے)۔

علماء ان طوفانوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے اور استخلاص وطن کی جدوجہد میں بھی مصروف تھے۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتفاق و اتحاد کی فضا ہموار ہو چکی تھی کہ انگریزوں نے ایک اور بھرپور وار کیا۔ یعنی ۱۹۲۲ء میں شدھی کا طوفان بڑے زور شور سے اٹھا اور اس نے ہندو مسلم اتحاد کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ غرضکہ علماء کو اس طوفانی عہد سے واسطہ پڑا تھا۔ استخلاص وطن کی جدوجہد کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت کے لئے بھی چومکھی لڑ رہے تھے۔

انیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں چاندنی چوک بازار میں کوتوالی کے سامنے فوارہ نارتھ بروک کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر عیسائی پادری تبلیغی تقریریں کیا کرتے تھے۔ (اب فوارہ کی سیڑھیاں توڑ دی گئی ہیں اور سڑک کی سطح بھی اونچی ہو گئی ہے) عیسائیوں میں سے زیادہ تر احمد مسیح اور ہندوؤں میں سے زیادہ تر پنڈت رام چندر لیکچر دیتے تھے۔ سرکاری پابندی کے مطابق ایک دن ایک ہی فرقے کے مقرر لیکچر دے سکتے تھے۔ علمائے اسلام کے لئے بھی ایک دن مقرر تھا۔ اس قسم کی تقریریں گھنٹہ گھر کے نیچے بھی ہوتی تھیں۔ اور ان میں مولانا شرف الحق رح (مولانا امداد صابری کے والد جو صاحب حال و قال بزرگ تھے اور مولوی لٹھ کے خطاب سے مشہور تھے) اور مولوی حفیظ اللہ خاں اور دیگر علما حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ اجتماعات بالعموم شام کے وقت ہوتے تھے۔

عربی تعلیم کی ابتداء

غالباً ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا جبکہ مولانا کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی فوارہ پر تقریر کرتے تھے۔ سامنے نواب روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا۔ اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رح اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسے کے طلبہ بھی ان

تقریروں میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں میں سے حضرت مفتی اعظم ؒ کے ایک ہونہار ذی استعداد اور منتہی شاگرد مولانا قاری حافظ محمد یاسین سکندر آبادی بھی تھے۔ یہ مدرسہ حسینیہ میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے اور مولوی احمد سعید سے واقف تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی تقریر کی تعریف سُنی تو اپنے شاگرد سے کہا کہ اس نوجوان واعظ سے کسی وقت پوچھنا کہ اس نے کہاں پڑھا ہے اور کہاں تک پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف وعظ میں شریک ہوتے ہی تھے ختم ہوتے ہی نوجوان واعظ کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ نے کہاں پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف ایک طالب علم تھے اور نوجوان واعظ کو کم سے کم دارالعلوم دیوبند کا فاضل ترین فیض یافتہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ استاد محترم نے یہ خدمت کیوں میرے سپرد کی ہے؟

غرضکہ مولانا نے قاری صاحب کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا دیا اور اصل بات کا جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن پھر پوچھا مگر بات کو پھر ٹال دیا گیا۔ وہ ٹالتے رہے وہ پوچھتے رہے اور آخر نوجوان واعظ نے ایک دن یہ جواب دیا کہ "مولوی صاحب آپ یہ بات پوچھتے ہیں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ کہیں پڑھا ہو تو بتاؤں۔ بھئی میں نے تو کہیں نہیں پڑھا اور کچھ نہیں پڑھا۔ البتہ پڑھنے کی آرزو ہے۔" قاری صاحب موصوف کو یقین نہیں آیا۔ لیکن کچھ عرصے میں تعلقات بڑھے۔ زیادہ میل جول ہوا تو قاری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ اَن پڑھ ہیں۔ پھر انھوں نے مولانا کو رائے دی کہ آپ مدرسہ امینیہ میں داخلہ لے لیجئے اور علم حاصل کیجئے۔ مولانا نے کہا کہ بھئی مولوی صاحب! میں کیونکر پڑھ سکتا ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد سے گھر بار کا سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ شادی بھی ہو چکی ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہوں جب کہیں جا کر کام چلتا ہے اور آذوقہ نصیب ہوتا ہے ان حالات میں داخلہ لے کر پڑھنے کی فرصت کہاں؟

مگر اُن کو پڑھانا اور اِن کو پڑھنا مقدر تھا۔ قاری صاحب نے اپنے استاد محترم سے اجازت لے کر مولانا کے گھر جا کر رات کے وقت پڑھانا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ اس صورت میں قاری صاحب کا حرج ہوتا تھا وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اس لئے مولانا سنہری مسجد میں ہی جا کر رات کو ان سے پڑھنے لگے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن میں مولانا مال تیار کر کے شام کو فتحپوری بازار کے دکانداروں کو دیتے ہوئے سنہری مسجد میں آ جاتے تھے۔ اور سبق پڑھ کر گھر جاتے تھے۔ ایک سال تک قاری صاحب نے ان کو پڑھایا اور جب ابتدائی کتابیں نکلوا چکے تو باضابطہ مدرسہ امینیہ میں داخلہ کرا دیا۔ یہ مولانا محمد یاسین وہی ہیں جن کو حضرت مفتی اعظم ؒ نے رائے پور (سی پی) میں بھیجا تھا۔ آپ نے وہاں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا۔ اور آخر دم تک اس کے مہتمم و صدر مدرس رہے اور جمعیۃ علمائے سی۔ پی کے صدر بھی رہے۔ اور یہ واقعہ مجھے قاری صاحب موصوف نے خود ہی سنایا تھا۔

مدرسے میں مولانا کا داخلہ شوال ۲۶ سنہ ۱۳۲۱ھ میں ہوا۔ اور شرح مائۃ عامل مفید الطالبین وغیرہ اسباق شروع ہوئے

مولانا کی سند میں مندرجۂ ذیل کتابیں درج ہیں:۔

تفسیر جلالین۔ تفسیر بیضاوی۔ صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف۔ نخبۃ الفکر۔ قدوری۔ کنز الدقائق۔ شرح وقایہ۔ ہدایہ اولین۔ ہدایہ اخیرین۔ اصول الشاشی۔ نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ ایساغوجی۔ مرقاۃ۔ شرح تہذیب۔ قطبی۔ ملا حسن۔ حمد اللہ۔ مناظرہ رشیدیہ۔ ہدیہ سعیدیہ۔ میبذی۔ مختصر المعانی۔ مطول۔ شرح مائۃ عامل۔ ہدایۃ النحو کافیہ۔ شرح جامی۔ مفید الطالبین۔ نفحۃ الیمن۔ قلیوبی۔ سبعہ معلقہ۔ دیوان متنبی۔

مولانا فرماتے تھے کہ مدرسے کے علاوہ میں نے خارج وقت میں کچھ گھر پر کچھ مدرسے میں حضرت مفتی صاحب سے اور بھی کتابیں پڑھی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کتابوں کے نام بھی بتائے تھے۔ ان میں سے صرف فتح الباری کا نام یاد ہے جس کا آخری پارہ ملتان جیل میں پڑھا۔ مولانا کے دیگر اساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی مرحوم مولانا محمد قاسم دیوبندی مرحوم۔ مولانا سید انظار حسین ہتس پوری مرحوم وغیرہ تھے۔

مدرسے میں باضابطہ داخلہ کے بعد تارکشی کا کام چھوٹ گیا تھا۔ اور وعظ و تبلیغ کے نذرانوں سے ہی گزربسر ہوتی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے حکم سے وعظ کا نذرانہ لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد کٹرہ ہرو محلہ فراش خانہ کی مسجد میں آپ نے ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ صبح کو آپ وہاں جا کر ترجمہ بیان کرتے تھے۔ وہاں سے مبلغ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ شروع میں سواری کے لئے ڈولی کا انتظام تھا۔ آپ ڈولی میں جایا کرتے تھے۔ پہلے زمانے میں مردوں کی سواری کے لئے بغیر پردے کی ڈولی یا یکے ہوتے تھے۔ اور عورتوں کے لئے پردہ دار ڈولی۔ تانگہ بعد میں ایجاد ہوا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے یکہ خرید لیا تھا۔ یہ ایک ترجمہ غالباً چودہ برس میں مکمل ہوا۔

قرآن شریف کا ترجمہ بیان کرنے کا رواج پہلے زمانے میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ غالباً صرف ایک جگہ یعنی مسجد نواب قاسم جان میں مولانا راسخ ترجمہ بیان فرماتے تھے۔ ان سے پہلے نواب قطب الدین خاں مصنف مظاہر حق کا نام سنا جاتا ہے۔

سرکار نظام سے مولانا کو مبلغ ۱۲۵ ماہانہ کا منصب بھی عطا ہوا تھا جو کئی برس تک جاری رہا۔ مگر تحریک خلافت میں کھلم کھلا حصہ لینے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ جب آپ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر دہلی کے دوسرے سیاسی قیدیوں مثلاً مولانا عبد اللہ چوڑی والے وغیرہ کے ساتھ میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے تھے تو شہر دہلی کے بعض متمول حضرات نے آپ کے اہل و عیال کے لئے کچھ وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ بھائی حاجی نذیر احمد میرٹھی وہ وظائف وصول کر کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے۔

عربی تعلیم سے فراغت

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو حضرت مفتی صاحب نے بطور معین مدرس کے مدرسے میں مقرر کیا۔ اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لئے دیدیں۔ اکابر مدرسہ کا معمول تھا کہ جو طلبہ ذی استعداد ہوتے تھے ان کو تعلیمی ٹریننگ دینے کے لئے مدرسے میں ابتدائی درجوں کا مدرس بنا دیا جاتا تھا۔ یہ بالعموم بلا تنخواہ ہوتے تھے۔ اور جب کسی مدرس کی جگہ خالی ہوتی تھی تو مدرسے میں ہی ان کو باضابطہ منصب مل جاتا تھا۔ یا ایسا ہوتا تھا کہ ضرورت مدرس کے متعلق کوئی خط کہیں سے آتا تھا تو ٹرینڈ معین مدرس کو وہاں بھیجدیا جاتا تھا۔ اس قسم کے معین مدرس سب سے پہلے مولانا حافظ قاری محمد یاسین سکندر آبادی تھے۔ ان کے بعد مولانا حافظ حکیم محمد ابراہیم راندیری۔ مولانا مفتی حافظ سید مہدی حسن شاہجہانپوری مولوی عبدالمنان آروی۔ مولانا مفتی محمد عبدالغنی صدر مدرس وصدر مفتی مدرسہ امینیہ۔ مولوی مشتاق احمد دہلوی۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند۔ اور بہت سے حضرات کے نام مدرسے کی رودادوں میں ہیں۔

مولانا کئی سال تک مدرسے کی تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے اور ایک مربی کامل کی نگرانی میں یہ جوہر قابل جلا پاتا رہا۔ وہ علمی خزانہ جو اندر بھرا جا چکا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب مولانا کی تقریر اڑاتی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ ٹھوس مدلل مربوط ہونے کے ساتھ زبان کی لطافت و شیرینی اور فصاحت و بلاغت کا امنڈتا ہوا دریا تھا۔

مناظرے کی تربیت

یہ مناظروں کا دور تھا۔ اس دور میں مولانا نے زبردست اور معرکۃ الآرا مناظرے کئے۔ اس وقت آریوں میں بھی بڑے بڑے فاضل مناظر اور خطیب موجود تھے۔ پنڈت رام چندر دہلوی کا نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ قرآن مجید عمدہ پڑھتا تھا۔ اور بڑا طرار ولسان تھا۔ مولانا نے اس سے بھی مناظرے کئے۔ اور مولانا کی خطابت سب پر غالب رہی۔

مناظروں کے لئے پنڈال بنائے جاتے تھے۔ تیس چالیس ہزار تک کا مجمع ہوتا تھا۔ دور دور کے شہروں سے لوگ سننے کے لئے آتے تھے۔ آمنے سامنے دو اسٹیج اتنے فاصلے پر بنائے جاتے کہ ایک اسٹیج پر بولنے والے کی آواز دوسرے اسٹیج تک پہنچ جائے۔ لاؤڈ اسپیکر اس زمانے میں نہیں تھا۔ بیچ میں اور چاروں طرف مجمع ہوتا تھا۔ اسٹیج پر دو آدمی بیٹھتے تھے۔ ایک مناظر اور ایک معاون۔ معاون مناظر کی رہنمائی اور امداد کرتا رہتا تھا۔ اس کو ضروری نکات یاد دلاتا تھا۔ کتابوں کے حوالے نکالتا تھا۔ مناظر کھڑا ہو کر بولتا تھا اسی طرح باری باری سے دونوں مناظر تقریر کرتے تھے۔

مولانا احمد سعید جب مناظرہ کرتے تھے تو ان کے معاون حضرت مفتی اعظم ؒ ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ خود حضرت بھی اپنے ابتدائی عہد میں زبردست مناظر تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ میں شاہجہانپور سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام البرہان تھا۔ اس میں قادیانیت کا رد کیا جاتا تھا۔

مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور حضرت مفتی صاحب کی اعانت گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ اس طرح مولانا نے بڑے بڑے میدان جیتے۔ان مناظروں نے مولانا کے انداز بیان کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا کی ظرافت مناظرے میں بھی اپنا رنگ دکھاتی اور مجمع کو ہنساتی تھی۔

ایک مرتبہ پنڈت مراری لال سے مناظرہ ہوا۔ آپ نے دوران تقریر میں کہا کہ "پنڈت جی! میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کے نام میں مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کا نام میم کے پیش سے ہے یا زبر سے؟

ایک مرتبہ پنڈت رام چندر دہلوی سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ پنڈت جی نے کہا "مولوی جی! یہ دلیل ہے دلیل تانبے یا چاندی کا تار نہیں ہے۔ جس کو آپ کھینچ تان کر بڑھا لیں اور اپنے مطلب کا بنا لیں۔ یہ دلیل ٹس سے مس نہ ہوگی" مولانا نے اپنی باری پر فرمایا۔ "پنڈت جی! میری دلیل برہان قطعی ہے۔ یہ سونے کی ڈلی نہیں ہے فولاد ہے۔ یہ آپ کی کھٹ کھٹ سے نہیں پچکے گی۔ (واضح ہو کہ پنڈت جی سنار کا کام کرتے تھے)۔

ایک مناظرہ میں جو چاوڑی بازار دہلی میں ہوا تھا۔ پنڈت رام چندر نے سوال کیا کہ ارادہ کی تعریف کیا ہے؟ مولانا چونکہ معقولات میں بھی اور علم کلام میں بھی کچھ کمزور تھے۔ کھڑے ہونے سے پہلے حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا۔ مفتی صاحب نے اس سوال کی گہرائی بتائی اور جواب تعلیم فرمایا۔ پنڈت جی بولے "ہاں! خوب کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ مولوی جی! بالکل خالی ہو کیا؟ مولوی کفایت اللہ سے پوچھ کر جواب دو گے؟ مولانا نے فوراً جواب دیا۔ انھیں کی جوتیوں کا صدقہ ہی تو ہے کہ میں ڈٹ کر تمھارا مقابلہ کر رہا ہوں اور سامنے کھڑا ہوا بول رہا ہوں۔ ان سے نہیں پوچھونگا تو اور کس سے پوچھونگا؟ یہ میرے استاد ہیں۔ استاد سے پوچھنے میں تمھیں شرم آتی ہوگی۔ میرے لئے تو ان سے پوچھنا باعث فخر ہے۔

ایک مناظرے میں مقابل نے کہا کہ "تم کہتے ہو، پیغمبر صاحب پر جبریل کے ذریعے سے وحی آتی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ وحی کے لئے واسطے اور ذریعے کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے رشیوں کے ہردے پر بلا واسطہ القا ہوتا تھا۔" حضرت مفتی اعظمؒ نے صرف اتنا فرمایا کہ "ہردے تو خود ایک واسطہ اور ذریعہ ہے" یہ اشارہ پا کر اس رہنمائی کی بنیاد پر مولانا نے کھڑے ہو کر جو تقریر کی ہے تو لوگ عش عش کر گئے۔ اور مقابل کو لاجواب ہونا پڑا۔

ایک اور مناظرے میں مقابل نے حضرت مفتی صاحب کی رہنمائی پر تعریض کی تو مولانا نے فرمایا کہ "پنڈت جی! جو کچھ ہے استاد کا فیض ہے۔ میری تقریر میں تو زبان میری ہے۔ دماغ استاد کا ہے"۔

مسند بغیر سند

شوال ۱۳۳۱ھ سے مولانا بطور معین مدرس کے مدرسہ امینیہ میں پڑھا رہے تھے۔ اور خود بھی پڑھ رہے تھے شعبان ۱۳۳۶ھ میں مدرسے سے اپنی تعلیم ختم کرکے

فارغ ہوئے۔ مگر چونکہ ملازمت کے لئے کہیں جانا نہیں تھا اس لئے مدرسہ کی مطبوعہ سند حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں جبکہ مسلم لیگ والوں سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی کشتی پھنسی ہوئی تھی یہ خبر بڑے زور سے اڑائی گئی کہ مولانا سند یافتہ عالم نہیں ہیں۔ اب مولانا کو سند حاصل کرنے کا خیال آیا چنانچہ سند لینے کی تاریخ ۱۵ر محرم ۱۳۶۱ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۴۲ء ہے۔ سند میں جو کتابیں درج ہوئی ہیں ان میں منیۃ المصلی اور شرح عقائد کا نام نہیں ہے۔ مگر ریکارڈ میں ان دونوں کتابوں کا نام موجود ہے۔

سیاسی و ملی خدمات

۱۹۱۹ء میں حضرت مفتی اعظمؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے قیام و تاسیس کے لئے دیگر علمائے ہند سے جو مذاکرات فرمائے ان میں آپ کے دست راست اور رفیق کار مولانا احمد سعید ہی تھے جو ہر ایک کام میں اور ہر ایک مجلس میں شریک رہتے تھے۔ مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی اعظم کا جو خاص کمرہ تھا اسی میں پہلا دفتر قائم ہوا۔ اور وہیں بیٹھ کر یہ دونوں استاد شاگرد اس کے تمام ابتدائی امور انجام دیتے تھے۔ ہندوستان بھر کے تمام علماء کی مکمل فہرست مفتی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی۔

ان حضرات کی تحقیق و تلاش اور محنت و کاوش قابل ستائش ہے کشمیر سے راس کماری تک اور پاغستان سے برما تک کے نہ صرف شہروں اور قصبوں سے بلکہ ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں سے گوشہ نشین اور گمنام علماء کا کھوج نکالا اور سب کو لاکر ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہ کام نہ صرف محنت طلب تھا بلکہ خطرناک بھی تھا۔ برٹش امپائر کے خلاف لب کشائی کرنا اس وقت جان کی بازی لگانا تھا۔ عوام تو عوام بیشتر علماء کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ اب انگریزوں کی حکومت سے کبھی چھٹکارا نہیں ملے گا۔

مدرسہ امینیہ میں ہمارے اساتذہ میں سے ایک عالم باعمل حضرت مولانا حافظ محمد عبدالغفور صاحب عارف دہلوی بھی تھے۔ کوچہ رائمان میں رہتے تھے۔ فارسی کے مدرس اور نائب مہتمم تھے۔ عمر میں حضرت مفتی صاحبؒ سے بڑے تھے۔ مفتی صاحب نے جب آزادی کی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو اکثر وہ جھگڑتے تھے۔ فرماتے تھے کہ دیکھو مولوی کفایت اللہ! تم بے کار کام کر رہے ہو۔ مسلمانوں کو الجھاؤ میں ڈال رہے ہو۔ یہ سیاسی لیڈر سب پاگل ہیں۔ آزادی وازادی اب نہیں ملے گی۔ ان انگریزوں کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی آکر بار لگائیں گے۔ تم خواہ مخواہ مصیبت میں پڑتے ہو۔

ایسی ہی مایوسانہ کیفیت تھی جو ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کے بعد علماء پر بھی طاری تھی جس کی وجہ سے

علماء گمنامی و گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور حال یہ تھا کہ ایک صوبہ کے علماء کو دوسرے صوبہ کے عوام تو عوام خواص بھی نہیں جانتے تھے۔ ان علماء کا فیض اپنے اپنے شہروں اور خاص خاص حلقوں میں محدود تھا لیکن جمعیۃ علماء کے رشتے میں منسلک ہونے کے بعد تمام ہندوستان و برما کے علماء مثل ایک خاندان کے ہو گئے۔ اور ان کی فیض رسانی نے بہت وسعت اختیار کر لی۔ (اس زمانے میں ملک برما بھی غیر منقسم ہندوستان کے ساتھ شامل تھا)۔

آفریں ہے اُن اولوالعزم لوگوں کی ہمت پر جو اپنی اَن تھک کوشش اور محنت و جاں فشانی سے اتنے عظیم الشان ادارے تخلیق کر گئے۔ رسل و رسائل کی وسعت آج جتنی ہے پہلے اتنی نہ تھی۔ اس زمانے میں گوشہ نشین علماء کو چپے چپے سے تلاش کر کے لانا۔ روشناس کرانا۔ مختلف الخیال اور متفرق المسلک علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا بہت بڑا کام تھا۔ جس کا سہرا کارکنان قضاو قدر نے حضرت مفتی اعظمؒ اور ان کے دست راست و رفیق کار مولانا احمد سعید۔ اور مولانا ابو الحسنات عبد الباری مولانا ابو الوفا ثناء اللہ۔ مولانا آزاد سبحانی وغیرہم کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ پھر تمام علماء نے جمعیۃ کو چلانے اور آگے بڑھانے کا عملی کام باتفاق رائے اول الذکر حضرات کے سپرد کیا۔ یہی کام سب سے زیادہ مشکل اور اہم تھا۔ ان حضرات نے کس طرح اس کو چلایا؟ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ چہ جائے کہ کوئی عملی نمونہ پیش کرنا۔

سرمار غم عشق بوالہوس را ندہند	سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار	ایں دولت سرمار ہمہ کس را ندہند

ملک میں دورے کر کے جماعت کو روشناس کرانا۔

بے لوث خدمت اور اَن تھک محنت

اس کی سیاسی ضرورت و اہمیت کو عوام کے ذہنوں میں جاگزیں کرانا۔ اس کے چلانے کے لئے مالی اعانت پر مسلمانوں کو تیار کرنا۔ لیڈروں سے سیاسی مذاکرے اور اشتراک عمل کرنا۔ ان ذمہ دارانہ کاموں کے ساتھ خود ہی دفتر کے کاروبار کو بھی چلانا۔ آمد و خرچ کا حساب کتاب رکھنا۔ لکھنا مرتب کرنا۔ تمام ہند اور بیرون ہند کے علماء و اکابر سے خط و کتابت اور ربط قائم رکھنا۔ ڈاک تیار کرنا۔ رجسٹر پر چڑھانا۔ ڈاکخانہ کا کام انجام دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام اور ان کے ملحقات۔ اور بس صرف دو آدمی۔ نہ کوئی محرر نہ چپڑاسی۔ مولانا احمد سعید نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "یہاں مفتی صاحب! دفتر جمعیۃ کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس طرح چلایا ہے کہ حضرت تو حساب کتاب لکھتے تھے اور میں ڈاک تیار کر کے خود ڈاکخانہ لے جاتا تھا۔"

واضح ہو کہ مولانا جب حضرت مفتی اعظمؒ کے مکان پر تشریف لاتے تھے تو **میاں حفیظ الرحمان!** ہمیشہ میاں حفیظ الرحمان کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک آخر میں ان کے مکان پر جب میں حاضر ہوتا تھا تو میاں مفتی صاحب کہتے تھے۔ لیکن وہ وضعداری اب بھی قائم تھی۔ یعنی حضرت مفتی اعظم کی وفات کے بعد بھی جب کبھی مکان پر تشریف لائے۔ میاں حفیظ الرحمان! کہہ کر ہی آواز دی۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس انداز خطاب اور طرز ندا سے روح کو جو مسرت ہوتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے خطاب سے نہ ہوتی تھی۔ آج میاں حفیظ الرحمان کہہ کر پکارنے والا خاموش ہے اور کان اس کی آواز کے منتظر ہیں۔

حضرت کے مکان پر آنے والے اور میاں حفیظ الرحمان کہہ کر پکارنے والے ایک تو مولانا مرحوم تھے۔ دوسرے بھائی اکرام ہیں (اللہ ان کو سلامت رکھے) اول الذکر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مؤخر الذکر کی آمد و رفت سنہ ۱۹۳۹ء میں صدارت علمی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ یعنی حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ کی صدارت سے ہٹ گئے تو قاضی اکرام الحق صاحب کا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔ اور شاید کبھی آئے بھی ہوں تو میاں حفیظ الرحمان کہہ کر نہیں پکارتے۔

اے دل کی واردات لکھنے والے قلم! ذرا تھم تو سہی! یہ صریر خامہ ہے یا کسی کی پکار ہے؟ سُن! یہ روح کو جگانے والی آواز کس کی ہے؟ میں لکھتے لکھتے تصور کی دنیا میں جا پہنچا۔

اُڑا جاتا ہے دل بھی روح کے ساتھ ۔۔۔ تری آواز آتی ہے کہیں سے (واصف)

مولانا نے میاں حفیظ الرحمان! کہہ کر آواز دی ہے۔ والد مرحوم نے حفیظ الرحمان کہہ کر پکارا ہے فرماتے ہیں مولوی صاحب کو بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ داخل ہو رہے ہیں اور فرماتے ہیں میاں! تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا چلئے نہا رہے ہیں فرماتے ہیں میاں تو ہمکو چائے نہیں پلاؤ گے؟ اتنے میں حضرت خود چائے لیکر آ گئے ہیں۔ اور پھر دونوں ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور مجھ کو بھی مولانا نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا ہے۔

اب ہم حضرت مفتی اعظم کے متین اور باوقار چہرے کو اور مولانا کے ہنستے ہوئے چہرے کو یاد کیا کریں گے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکے یا نہ ٹپکے۔ دل کی آنکھیں خون کے آنسو برسانی رہیں گی۔

غرضکہ جمعیۃ علماء کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحریکات نے زور پکڑا۔ **سیاسی تحریکات** رولٹ بل کے خلاف پھر جو خلافت کی تحریک کے نام سے مشہور ہے اس میں جمعیۃ علمائے ہند کی زیر قیادت بھی مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت ہندو مسلمانوں کا اتحاد نقطۂ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے بھی علماء اور عوام بے دھڑک جیلوں کو بھر رہے

تھے۔ مولانا احمد سعید ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوکر میانوالی جیل میں رہے۔ ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی۔ ان تمام تحریکاتِ آزادی میں مولانا کو آٹھ مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۱۹۳۲ء کی تحریک میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں بھی رہے۔

۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو جبکہ گاندھی جی نے بمقام باردولی سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کردیا، انگریزوں کو بڑی حد تک سکون نصیب ہوا۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم تھی اور انگریزوں کے دل میں یہ دھڑکا رہتا تھا کہ اگر یہ دونوں متحد ہوکر پھر کوئی تحریک شروع کردیں گے تو اب کے حکومت برطانیہ کی چولیں ہی ہل جائیں گی۔ اور عزت سنبھالنی مشکل ہوجائے گی۔

شدھی کا زمانہ

"چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندو مسلمانوں کے مشترک جلوسوں اور جلسوں کو دبانا چاہا تو اس کے خلاف بلوے ہوئے۔ اور ہندو مسلمان اور زیادہ متحد ہوگئے۔ اور یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ چوراچوری کے واقعہ کے بعد ۱۹۲۲ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بُلاکر گفتگو کی۔ اور اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی ان کو رہا کردیا گیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے شدھی کا کام شروع کردیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔ شدھی اور سنگھٹن چونکہ کانگریسی لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئیں۔ اس لئے ملک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بدگمانیاں ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڈھ میں میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اس پر اخبار البشیر اٹاوہ نے اعتراض کیا کہ اُس تعلیمی جلسے کے مقاصد و قواعد کے خلاف ایک سرکاری عہدہ دار نے ایک مذہبی مسئلہ کیوں چھیڑا۔ اور اس پر اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ بالآخر یہ شبہ صحیح نکلا۔ کیونکہ فوراً ہی ہندو مسلمانوں کی طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ ہوگیا۔ اور پھر جو ہندو مسلم بلوے شروع ہوئے تو انھیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی۔" (روشن مستقبل)

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ میں یہ عہد بے انتہا نازک اور آزمائشی عہد تھا۔ ادھر تو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد جس کے لئے ہندوستان کی تمام قوموں کا متحد ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ارتداد سے بچانا۔ غرضکہ انگریز کا یہ ایک ایسا بھرپور وار تھا جس نے پورا کام کیا اور ملک کی آزادی پچیس برس کے لئے مؤخر ہوگئی۔ اس وقت اکابر جمعیۃ کا فہم و تدبر سخت آزمائش میں تھا۔ ملک کے چپے چپے پر

ہندو مسلمانوں میں فساد اور خوں ریزی ہو رہی تھی۔ اللہ رب العزت ان اکابر کی روحوں پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے ارتداد اور شدھی کا مقابلہ بھی پوری جوانمردی عالی ہمتی اور عزم راسخ کے ساتھ کیا اور وطن کی آزادی کے لئے بھی لڑتے رہے۔ خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را۔

تبلیغی وفود

سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک ملکانوں کے علاقے سے شروع کی تھی۔ اور ہزارہا ملکانوں کو مرتد کر دیا تھا۔ اس زمانے میں حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر، اور مولانا احمد سعید ناظم تھے۔ حضرت نے جمعیۃ علماء کی طرف سے بھی اور مدرسہ امینیہ کی طرف سے بھی بے شمار تبلیغی وفود مرتدین کے علاقوں میں بھیجے۔ اور سب سے پہلا وفد تو غالباً خود ہی اچھنیرے کے مقام پر لے کر گئے تھے۔ مولانا محمد حسن دوحدی جو اُس وقت مبین مدرس تھے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب وفد لے کر گئے گاؤں میں پہنچ کر ایک جگہ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ وفد میں مولانا دوحدی کے علاوہ دو تین طالب علم تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ جگہ تو مناسب نہیں ہے۔ فرمایا کہ چپکے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ گاؤں والے چند طلبہ کو دیکھکر جمع ہو گئے۔ پھر آپ نے تقریر فرمائی۔

ان وفود کے صدر کبھی حضرت مولانا وحید حسن خاں ٹونکی مرحوم مدرس مدرسہ امینیہ اور کبھی مولانا محمد عرفان مرحوم نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند و مدیر اخبار الجمعیۃ اور کبھی مولانا احمد سعید اور کبھی دیگر حضرات ہوتے تھے۔ مرتد ملکانوں کے علاقوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قدم قدم پر فتنہ و فساد کا اندیشہ اور جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

مولانا کا اندازِ خطابت

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کے پاس خبر پہنچی کہ فلاں گاؤں پورا کا پورا مرتد ہو گیا ہے۔ حضرت نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ مولانا دل کے کمزور تھے ہچکچا رہے تھے۔ بہت کچھ حیلے بہانے کئے مگر حضرت کا حکم تھا۔ مجبوراً روانہ ہوئے۔ گاؤں میں پہنچ کر حالات معلوم کیے اور خاص کر یہ بات دریافت کی کہ آریہ لوگ آکر ان گاؤں والوں سے کیا کہتے ہیں؟ اور کیونکر بہکاتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ "تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے آکر تم کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اور تمہاری چوٹیاں کاٹیں۔" اب مولانا کا طرز استدلال اور شان خطابت ملاحظہ فرمایئے۔ آپ نے جلسے کا اعلان کرایا۔ اور کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"آج اس گاؤں میں آکر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی

ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی ہے۔
اور بھئی! مجھے ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جو تمہارے باپ دادوں کو تمہارے مونھ پر بزدل
اور ڈرپوک کہتے ہیں، اور تم جو ان سورماؤں کی اولاد ہو سنتے ہو اور برا نہیں مانتے۔ لوگ تمہیں آکر بہکاتے
ہیں کہ تمہارے باپ دادوں کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا۔ اور ان کی گردنیں
پکڑ پکڑ کر چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں، کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟
مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے
باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے
مسلمان ہوئے تھے۔ کیا اب تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا
رہے ہو؟

تقریر ختم ہونے کے بعد گاؤں کے لوگ ازسرِ نو مسلمان ہو گئے۔

اکابر بھی مان گئے

آپ کی طرزِ خطابت کے ایسے ہی سینکڑوں کرشمے اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔ جن سے ذہنیت اور خیال بدل جاتے تھے۔ فتنہ و فساد کے عزائم پست پڑ جاتے تھے۔

بریلی میں مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کو خراب کرنے کے لئے کئی سو آدمی اپنی بغلوں میں چھرے چاقو چھپا کر آئے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ نے کھڑے ہو کر تین گھنٹے تقریر کی۔ فسادیوں کے مفسدانہ عزائم پر اوس پڑ گئی۔ کوئی چوں بھی تو نہ کر سکا۔ کانفرنس امن و عافیت کے ساتھ جاری رہی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد جیسے آتش بیان خطیب نے اٹھ کر مولانا کو گلے لگایا اور فرمایا کہ "مولانا اگر آپ ہمیشہ ایسی ہی تقریر کیا کرتے ہیں تو دنیائے اسلام میں آپ کا جواب نہیں ہے"۔

پھر ایک نیا گل کھلا

ابھی اکابر جمعیۃ آریوں کی مدافعت میں مصروف تھے کہ بیچ میں ایک اور مصیبت پیش آگئی۔ بریلوی حضرات بھی تبلیغ کے میدان میں دوڑنے لگے۔ اور گاؤں میں جا کر یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھنا یہ دیوبندی لوگ کافر ہیں۔ بہت کچھ کافر کافر کہتے رہے مگر دیہاتیوں پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ اور انھوں نے دیوبندیوں کے تبلیغی اجتماعات میں حاضر ہونا بند نہ کیا۔ تو دوسری ترکیب سوجھی۔ یعنی وہابی کہنا شروع کیا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ دیہاتیوں نے جہاں یہ لفظ سنا اور بھڑکے۔

اس لفظ کی تاثیر پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بطور جملہ معترضہ کے اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک گاؤں کی مسجد کے امام صاحب ایک ہندو بنیے سے اُدھار سودا لیا کرتے تھے۔ تھوڑا بہت قرضہ ادا بھی کردیتے تھے۔ جب بقایا زیادہ ہوگئی تو بنیے نے سودا دینا موقوف کردیا۔ امام جی نے پہلے تو خوشامد کی۔ جب نہیں مانا تو کہا۔ دیکھو لالہ جی! تمھاری دوکان کو نقصان پہنچے گا! مسلم اکثریت کا گاؤں تھا۔ اور لالہ جی کے خریدار سب مسلمان ہی تھے۔ امام جی نے نماز کے بعد نمازیوں سے خطاب کیا اور کہا۔ "دیکھو بھائیو! فلاں لالہ سے سودا ہرگز نہ خریدنا۔ یہ وہابی ہوگیا ہے" بس پھر کیا تھا۔ یہ خبر آناً فاناً بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ لالہ جی کی دوکان پر اُلّو بولنے لگا۔ صبح سے شام تک بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے۔ جب کئی دن ہوگئے۔ اس کو بڑا فکر لاحق ہوا۔ تحقیق و جستجو کے بعد اصل بات معلوم ہوئی تو ضروری سامان (آٹا دال وغیرہ) لے کر ملاجی کے پاس آیا اور کہا کہ ملاجی تم جتنا چاہو سامان لے لیا کرو۔ جب ملاجی راضی ہوگئے تو ایک روز نمازیوں سے خطاب کرکے کہا کہ "دیکھنا بھائیو! وہ لالہ میرے پاس آیا تھا اس نے توبہ کرلی ہے اب اس سے سودا لے لیا کرو۔ لوگ مطمئن ہوگئے اور اس کی دوکان پھر چل پڑی۔

غرضکہ علماء کے راستے میں یہ ایک اور پہاڑ حائل ہوگیا۔ ایک موقعہ پر ایک گاؤں میں تبلیغی جلسہ ہونے والا تھا۔ گاؤں والوں سے کہا گیا کہ یہ لوگ وہابی ہیں۔ ان کی تقریر نہ سنا کرو۔ اور دیکھو اپنے جلسے میں کبھی نہ بلانا۔ ان کے وہابی ہونے کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ قیام نہیں کرتے سلام نہیں پڑھتے۔ جلسے کے منتظمین معتدل المزاج تھے۔ انھوں نے سب کو بلوادیا۔ بریلوی علماء کے ساتھ ہی دیوبندی علماء بھی پہنچے۔ مگر بریلوی حضرات نے جلسے کے شروع میں میلاد شریف شروع کردی۔ قیام کے وقت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مرحوم اور انکے رفقاء نے جو دیوبند سے آئے تھے قیام نہیں کیا حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے قیام کیا۔ ان کو دیکھکر مولانا احمد سعید وغیرہ بھی کھڑے ہوگئے۔ مگر دل میں سوچ رہے تھے کہ حضرت نے اپنے مسلک کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ جلسے میں بریلوی حضرات نے اپنی تقریروں میں سارا زور وہابیت کی تردید و تنقیص میں خرچ کرڈالا۔ دیوبندی حضرات نے اپنی تقریروں میں ان اختلافی مسائل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خالص تبلیغی تقریریں کیں۔

اس جلسے کا عوام پر اچھا اثر ہوا۔ دوسرے دن صبح کو ہر جگہ یہ تذکرے ہورہے تھے کہ بھئی یہ حنفی مولوی جو آئے تھے انھوں نے تو اپنی تقریروں میں اسلام کی کوئی بات نہیں کہی۔ بس یہی کہتے رہے کہ فلاں کافر ہے فلاں وہابی ہے۔ ایک بولا یہ گلابی وہابی کونسی قوم ہے جس کا وہ نام لے رہے تھے؟ ایک بولا۔ ارے چودھری! دیکھیو! تقریریں تو دلی کے مولویوں کی بڑی چوکھی تھیں۔ بس اسلام کی باتیں کہیں۔

اور اللہ رسول کی باتیں سنائیں۔ بھئی ہم تو اب انھیں کو بلایا کریں گے۔ یہ حنفی مولوی تو ہم کو لڑواتے رہتے ہیں۔
جلسہ ختم ہونے کے بعد مولانا نے حضرت مفتی صاحب سے قیام میں شریک ہونے کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا کہ یہ اختلافی مسائل ہیں۔ ان میں شدت اختیار کرنا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نومسلموں کو اپنی طرف مائل کرنا اور محبت کا برتاؤ کرنا اس وقت ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اگر علماء کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی تو ان کو خدا کا پیغام پہنچانا مشکل ہو جائے گا اور ایک اہم تر مقصد فوت ہو جائے گا۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہٗ کے فہم و تدبر کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔ اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے فراخدلی اور رواداری برتتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طبقے کے مسلمانوں کے سر ان کے ادب و احترام میں جھک جاتے ہیں۔ اور ہر مسلک کے مسلمان آج ان کی کمی محسوس کر کے آبدیدہ ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ رواداری تھی۔ مداہنت یا تسلح نہیں تھا۔ آپ نے کبھی اپنے مسلک میں تبدیلی نہیں کی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ نیز اسلامی شعائر کے معاملے میں کبھی نرمی نہیں برتی۔ غیر مسلموں کی خالص مذہبی تقاریب میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ دعوتوں اور ٹی پارٹیوں میں اسلامی آداب اور مشرقی معاشرہ کو ترک نہیں کیا۔ اپنے بیس برس کے دور صدارت میں اخبار الجمعیۃ کے صفحات پر تصویر شائع کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

جمعیۃ علمائے ہند کے اندر انقلاب

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی تھی۔ اس کی صدارت کے لئے حضرت مفتی اعظمؒ کو اور نظامت کے لئے حضرت مولانا احمد سعید کو منتخب کیا گیا تھا۔ جب ان حضرات کی محنت شاقہ سے جمعیۃ نہ صرف ہندوستان و برما میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں روشناس ہوگئی۔ اور اس پودے کی پھننگ آسمان سے باتیں کرنے لگی اور اس کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔ تو بعض حضرات کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف المسلک علماء کی باگ ڈور دیوبندی حضرات کے ہاتھ میں کیوں ہے؟ ۱۹۲۲ء ۱۳۴۱ھ میں جبکہ جمعیۃ علماء کی سالانہ کانفرنس شہر گیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس قلبی خلش کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جمعیۃ کی صدارت کے

خلاف بھی کھچڑی پکنے لگی۔ مگر جن اکابر بیشتر اور مخلص علماء نے مل کر جمعیتہ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس کے اندر اختلاف کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے روزنامچہ (قلمی) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولوی سبحان اللہ صاحب اور ان کے ہمراہی مولوی عبد العزیز وغیرہ نے آخر ماہ میں آکر ملاقات کی۔ مولوی سبحان اللہ نے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ دیوبند کے علماء کا اثر جمعیتہ علماء میں زیادہ ہوتا جاتا ہے اس کا تدارک کرنا چاہیئے۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ جمعیتہ علماء کے مقاصد ایسے ہیں کہ جن میں ان کا زور ہونا ہمارے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس کو ہم نے سمجھ کے کیا ہے۔ ہماری اور ان کی کوئی دنیاوی مغایرت نہیں ہے۔ نہ ان کو غیر کرنے سے فائدہ ہے۔ بلکہ ہمارے اثر کا نقصان ہے۔ علاوہ ازیں اگر ان کا اثر جمعیتہ علماء پر نہ ہو تو پھر وہ جماعت علماء کہاں سے آئیگی جس کا اثر ہو۔ ان کے مدارس اور تلامذہ اطراف واکناف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے ہم کو استغنا نہیں ہے۔ نہ ان کے اثر کے کم کرنے سے ہمارا کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے۔

پھر انھوں نے مسئلہ امیر شریعت چھیڑا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دیوبند کی عصبیت کا باعث میں ہوں۔ شاید امیر شریعت کو اپنے ہم خیال علماء سے بنانے کی تجویز کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا۔ اور صاف کہدیا کہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ جمعیتہ علماء کے حال کے طرز عمل نے مجھے اور بھی اس کے نقائص کی طرف زائد توجہ دلادی ہے۔ میں اس کی موافقت ہی نہیں کرتا۔ مگر آپ لوگوں کی رائے کی وجہ سے سکوت کروں گا۔ مخالفت نہ کروں گا۔ میں شریعت اسلامیہ میں سوائے خدا اور رسول کے کسی کے احکام کو بے چون وچرا نہیں مان سکتا ہوں۔ اگر جمعیتہ علماء ایک عبد حبشی کو امیر شریعت مقرر کردیگی میں اس کی مخالفت نہ کروں گا۔ جو احکام خدا و رسول کا پابند رہوں گا۔ دیوبند کے علماء سے قوی امید ہے کہ مسائل اختلافیہ کسی قسم کے پیش نہ کریں گے۔ نہ اپنے مخصوص مسائل میں مجھے مجبور کریں گے۔ ان کے انتخاب سے فائدہ کی امید زیادہ ہے بہ نسبت نقصان کے۔ میں نے کہا کہ اگر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اور مولوی آزاد سبحانی صاحب اور مولوی عبد القدیر صاحب کے متعلق رائے لی جائے تو کون شخص اول الذکر کو مقدم نہ کرے گا۔ خدا نے ان کو تقدم دیا ہے۔ میں خود اس تفریق کو کہ یہ دیوبند کے ہیں اور وہ نہیں، کبھی نہ خیال میں رکھتا تھا نہ اب اس کا لحاظ کرونگا۔ الخ

باوجود اس روک تھام کے جمعیۃ علماء کی لیڈرشپ کو بدلنے کے منصوبے بنتے رہتے تھے حضرت مفتی اعظم نے جب محسوس کیا کہ مختلف اسباب (مثلاً خاندانی مفاخر اور نسلی امتیازات کا فقدان نیز دیوبندیت وغیرہ) کی وجہ سے علمائے کرام صدارت سے گرانی محسوس کر رہے ہیں تو ایک میٹنگ میں صدارت سے استعفا پیش کر دیا لیکن جب استعفا پیش ہوا تو متفقہ طور پر سب نے اس کی منظوری سے صراحۃً انکار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرکزی نظام میں صدر دفتر رہنے کی صورت میں حضرت مفتی اعظم کی صدارت ناگزیر تھی۔ جب کبھی آپ نے صدارت سے علیحدگی کا ارادہ کیا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی۔ آخر ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔

دیوبند کی انقلابی جماعت دار العلوم دیوبند میں جو حضرات صاحب اختیار تھے ان کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ان کے خلاف ایک کوہ آتش فشاں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہ فتنہ ستمبر ۱۹۲۷ء میں پوری قوت سے طلبہ کی اسٹرائک کی صورت میں ابھرا۔ اگرچہ یہ انقلابی تحریک مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم کی اولو العزمی اور تدبر کی وجہ سے پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن دار العلوم کی انتظامی باڈی میں کچھ اصلاحات کا سلسلہ ضرور شروع ہو گیا۔ انقلابی جماعت نے یہاں کی ناکامی کے بعد ڈابھیل کا رخ کیا اور وہاں ایک جامعہ ع. بیہ قائم کیا، مگر فضا ساز گار نہ ہوئی۔ جماعت کے افراد منتشر ہونے شروع ہو گئے۔ کچھ افراد نے کلکتہ کا رخ کیا، مگر وہاں جا کر منگیں اور بھی سرد پڑنے لگیں۔ آخر دہلی کا رخ کیا۔ انقلابی ذہنیت کے لئے بھی میدان مل گیا۔ دہلی کی آب و ہوا ہی ایسی ہے کہ ہر ابھرنے والی امنگ کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے اور ہر زنگ آلودہ جوہر کو جلا دیکر ابھارتی ہے۔

مولانا شبیر احمد بھٹہ جو مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے ان کا مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے کچھ اختلاف ہوا۔ اور بڑھتا رہا۔ ادھر اس انقلابی جماعت کے سرکردہ حضرات کی نظر دہلی پر پڑ ہی چکی تھی۔ ہم سفر مل گئے۔ منزل مقصود متعین ہو گئی "مولانا احمد سعید کے اقتدار کو ختم کرنا۔ اور جمعیۃ علمائے ہند کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لینا" رہنمائی کے لئے مولانا شبیر احمد مرحوم جیسا مدبر۔ نتیجہ میں مولانا احمد سعید کے لئے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ترک نظامت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں صدر و ناظم دونوں کا استعفا جمعیۃ کے سامنے آگیا۔

اسی زمانے میں مولانا شبیر احمد صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا کہ "دراصل ہمارا اختلاف ناظم صاحب سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو ہم کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ناظم صاحب کے بغیر مفتی صاحب صدارت پر رہنے کے لئے کسی صورت سے تیار نہیں ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کو جو تعلق مولانا سے تھا۔ اور رفاقت و تعاون کا جو جذبہ وہ

مولانا کے اندر پاتے تھے اس کی ابتدان کو اور کسی سے نہ تھی۔ اس وجہ سے بھی وہ بغیر مولانا کے اپنی صدارت گوارا نہ کر سکتے تھے۔

بہرحال ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ کی صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اور نظامت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی طرف منتقل ہو گئی۔ حضرت شیخ رح کی وفات کے بعد مولانا کو صدر چنا گیا اور دم واپسیں تک آپ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر تھے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے اور خاص کر دہلی و پنجاب کے

۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور اس میں مولانا نے (جو ڈیڑھ دو برس سے اختلاج وغیرہ مہلک امراض میں گرفتار تھے) اور ان کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم عمومی جمعیۃ علماء نے جو خدمات انجام دیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ بشرطیکہ مؤرخ فن تاریخ کے آداب اور اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر تاریخ لکھے۔ لیکن اس سیاسی عہد میں یہ امید نہیں۔ آج کے دور میں اسلاف کی قربانیوں اور مخلصانہ خدمات کو فراموش کر دینا اور ان کی یاد کو صفحات تاریخ سے محو کر دینا ہی انسانیت کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

رائگاں رندوں کے اوصاف جمیدہ ہو گئے	بوالہوس ان کی نظر میں برگزیدہ ہو گئے
میرے افسانوں سے دہلنے لیا درس جنوں	میرے افسانے بھی اب تو ناشنیدہ ہو گئے
بتکدے کی راہ لی تھی چھوڑ کر باب حرم	میری قسمت سے یہ آہو بھی رمیدہ ہو گئے
گرم ہو جاتا تھا جن سے نوجوانوں کا لہو	آج وہ افکار مرہونِ قصیدہ ہو گئے

قطرہائے خون دل کا کیا کہوں واصف مآل
دفن وہ بھی صورت اشک چکیدہ ہو گئے

اس دور ابتلا کا حال اور اس نامسعود انقلاب کی خوں ریزی کا تذکرہ چند صفحات میں نہیں سما سکتا۔ اور اُس وقت اکابر جمعیۃ نے جان کی بازی لگا کر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر جو خدمات انجام دیں ان کے لئے بھی بڑے بڑے دفتر درکار ہیں۔ کتاب "مختصر تذکرۂ خدمات جمعیۃ" سے آپ کو کچھ مختصر سا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

اُس زمانے میں ایک دن یہ افواہ سُنی گئی کہ کوچہ چیلاں سے جامع مسجد تک کے علاقے کو مسلمانوں سے خالی کرا لینے کی تیاری مکمل ہو گئی ہے۔ وہ رات سر پر کھڑی تھی جبکہ بلوائی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والے تھے۔ مولانا احمد سعید کو یہ پیغام دیا گیا کہ آپ اپنے متعلقین مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہماری حفاظت میں آجائیے۔ اس کا جو کچھ جواب مریض اختلاج مولانا احمد سعید نے دیا وہ ملا واحدی کے الفاظ میں سنیے۔ لکھتے ہیں:۔

ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ شاید وہی نجات کا ذریعہ ہوجائے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک بھیانک رات تھی۔ کرفیو کے باوجود کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ اور پکارا واحدی صاحب! میں مکان کی دوسری چھت میں تھا جہاں مردانہ تھا۔ میرے بڑے لڑکے مجتبیٰ واحدی نیچے اترے اور انھوں نے اطلاع دی کہ لالہ دیس راج ہیں۔ دیس راج میونسپل کمیٹی کے ساتھی تھے۔ علاقہ کا مسلمان ممبر میں تھا اور ہندو ممبر وہ۔ میں نے مجتبیٰ سے کہا بلالو۔ دیس راج صاحب بولے آپ ہی آئیے۔ خیر! میں گیا تو متعدد موٹریں کھڑی تھیں۔ لالہ دیس راج نے کہا کہ یہ مسٹر کرپلانی ہیں صدر انڈین نیشنل کانگریس کی دھرم پتنی۔ یہ مسٹر شانتی سروپ آہوجہ ہیں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ مسز کرپلانی نے سوال کیا "اس محلے میں تو امن ہے؟" میں نے کہا "ہاں اس محلے میں تو ابھی امن ہے مگر امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے۔" مسٹر آہوجہ بولے "مہاتما گاندھی کو اطلاع ملی ہے کہ یہاں خطرہ محسوس کیا جارہا ہے۔ آپ صاف صاف بتائیے کہ خطرے کا "وہم" کیوں ہے؟ مسز کرپلانی مہاتما جی سے کیا کہیں؟ میں نے کہا برابر کے محلے زد میں آچکے ہیں اس وجہ سے اطمینان نہیں ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب کا گھر قریب ہے ان سے اور پوچھ لیجئے۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ اور زیادہ بتاسکیں۔" چنانچہ مولانا سے پوچھا گیا۔ انھوں نے بھی وہی فرمایا جو میں نے کہا تھا۔ صرف اتنا اضافہ کردیا کہ "مسٹر آصف علی اور مفتی کفایت اللہ کا محلہ آپ کے انتظامات کا منتظر ہے۔" آہوجہ صاحب نے کہا "آپ اور آپ کے ساتھی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں چلے جائیں۔ وہ خالی ہے۔ وہاں مطلق خطرہ نہ رہے گا۔ کوٹھی کی حفاظت محلے کی حفاظت کی نسبت آسان ہے۔" مولانا نے فرمایا "محض اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانی کونسی اچھی بات ہے۔ آپ بچاسکتے ہیں تو محلے کے نہیں شہر بھر کے مسلمانوں کو بچائیں آج کل ساتھی اور غیر ساتھی کا فرق محال ہے۔"

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

اپریل میں بیمار نہیں تھے۔ بیمار کئی سال سے جاڑے میں پڑتے تھے۔ جاڑا آیا اور دل کا حال بگڑا لیکن اپریل (۱۹۵۹ء) کا اضمحلال کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا۔ دلی کی کایا پلٹ نے مضمحل کر رکھا تھا۔ زبان سے ایک لفظ نہیں کہا مگر لکھنے برابر رہتے تھے کہ دیرینہ صحبتوں کے تصور سے بے چین ہوں۔ دیرینہ صحبتوں کی یاد بجلیاں گراتی ہے۔ دلی کی کایا پلٹ مولانا کی آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ہم اس کی روداد سن کر متاثر ہیں۔ مولانا بہر تھوڑا ہی تھے

جو متاثر نہ ہوتے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمن، حافظ عزیز حسن بقائی، اور جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ مسلمانوں پر کل کیا گزری۔ ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لے آئے۔ کونے کونے کے مسلمان سمٹ کر مولانا احمد سعید کے علاقے میں جمع ہو چکے تھے۔ دلّی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً خالی تھے۔ مہاتما جی کا جلسہ مسٹر آصف علی والے مکان کوچہ چیلاں میں منعقد کیا گیا۔ مولانا احمد سعید نے تقریر شروع فرمائی۔ دو چار لفظ بولے ہوں گے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے۔ اور مولانا کی جگہ مولانا محمد حفظ الرحمن نے تقریر کی تکمیل فرمائی۔

میرا خیال ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء سے جس قدر مولانا متاثر ہوئے۔ اس قدر شاید کوئی متاثر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کی قیام گاہوں تک کا بلا ناغہ سفر کتنا خطرناک تھا پھر گاندھی جی سے شکایت کرنا معمولی حکام کو ہی نہیں سردار پٹیل وزیر داخلہ بھارت کو دشمن بنانا تھا۔ پٹیل صاحب گاندھی جی سے خفا ہونے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے" (الجمعیۃ مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء)

۱۹۴۷ء سے زندگی کے آخری لمحات تک عوام کے کاموں اور سفارشوں کے لئے دوڑ دوڑ کر حکام اور وزراء کے پاس جانا اور اپنے امراض کی پرواہ نہ کرنا۔ ان خدمات کے ساتھ علمی مشاغل مثلاً تصنیف و ترجمہ کا جاری رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس سراسیمگی اور بدحواسی کے دور نامسعود میں خداوند عالم نے جن کو استقامت کی توفیق بخشی وہ جمعیۃ علمائے ہند کے حضرات تھے۔ خداوند ذوالجلال نے حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند کو وہ جرأت و ہمت اور وہ استقلال عطا فرمایا جو ایسے موقعوں پر تاریخ کی ممتاز شخصیتوں کا قدرتی حصہ ہوتا ہے۔ ان کی رفاقت میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو پانچ چھ سال سے اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا تھے اور ضعف و نقاہت نے ایک حد تک گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا ہمت مردانہ کے ساتھ اٹھے اور کوہ استقلال بن کر کارکنان جمعیۃ کی بزرگانہ سرپرستی فرمائی۔ ایسا تو مرض ہی نہ رہا تھا یا احساس مرض مفقود ہو گیا تھا۔ ان حضرات کے استقلال و استقامت نے جماعت کے کارکنوں میں نئی زندگی پیدا کر دی ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اور انہوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر وہ خدمات انجام دیں جو مسلمانان دہلی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ خاص کر اس زمانے میں کہ حکومت بلوائیوں کے نرغے میں تھی اور پیس کمیٹی کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ٹاؤن ہال جو امن کمیٹی کا مرکز تھا اس کے گرد لاوارث نعشیں جگہ جگہ پڑی ہوئی تھیں۔

ہندو دوستوں نے پریشان ہو کر حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، سید محمد جعفری صاحب، حافظ محمد نسیم صاحب وغیرہ ارکان ہیں کمیٹی سے التجا کی کہ وہ مسلمانوں کو لے کر لال قلعہ تشریف لے چلیں جہاں ان کی حفاظت اور آسائش کا پورا انتظام کر دیا جائے گا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ اس بحرانی دور میں وہ اپنے قوم پرور مسلم دوستوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ اور شرمساری کا یہ داغ ہمیشہ ان کی پیشانی پر رہے گا۔ اس وقت جماعت کی ترجمانی کرتے ہوئے شیر دل حفظ الرحمن نے کہا: "وطن عزیز کی آزادی کی کوشش اس لئے نہیں کی تھی کہ ہم کسی کیمپ میں جا کر پناہ لیں، ہم اپنے مکانات اور اپنے محلوں میں رہیں گے۔ اور صبر و استقامت سے اس بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شہید ہو جائیں گے۔"

(علمائے حق جلد دوم مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب۔ ص ۵۷۵)

تصانیف اور ترجمہ قرآن بہت عرصے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ اور غالباً اس زمانے میں احادیث قدسیہ کا ترجمہ لکھ رہے تھے۔ اس کے کچھ اقتباسات سنا کر فرمایا۔ کہو میاں مفتی صاحب! کیا خیال ہے تمہارا؟ یہ کتاب چلے گی یا نہیں؟ عرض کیا کہ آپ کی کتاب اور مقبول نہ ہو۔ ضرور ہوگی۔ ماشاء اللہ بہت اہم خدمت ہے۔ مگر...... یہ کہہ کر میں کچھ متامل ہوا۔ فرمایا۔ ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟ عرض کیا کہ اگرچہ آپ کے سامنے لب کشائی کرنا گستاخی ہے مگر دلی جذبات کی ترجمانی بھی ضروری ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف سے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مگر اپنے اصلی فن کی طرف اب تک توجہ نہیں فرمائی۔ قرآن کا ترجمہ لکھیئے۔ آپ کو قرآن پر جتنا عبور ہے اس عہد میں اور کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالےٰ نے آپکو اس نعمت سے نوازا ہے اور زور قلم بھی دیا ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ سن کر متفکر ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ میاں مفتی صاحب تم نے بات تو بڑی اہم کہی ہے۔ مگر یہ کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ فرمایا۔ اچھا بھئی سوچونگا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کا ارادہ مولانا کے دل میں پہلے سے تھا یا بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن الحمد للہ کہ وفات سے پہلے ترجمہ کا کام مکمل فرما چکے تھے۔ مولانا کی دیگر تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ جو آپ دینی بکڈپو اردو بازار دہلی سے منگا سکتے ہیں۔

اعتماد و رفاقت واقعات مذکورۂ بالا سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو خاص توجہ اور خلوص سے تربیت دی۔ اور انھوں نے بھی ابتدائی دور میں پوری سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اکابر مدرسہ کا دستور تھا کہ مستعد اور ہونہار طلبہ کو اپنی نگرانی میں ٹریننگ دیتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں بھیج دیتے تھے۔ مولانا مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم

دیو بند کو راندیر بھیجا۔ مولانا قاری محمد یاسین صاحب کو رامپور بھیجا۔ اسی طرح دیگر حضرات کو مختلف مقامات پر بھیجدیا گیا۔ مگر مولانا احمد سعید کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت نے ان کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا۔ اور اس رفاقت کو اس طرح نباہتے رہے کہ جب کوئی لیڈر یا عالم ملنے کے لئے آتا تھا یا کسی مہمان کی دعوت ہوتی تھی تو مولانا احمد سعید کو ضرور بلایا جاتا تھا۔ حاشا و کلا مجھے ایسی کوئی دعوت یاد نہیں کہ مولانا دہلی میں ہوں اور حضرت نے ان کو یاد نہ فرمایا ہو اور بغیر ان کے نوالہ توڑا ہو۔ اور راقم الحروف کی محرومی بھی قابل داد ہے کہ مولانا کی طرف سے دعوت کا تو کیا ذکر ایک چائے کی پیالی سے بھی ہمیشہ محروم ہی رہا۔ البتہ والد ماجد کبھی کبھی اپنے مہمانوں کے ساتھ مولانا دعوت کرتے تھے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ گھر کے نجی معاملات میں بھی مولانا احمد سعید ہمیشہ دخیل رہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے گھر کا ایک بالکل نجی (یعنی ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کی تقریب نکاح کا) معاملہ تھا حضرت نے حکم دیا جاؤ مولوی احمد سعید کو بھی بلا لاؤ۔ میں نے ہمت کر کے عرض کیا کہ ابتدائی مرحلے تو ان کی موجودگی میں طے ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ ان کو بلا کر لاؤ ورنہ میں بھی گفتگو میں شریک نہیں ہونگا۔ کس قدر لگاؤ تھا ان بزرگوں کو اپنے چھوٹوں سے اور کیا مقام تھا ان چھوٹوں کا بڑوں کے دلوں میں! اللہ اکبر!

مارچ ۱۹۳۳ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے تو حضرت نے ان کی جدائی پر اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار فرمایا:۔

چل دیا وہ حال دل سے بے خبر	جان و دل کا ہے سفر جس کا سفر
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں	جانتا تھا میں جسے قلب و جگر
کنج تنہائی کا میرے تھا رفیق	مونس جاں تھا سفر ہو یا حضر
مولوی احمد سعید خوش لقا	واعظ آتش بیاں جادو اثر
شیر دل کان مروت سیر چشم	پیکر صدق و وفا والا گہر
ناظم جمعیۃ علماء ہند	تجربہ کار و امین و باخبر
چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو چل دیا	پھیر لی اُنس و محبت کی نظر
تیری فرقت کا تصور الغیاث	الحذر تیری جدائی الحذر
تیرے دم سے قید خانہ باغ تھا	اور ترے اخلاق تھے اس کے ثمر
چونکہ راضی بالقضا تھا اس لئے	قید کا مطلق نہ تھا تجھ پر اثر
تھی بدولت تیرے بزم عیش گرم	جیل میں دن رات اور شام و سحر
ملک تیری دوستوں پر وقف تھی	جان بھی دیتا کوئی لیتا اگر

رعب و ہیبت سے تری اے مردِ حق — فوج باطل ہوگئی زیر و زبر
ہیبت حق تیرے چہرے سے عیاں — لرزہ براندام تجھ سے شیر نر
یہ حقیقت ہے کہ کرتی ہے تری — خوش بیانی دل میں پتھر کے اثر
بے شبہ ہے تیری تقریر بلیغ — دل نشینی میں کنقش فی الحجر
باغ جمعیۃ مساعی سے تری — سبز و شاداب و شگفتہ پُر ثمر
تیرا دل ہے مال و زر سے بے نیاز — فضل حق پر رہتی ہے ہر دم نظر
دیکھ کر قربانیاں تیری ہمیں — یاد آتے ہیں خلیل نامور
حق ترا حامی ہو اور طالع سعید — اور قدم چومے ترے فتح و ظفر
ہو تری اولاد تیری جانشین — مثل تیرے بلکہ فائق ہوں پسر
کارناموں کو ترے زندہ رکھیں — اور ہر ایک ان میں ہو سرِّ پدر
اور ہو دارین کی آفات سے — فضل مولیٰ واسطے تیرے سپر
مورد الطاف باری تو رہے — عمر بھر ہر سال ہر شام و سحر
پھولتے پھلتے رہیں تیرے فیوض — صیت ہو تیرا محیط بحر و بر
لطف سے تیرے ہے امید قبول — پیشکش ہے گرچہ میری محتقر

محمد کفایت اللہ عفا عنہ مولاہ اسیر سیاسی اے کلاس نیو سنٹرل جیل ملتان
بارک برا الکرہ ٹمبر ۲ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

اکثر مسلم لیگی مسلمان کہا کرتے تھے کہ مولانا کفایت اللہ تو بچارے بھدے سادے اور نیک آدمی ہیں۔ ان کو تو مولوی احمد سعید نے بہکا رکھا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو اس لئے ہوتی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کم گو اور سنجیدہ تھے۔ عام آدمی کو ان سے کھل کر اور بے باک ہو کر بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انکی اصابت رائے اور فہم و تدبر کو انھیں کے مرتبے کے لوگ مانتے تھے یا ان کے اکابر جانتے تھے۔ مولانا احمد سعید ہنسوڑ تھے ہنسی مذاق کے عادی تھے۔ الیکشن بھی لڑاتے تھے اور عمدہ لڑاتے تھے۔ یہ پرہیزگار لوگوں کا کام نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ عمر بھر میں انھوں نے صرف ایک الیکشن میں دلچسپی کا اظہار ضرور فرمایا مگر محض زبانی تائید و حمایت تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ملا واحدی کا الیکشن تھا۔ واحدی صاحب پہلی مرتبہ میونسپل الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ حق یہ ہے کہ واحدی صاحب کا کردار بھی اس پایہ کا کردار تھا کہ حضرت مفتی صاحب جیسے محتاط اور عالی نظر انسان کی توجہات کو اپنی طرف

کھینچ سکتا تھا۔ خدا ان کو سلامت رکھے ۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ اور اہل شہر نے ان کی کامیابی پر جیسی خوشی منائی تھی شاید ہی کبھی منائی ہو۔ بڑا لمبا جلوس تھا جو ٹاؤن ہال سے چلا تھا۔ جلوس جب کوچہ جیلاں میں داخل ہوا تھا تو واحدی صاحب پہلے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان سے گلے مل رہے تھے۔ اور ان کی توجہات پر ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے۔

غرضکہ عوام یا تو حضرت مفتی صاحب کے اور مولانا کے تعلقات کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ان کے بہکائے ہوئے ہیں۔ اور یا یہ بات تھی کہ حضرت مفتی صاحب کی عظمت اور تقدس ان کے دلوں پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کانگریسیت کو بھی مولانا احمد سعید کے سر تھوپ دیتے تھے یعنی کانگریسیت ایک ایسی بدنما چیز تھی کہ مفتی صاحب کے احترام کی وجہ سے ان کی طرف اس لفظ کو منسوب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اپنی وضعداری کو آخر تک نباہ دیا۔ اور مولانا کی طرف سے شاید کبھی ان کو کوئی رنجش یا کدورت نہوئی ہوگی۔ ورنہ کبھی نہ کبھی اس کا اظہار ضرور ہوتا۔ ایک بحر ذخار ہیں بڑے بڑے دریا گر کر گم ہو جاتے ہیں۔

مدرسہ امینیہ کا اہتمام حضرت مفتی اعظم رح کے مرض وفات میں مدرسہ امینیہ کی ضروری میٹنگ مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو مکان پر منعقد ہوئی۔ آیندہ کے انتظامات کے سلسلے میں اہم غور و خوض کرنا تھا۔ حضرت مفتی اعظم رح نے صراحۃً کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا۔ یہ معاملہ مجلس کے زیر غور تھا کہ مدرسے کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ "بھئی میں نے کبھی کسی بات پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اس بات پر مجھے فخر ہے اور ہمیشہ اس کی مسرت رہیگی کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے آخری لمحات تک مجھ پر اعتماد فرمایا یعنی جب مجلس کے ارکان نے حضرت سے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانے کی اور اپنا خیال ظاہر فرمانے کی خواہش کی تو حضرت نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔"

چونکہ بطور دور اندیشی کے یہ امر زیر غور لایا گیا تھا اس لئے عارضی طور پر چیکوں کے اوپر دستخط کرنے کا اختیار حکیم شریف الدین صاحب بقائی کو دیکر جلسے کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور حضرت کی وفات کے بعد مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۹۵۳ء کے جلسے میں مولانا کو مدرسے کا مہتمم اور راقم الحروف کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ آپ نے انکار فرمایا لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ کے شدید اصرار پر کچھ عرصے کے لئے آپ نے اعزازی عہدۂ اہتمام قبول کیا۔ اور تقریباً دو ڈھائی سال کے بعد راقم الحروف کی عزت افزائی فرما کر خود مستعفی ہو گئے۔ مگر مدرسے کی سرپرستی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فرماتے رہے اور ہر امر میں مشورہ دیتے رہے۔

اعلیٰ حضرت اور سحبان الہند

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں عرب میں باہلی قبیلے کا ایک شخص سحبانِ وائل تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجے کا فصیح و بلیغ اور لسان خطیب تھا۔ ادب و لغت پر اتنا حاوی تھا کہ اپنی تقریر میں کوئی لفظ مکرر نہیں لاتا تھا۔ ایک مضمون کو جب دوسرے وقت بیان کرتا تھا تو نئے الفاظ میں نئے اسلوب سے بیان کرتا تھا۔ جس طرح حاتم طائی کی سخاوت و جوانمردی اور رستم کی طاقت ضرب المثل ہے اسی طرح سحبان کی فصاحت و بلاغت نہ صرف عرب میں بلکہ دنیائے اسلام میں ضرب المثل ہے۔

ہندوستان کے اہل علم نے جب مولانا کے اندر اعلیٰ درجے کی بلاغت اور شیریں بیانی پائی تو سحبان الہند کا خطاب دیا۔ اور واقعی یہ خطاب آپ کی شان کے لائق تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپکو ہمیشہ اعلیٰ حضرت کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے

ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ۔

مولانا کے سفر

ہندوستان کا تو شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں مولانا تشریف نہ لے گئے ہوں۔ ان سفروں کی تفصیل لکھنا دشوار ہے۔ البتہ بیرون ہند کے دو تین سفر لکھے جاتے ہیں۔

آپ نے پہلا حج ۱۳۳۲ھ م ۱۹۱۴ء میں کیا تھا۔ دہلی کے ایک متمول تاجر جن کا نام غالباً حاجی احمد جان تھا آپ کو اپنے خرچ پر لے گئے تھے۔ اس سفر میں آپ نے جو خطوط مولانا امین الدین مہتمم مدرسہ کے نام بھیجے وہ بجنسہٖ نقل کرتا ہوں

پہلا خط:۔ مکرمی و معظمی سیدی و مولائی جناب مہتمم صاحب قبلہ زید مجدکم۔

السلام علیکم۔ الحمد للہ بندہ بخیریت تمام مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔ تا دمِ تحریر بخیریت ہے۔ آپ کی خیریت و میاں سعید الدین کی سعادت اور مدرسہ امینیہ کی مقبولیت کے لئے وقتاً فوقتاً دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

مصر، بیت المقدس، دمشق، مدینہ منورہ سے مختصر کیفیت اپنے سفر کی لکھتا رہا ہوں۔ غالباً نظر سے گزری ہوگی۔ البتہ تا دمِ تحریر آپ کی خیریت کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری حالت زار پر ترس آجائے تو براہ کرم اپنی خیریت کا خط بمبئی کٹلری بازار حاجی محبوب بخش سراج الدین کی دوکان پر روانہ فرما دیجئے۔ غالباً بشرط زندگی یکم محرم تک بمبئی پہنچنا ہوگا۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ جہاز سے اترتے ہی آپ حضرات کی صورت دیکھتا۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو کم ازکم آپ صاحبان کی خیریت کے خطوط تو نظر سے دیکھ لوں۔ قدرے کیفیت مولائی و آقائی جناب مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط میں ملاحظہ فرمالیں۔ جملہ معلمین و متعلمین کی

خدمت میں سلام علیک۔ ایچ اے مرزا اور ان کے بھائیوں کو سلام علیک

آپ کا ادنیٰ خادم بندہ احمد سعید دہلوی۔ از مکہ مکرمہ ۱۶ ذیقعدہ ۳۲ھ

دوسرا خط:۔ سیدی ومولائی مکرمی ومحترمی ومخدومی جناب قبلہ مہتمم صاحب زید مجدکم

السلام علیکم۔ الحمدللہ بندہ مع الخیر والعافیہ دوشنبہ کے روز ۴ محرم کو ۳ بجے بمبئی پہنچا۔
جناب کا عنایت نامہ مطالعہ کیا۔ دل کو نہایت مسرت وسرور حاصل ہوا۔ خداتعالیٰ آپ کو ہمیشہ زندہ وتندرست رکھے۔ مولانا! باللہ العظیم آپ کے خلوص ومحبت نے مجھے میرے والدین کو بھلادیا۔ میں جناب کو اپنے والد کے قائم مقام سمجھتا ہوں۔ اور یقین ہے کہ آپ بھی مجھے اپنا بیٹا ہی خیال کرتے ہونگے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ نالائق اولاد ہوں کوئی خدمت جناب کے احسانات کے صلے میں نہیں کرسکتا۔ جناب والدہ صاحبہ کی علالت سے دل نہایت رنجیدہ ہے۔ خداتعالےٰ ان کو صحت کلی عنایت کرے۔ اور ہمارے سر پر عرصہ دراز تک قائم رکھے۔ تمام سفر میں آپ حضرات کی یاد سے دل بے چین رہتا تھا۔ خداوند کریم کی رحمت سے امید ہے کہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہوکر قدمبوسی سے مشرف ہونگا انشاءاللہ جمعرات کی صبح کو متھرا لائن سے روانہ ہوکر جمعہ کی شام کو ۷ بجے دہلی جنکشن پر پہنچوں گا۔ جملہ طلبائے مدرسہ وحضرات مدرسین کی خدمت میں سلام علیک۔ بھائی حافظ سعیدالدین کو سلام علیک۔ ایچ اے مرزا۔ منشی یامین۔ عبدالہی۔ بابو صاحب۔ فضل الرحمٰن۔ خلیل الرحمٰن کو سلام علیک۔ والسلام۔ بندۂ نیاز احمد سعید دہلوی۔ ۵ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ بروز سہ شنبہ۔

اس کے بعد ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء میں دوسرا حج کیا۔ اور تمام عالم اسلام کی مؤتمر مکہ میں شرکت کرکے مسلمانان ہند کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے مؤتمر کی شرکت کے لئے جو وفد بھیجا گیا تھا۔ آپ بھی اس کے رکن تھے جمعیۃ کے وفد کے ارکان مندرجۂ ذیل تھے:۔

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صدر وفد۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی پرائیویٹ سکرٹری صدر وفد۔ مولانا محمد عرفان سکرٹری وفد۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا نثار احمد۔ ارکان وفد۔

خلافت کمیٹی کا وفد مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا:۔

مولانا سید سلیمان ندوی صدر وفد۔ مسٹر شعیب قریشی سکرٹری وفد مولانا شوکت علی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ارکان وفد۔ علاوہ ازیں تقریباً چارسو علماء وزعماء ہندوستان سے اس سفر حج میں ہم سفر تھے۔

۱۳۵۶ھ ۱۹۳۸ء میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ برما کا سفر کیا۔ اور تقریباً ۲ ماہ میں واپسی ہوئی۔ برما کے مسلمان عرصے

سے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کے آرزومند تھے اکثر تقاضا ہوتا رہتا تھا۔ آپ کے تشریف لیجانے سے بہت مسرور ہوئے۔ دارالسلطنت رنگون کے علاوہ برما کے متعدد شہروں میں ہر دو حضرات کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت کی کم اور مولانا احمد سعید کی زیادہ۔ اس سفر کی وجہ سے مدرسہ امینیہ کو کافی مالی امداد ملک برما سے حاصل ہوگئی تھی۔

داستان لحد حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں جبکہ بیمار داروں پر مایوسی طاری ہوگئی تو راقم الحروف کے دل میں تدفین کے بارے میں خلجان پیدا ہوا۔ دل میں یہ آرزو تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب وجوار میں جگہ تجویز کی جائے تو مناسب ہے۔ ارادہ تھا کہ موقعہ آنے پر ظاہر کردوں گا اور اسی کی کوشش کروں گا۔ اسی دوران میں خواجہ ہلال قطبی نے مجھ کو بتایا کہ مولانا احمد سعید اور حضرت مفتی صاحب نے اپنے لئے مہرولی میں جگہ تجویز کر رکھی ہے۔ پھر ایک روز مولانا نے بھی مجھ سے ذکر فرمایا اور کہا کہ مفتی صاحب کا عندیہ معلوم کرلو۔ مگر میری آرزو تو کچھ اور تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود دریافت فرما لیجئے۔ مولانا نے مفتی صاحب کے سامنے یوں ذکر چھیڑا کہ حضرت آپ کو یاد ہوگا۔ مہرولی میں آپ کے لئے اور میرے لئے دو قبروں کی جگہ محفوظ ہے۔ حضرت نے اشارے سے صرف اتنا فرمایا۔ ہوں! مراد یہ تھی کہ یاد ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے آگے نہ مولانا کی کچھ ہمت پڑی بولنے کی نہ حضرت نے کچھ فرمایا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کی شام رات کے ½-۱ بجے حضرت کی وفات ہوئی۔ غسل میت سے فارغ ہو کر مردانہ بیٹھک میں رات کے ۲ بجے مقام تدفین پر بحث شروع ہوگئی۔ سات آٹھ حضرات موجود تھے۔ شدید اختلاف ہوا۔ مولانا احمد سعید نے جب اپنی تجویز پیش کی تو مولوی سمیع اللہ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور اپنی تجویز یعنی جامع مسجد کی باغیچی میں دفن کئے جانے پر زور دیا۔ ان کی زبردست دلیل یہ تھی کہ وہاں فاتحہ پڑھنے کون جائے گا! حکیم حاجی شریف الدین بقائی بھی مہرولی کی تجویز کے خلاف تھے۔ جب اختلاف زیادہ ہوا تو راقم الحروف کو بلایا گیا۔ اور یہ طے کرلیا گیا کہ آخری رائے حفیظ الرحمان کی رائے ہوگی۔ اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری دلی آرزو تو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے احاطے میں تدفین ہو۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے مہرولی کی تجویز کا واقعہ پورے طور پر سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے اور حکیم شریف الدین صاحب نے واقعہ سنایا۔ اس پر میں نے سوالات کئے۔ تنقیحات پیش کیں۔ اور نکھر نکھرا کر مندرجہ ذیل تفصیل سامنے آئی:-

"پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے۔ مولانا احمد سعید نے کوشش کی کہ درگاہ حضرت خواجہ کاکیؒ کے اندر دو قبروں کی جگہ مل جائے۔ مگر بجبر معقول نذرانے کے جگہ ملنی ممکن نہ تھی۔ پہاڑی بھوجلا کے رہنے والے ایک صاحب خلیفہ محمد ولی نام بازار چتلی قبر میں رہتے تھے۔ یہ نیاز علی گوٹے والے ساکن گلی اڈن محلہ پہاڑی بھوجلا

کے فرزند تھے۔ اور ان حضرات سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو مولانا کے پاس آئے اور کہا کہ درگاہ شریف کے دروازہ کے متصل ظفر محل کے پیچھے میری ایک خاندانی زمین ہے اور اس میں صرف دو قبروں کی جگہ باقی ہے۔ میں وہ آپ کو نذر کرتا ہوں۔ اگر آپ پسند فرمالیں۔ اس کے بعد یہ طے ہوا کہ اس جگہ کو دیکھ لیا جائے۔ دن اور وقت متعین کر لیا گیا۔ تانگہ میں حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید، حکیم شریف الدین صاحب بقائی اور چوتھے خلیفہ محمد ولی صاحب بیٹھ کر مہرولی روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر جگہ کو دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب نے جائے وقوع وغیرہ کو ملاحظہ فرماکر کوئی اظہار خیال نہیں فرمایا۔ اس سفر کے تمام وقت میں کوئی ایسا لفظ نہیں فرمایا جس سے اس جگہ کو اپنے لئے منتخب کر لینے یا متعین کر لینے کا مفہوم پیدا ہوتا ہو۔ اس کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک کسی سے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا، حد تو یہ ہے کہ گھر میں اپنی اہلیہ محترمہ سے اور اولاد تک سے ذکر نہیں فرمایا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا احمد سعید نے وہاں دو سرداب بنوا کر محفوظ کرا دیئے۔" مولانا نے فرمایا کہ یہ بھی طے ہوئی تھی کہ پہلے جس کی وفات ہوگی اس کو مشرقی سرداب میں دفن کیا جائے گا۔

اس واقعہ کو سننے کے بعد میرے پیش نظر ادھر تو اپنی دلی خواہش تھی۔ اُدھر مولانا کی آرزو اور اس کے مطابق ان کے گزشتہ انتظامات۔ اگرچہ مولانا سے یا ان کی تجویز سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر ان کے ساتھ حضرت کے نصف صدی کے تعلقات کا خیال کر کے میں نے یوں تقریر کی:-

"اگرچہ میری دلی آرزو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب وجوار میں رکھا جائے مگر اس واقعہ کو سننے کے بعد میں اپنی رائے پر مولانا کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ حضرتؒ کا اُس جگہ کو ملاحظہ فرمانے کے لئے تشریف لے جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس جگہ کو پسند کرتے تھے۔ اور وصیت نہ فرمانا حتیٰ کہ کسی سے ذکر نہ فرمانا اس لئے تھا کہ کسی خاص جگہ دفن ہونے کی وصیت کرنے کو آپ منع فرمایا کرتے تھے۔ (فقہا نے ایسی وصیت کو باطل لکھا ہے۔ وعلیہ الفتوی۔ کذافی رد المحتار شامی)۔

فیصلہ ہو گیا۔ اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ اور سات برس بعد یہ عزیز شاگرد اور معتمد رفیق بھی ان کے پہلو میں جاسویا۔

بعض لوگوں نے مجھ کو سخت سست کہنا شروع کر دیا تھا۔ کافی عرصے تک یہ طعنے سنتا رہا کہ اپنے والد کو اتنی دور لے جاکر ڈال دیا۔ قریب ہوتے تو روزانہ لوگ مزار پر فاتحہ پڑھتے اور زیارت کرتے اور میں نے جو اپنی آرزو کو مولانا کی رائے پر قربان کر دیا تھا اس کی بھی ایک ہلکی سی خلش خود میرے دل میں رہتی تھی۔

ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت والد مرحوم کی قبر پر زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ احاطہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اندر واقع ہے۔ دل میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی قبر تو مہرولی میں

تھی۔ شاید میں راستہ بھول کر آگیا ہوں لیکن دل میں یہ یقین بھی ہے کہ یہ قبر انہیں کی ہے۔ یکایک دیکھا کہ میرے برابر میں خود حضرت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ اور میں دل میں حیران ہوں کہ کیا یہ خود ہی اپنی قبر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔ خواب طویل ہے۔ میں نے مختصر کر دیا ہے۔

میں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہ سے تعبیر چاہی۔ ارشاد ہوا کہ یہ خواب بشرات میں سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مہرولی میں مدفون ہیں۔ مگر ان کی روح مبارک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی روح انور کے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد سے میرا دل مطمئن ہے اور اس کی ہر دھڑکن سے یا لائمی کف الملاھم کی صدا آرہی ہے۔

مرقد کا چبوترہ حضرت مفتی صاحب کی تدفین سے پہلے قبر کے آس پاس کے چبوترے کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور جب تدفین کے وقت لوگوں کا بے پناہ اژدحام ہوا تو بالکل شکستہ ہو گئی۔ مولانا اکثر میرے سامنے کہا کرتے تھے کہ ارے بھئی چبوترے کی مرمت کرانی ہے۔ اور میں چپ ہو جاتا تھا۔ ایک روز مستری اسلام الدین ساکن فراش خانہ میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا کے حکم سے میں نے مہرولی میں مرمت لگا دی ہے۔ اب اس کے لئے روپیوں کی ضرورت ہے۔ میرے استفسار پر مستری صاحب نے بتایا کہ منڈیر کی تعمیر میں تقریباً تین سو روپے یا کچھ زائد صرف ہوں گے۔ کیونکہ وہ ازسرِ نو بنیاد کھود کر پختہ بنائی جائے گی۔ پچاس روپئے تو مولانا نے مجھے دیئے تھے۔ سامان خرید لیا اور کام شروع کرا دیا ہے۔ سردست پچاس روپئے اور لینے تھے۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اب جا کر حفیظ الرحمان سے لو۔ میں متفکر اور متعجب ہوا۔ اور پھر گھر سے مبلغ سو روپے لئے۔ مستری صاحب کو ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پچاس روپئے مولانا کی خدمت میں پیش کئے اور پچاس روپے مستری صاحب کو دیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہ تو میں نے اپنی طرف سے مرمت کے لئے دیئے ہیں۔ یہ کیوں مجھے واپس دے رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ کیجئے میں خود ہی چبوترہ بنوا دونگا۔ فرمایا ارے بھئی میرا سسرا بھی تو وہاں ہے اس لئے میری بھی کچھ ذمہ داری ہے عرض کیا کہ حضرت جی! آپ کا بھی سسرا یہ وہاں ہے اور میرے والد وہاں دفن کئے جا چکے ہیں۔ آپ خادم کو یاد فرما کر چبوترے کی تعمیر کے متعلق مشورہ فرماتے اور کوئی معاملہ طے ہو جاتا تو اس کی نوعیت دوسری ہوتی۔ لیکن آپ نے خادم کی لاعلمی میں مستری کو بلا کر اور پچاس روپے دیکر مرمت لگوا دی اور اب مستری صاحب کو میرے پاس بھیجدیا۔ اب تو یہ رقم میں منظور نہیں کروں گا۔ غرضکہ مولانا نے چپکے سے رقم واپس لے لی۔ منڈیر کی تعمیر میں مبلغ چارسو روپیے صرف ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مرقد مفتی اعظم تعمیر کرایا۔ اس میں مزید تین سو روپے صرف ہوئے۔

دم واپسیں

آپ کو عہد جوانی میں مرض سل لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپ کو تقریر کرنے سے منع کیا تھا۔ اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں آیا تھا۔ بولنے میں قوت بھی زیادہ صرف ہوتی تھی۔ مگر عمر بھر تقریریں کرتے رہے اور خوب تندرست رہے۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے پر غالباً پرانا مرض جاتا رہا تھا مگر دوسرے امراض نے آگھیرا تھا۔ اکثر اختلاج وغیرہ کی شکایت رہتی تھی۔ ۱۹۲۵ء سے آپ بہت زیادہ نحیف ہو گئے تھے۔ وفات سے دو تین برس قبل سے ڈاکٹر کہتے تھے کہ تعجب ہے کہ مولوی جی زندہ کیونکر ہیں۔ ان کا دل تو جواب دے چکا ہے۔ انھیں میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ مولوی جی کو تو غریبوں کی دعاؤں نے روک رکھا ہے۔ غرضکہ دو تین برس سے دل کی حالت غیر ہو چکی تھی، مگر خدمت خلق میں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

مورخہ ۴ ردسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳ رجمادی الثانی ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ بعد مغرب حرکت قلب بند ہو گئی۔ اور وہ بلبل ہزار داستان جس کی شیریں بیانی کا نصف صدی تک ڈنکا بجتا رہا ساتھ بج کر دس منٹ پر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور کتاب اللہ کا وہ نقیب جس نے عمر بھر اللہ کی مخلوق کو اس کی آیات کا مفہوم سمجھایا دائمی نیند سوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن بروز ہفتہ جنازہ مہرولی لیجایا گیا اور حضرت مفتی اعظم کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ یہ تھا ڈراپ سین اس عظیم الشان رفاقت کا جو ۱۳۲۶ھ سے بھی پہلے سے شروع ہوئی تھی۔ اور زندگی میں بھی نباہی گئی بعد مردن بھی نباہی جارہی ہے۔ اعلی اللہ مقامھما ورفع درجاتھما۔

تاہل اور اولاد

مولانا نے اپنی پہلی اہلیہ کو چھوڑ دیا تھا۔ ان سے دو اولادیں ہوئی تھیں جو صغیر السن ہی فوت ہوئیں۔ موجودہ اہلیہ محترمہ صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی کی بہن ہیں، مولانا نے ایک اہلیہ محترمہ اور چار صاحبزادے چار صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔ صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا حافظ محمد سعید صاحب میونسپل کونسلر مالک دینی بکڈپو ہیں۔ آپ بھی مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل عالم اور حضرت مفتی اعظمؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ اللہ تعالےٰ سلامت رکھے۔ دارین میں درجات بلند فرمائے۔ اور اُن آفات سے محفوظ رکھے جو بڑوں کے اٹھ جانے کے بعد ہر چہار طرف سے ہجوم کرتی ہیں[۱] آمین!

مولانا مرحوم نے اپنے ذاتی دو مکان چھوڑے ہیں۔ پہلا زنانہ مکان تھا جو کوچہ ناہر خاں میں واقع ہے دوسرا بعد میں خریدا اور بنوایا۔ یہ مردانہ مکان کٹرہ مہربور میں واقع ہے۔ آپ اسی میں رہتے تھے اور اسی میں وفات ہوئی۔

عام اخلاق وعادات

یہ عنوان بظاہر تو بہت آسان ہے۔ مگر دراصل اس پر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے نوع انسان میں ہر فرد کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص کے متعلق رائے قائم

---

[۱] افسوس کہ مولانا محمد سعید بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (واصف)

کرنے والے مختلف رائیں قائم کرتے ہیں۔ اور خاص کر مولانا مرحوم کی زندگی تو ایسی عجیب و غریب زندگی تھی کہ اس کو مجموعۂ اضداد کہا جائے تو بجا ہے۔

جن لوگوں کو کسی بزرگ کے ساتھ حد سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے وہ اپنے ممدوح کے متعلق معمولی واقعات کو کرامت پر محمول کرتے ہیں۔ ایک مرشد کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاں تین مہمان آئے ہوئے تھے اور اسی قدر کھانا تیار کرایا گیا تھا۔ جب کھانا تناول کرنے کے لئے دستر خوان بچھایا گیا تو اتفاق سے پانچ مہمان اور آگئے۔ ان کو بھی دستر خوان پر بٹھایا گیا۔ کھانا شروع کیا گیا۔ مرشد صاحب نے ایک روٹی تناول فرماکر خادم کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً سیلا بچی آفتابہ حاضر کردیا۔ آپ نے ہاتھ دھونے شروع کردیئے۔ جب مریدوں نے مرشد کو ہاتھ دھوتے دیکھا تو ان سب نے بھی ہاتھ دھونے شروع کردیئے۔ اگرچہ کسی نے ایک کسی نے ڈیڑھ چپاتی سے زیادہ کھانا نہ کھایا تھا۔ مگر ہر جگہ حضرت کی یہ کرامت مشہور ہوگئی کہ تین چار آدمیوں کا کھانا آٹھ نو آدمیوں کے لئے کافی ہوگیا۔ غرضکہ عقیدت کی زیادتی عقیدت مندوں کو مبالغہ پر آمادہ کرتی ہے اور بعض مرتبہ گھڑنت پر ابھارتی ہے۔

مولانا احمد سعید کے اندر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ بھی ظاہر تھیں اور جو کمالات قدرت نے ان کو عطا فرمائے تھے وہ بھی واضح اور روشن۔ ان کی مجلس میں حاضر ہونے اور ان کی ظرافت سننے کے بعد بعض ناواقف حضرات ان کے چال چلن کی طرف سے بدگمان ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ ان کی محض زبانی دل لگی تھی۔

علم و فضل کے ساتھ وجاہت اور ڈیل ڈول بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ اپنے اساتذہ اور اکابر کے ساتھ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے تو آنے والا اجنبی شخص سب کو چھوڑ کر انہیں کی طرف بڑھ کر مصافحہ کرتا تھا۔

مولانا کی ایک خاص آن یہ تھی کہ تنہا کبھی نہیں رہے۔ جب کبھی گھر سے باہر نکلتے تھے تو کوئی نہ کوئی ساتھ ضرور ہوتا تھا۔ اور واپسی بھی اسی طرح ہوتی تھی۔ اگر کہیں راستے میں ساتھی جدا ہوجاتا تو اور کسی کو پکڑ لیتے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے بعد کام کی زیادتی کی وجہ سے تقریباً روزانہ بعد عشا حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں مکان (واقعہ گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز) پر آتے تھے۔ واپسی کے وقت رات زیادہ ہوجاتی تھی۔ راقم الحروف کے حقیقی ماموں مولوی قیام الدین نادر کی یہ مستقل ڈیوٹی تھی کہ وہ انکے ساتھ جاتے تھے اور گھر تک پہنچا کر آتے تھے۔

ہر حال میں خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے عادی تھے۔ مزاج معتدل تھا۔ غصہ بہت کم آتا تھا۔ تندرستی کے زمانے میں خوراک اپنے تن و توش کی مناسبت سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ علم مجلسی میں کمال حاصل تھا۔

مشتعل آدمی کو چند باتوں میں ٹھنڈا کر دینا ان کے لئے ایک معمولی بات تھی ۔

فربہی کی وجہ سے بظاہر کاہل الوجود تھے اور بغیر سواری کے آنا جانا مشکل تھا۔ مگر بار ہا یہ دیکھکر حیرت ہوتی تھی کہ ضرورت کے وقت میلوں کا پیدل سفر کر لیتے تھے۔ اور سفر کی حالت میں بے انتہا پھرتیلے ہو جاتے تھے۔ وفات سے تیرہ چودہ برس قبل فربہی جاتی رہی تھی۔ اس کی جگہ ضعف و نقاہت طاری ہو گئی تھی۔

تراویح کی جماعت گھر میں ہی ہوتی تھی۔ خود قرآن شریف سناتے تھے۔ اور کھڑے اس وقت ہوتے تھے جبکہ لوگ سب جگہ سے تراویح پڑھکر اپنے گھروں میں واپس آجاتے تھے۔ رمضان شریف میں رات کو تو شاید آدھا گھنٹہ آرام کے لئے ملتا ہو گا۔ البتہ دن میں زیادہ آرام کر لیتے تھے۔

بیس پچیس برس سے مردانہ مکان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس مکان میں پہلوان محمد اسمٰعیل غوری۔ عبدالحمید تیل والے اور چند آدمی آپ کی خدمت میں مستقل طور پر رہتے اور رات کو بھی سوتے تھے۔

ہر جگہ آپ اپنا ایک خاص مجلسی ماحول پیدا کر لیتے تھے۔ مفتی صاحب کے ساتھ جب سفر کا اتفاق ہوتا تھا تو قیامگاہ سے علیحدہ بے تکلف دوستوں کی ایک مجلس جما کرتی تھی۔ مولانا میر مجلس ہوتے تھے۔ کیونکہ اکابر کی معیت میں کھل کر خوش طبعی نہ ہو سکتی تھی۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر اور اکابر کے آرام و راحت کے انتظامات کر کے دوستوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ہر شہر میں ان کے اس قسم کے یاران محفل موجود تھے اور اگر نہیں ہوتے تھے تو پیدا کر لیتے تھے۔

سفارش کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے تھے۔ اس کے مؤثر او رغیر مؤثر ہونے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ بس سفارش تحریر فرمانے سے کام تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بتقاضائے بشریت مولانا کے اندر کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ جن کی وجہ سے بعض لوگ ان سے ناخوش اور بدگمان ہو جاتے تھے۔ اور اگر کبھی کوئی زاہد خشک پہلی مرتبہ ان کی خاص بے تکلفی کی محفل میں آپھنستا تھا تو بہت ہی وحشت زدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے جب ہم ان کی پچاس برس کی مسلسل خدمات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک معمولی سی دینی و قومی خدمت دوسروں کے سالہا سال کے مجاہدہ و ریاضت سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔ سیاسی مسلک میں بھی وہ ہمیشہ اپنے اکابر کے راستے پر قائم رہے۔ آزادیٔ وطن کی تحریک میں جبکہ بڑے بڑے مجاہد لیڈروں کے قدم ڈگمگا گئے تھے مولانا کے قدموں میں لغزش نہ آئی۔

ان کی عظیم الشان خدمات کو یاد کر کے آج ہم ان کے اٹھ جانے کے بعد انکی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ کو خالی دیکھ کر ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے ایک بہت بڑا مربی اور سرپرست کھو دیا ہے۔ خوش نصیب تھے

وہ لوگ جو اس عبرت آباد حوادث میں ہنستے ہنساتے زندگی گزار گئے اور اپنی یاد دلوں میں چھوڑ گئے۔ کاش کہ ہمارے لئے یہ عبر تیں اپنے سفر کی تیاری کا سامان بن جائیں۔ واللہ ولی التوفیق والیہ المرجع والمآب۔

مقالہ ہذا میں حاجی نذیر احمد صاحب میرٹھی[1] کا ذکر آیا ہے۔ ان کا تعارف بھی اس جگہ ضروری ایک مغتنم ہستی ہے۔ مدرسہ امینیہ کی ابتدا سنہری مسجد چاندنی چوک میں ۱۳۱۵ھ میں ہوئی تھی۔ موصوف ۱۳۱۹ھ میں مدرسے میں بطور چپڑاسی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۳۳۶ھ میں جب مدرسہ کشمیری گیٹ منتقل ہو گیا تو حاجی صاحب موصوف سنہری مسجد میں بطور موذن کے تقریباً ۱۳۴۶ھ تک رہے۔ مولانا امین الدین اور حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہما کے مکانوں سے ان کا کھانا مدرسے لیجایا کرتے تھے۔ مدرسے کے مہمانوں کے لئے کھانا پکایا کرتے تھے اور عمدہ پکاتے تھے۔ تقریبات کے انتظامات کرتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے ترک مظلومین ومجروحین کے واسطے چندہ جمع کرنے کے لئے مدرسہ امینیہ میں پندرہ روز کی تعطیل کردی گئی تھی۔ اور وفود بھیجے گئے تھے۔ مولانا احمد سعید اور مولوی مشتاق احمد دہلوی کو گوڑگانواں اور میوات کے علاقے میں اور حاجی صاحب موصوف اور مولانا قاری محمد یاسین سکندرآبادی کو دنکور بلاسپور سکندرہ کی طرف۔ مولوی محمد قاسم دیوبندی اور مولوی محمد حسین راندیری کو ضلع مظفر نگر میں بھیجا گیا تھا۔

چونکہ حاجی صاحب موصوف نے طویل زمانہ ان حضرات کی خدمت میں گزارا ہے اس لئے راقم الحروف نے مقالہ ہذا کی تسوید کے وقت ان سے بھی مدد چاہی اور میں ممنون ہوں کہ میری درخواست پر سخت سردی کے باوجود وہ سفر کی زحمت اٹھا کر دہلی تشریف لائے اور میری رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب موصوف کو سلامت رکھے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

حفیظ الرحمان واصف مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی — یکم جنوری ۱۹۶۰ء

مفتی اعظم اور سحبان الہند

استاذ اور تلمیذ

(از جناب مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف)

(شائع شدہ اخبار ہفتہ وار پیام مشرق۔ دہلی مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء)

میرے عزیز دوست جناب ناز انصاری کا اصرار ہے کہ حضرت مفتی اعظم رح اور مولانا احمد سعید کے تعلقات پر

---

[1] افسوس کہ ۱۹۶۳ء میں حاجی نذیر احمد کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین

کچھ لکھوں۔ کئی مرتبہ خیالات کو یکسو کر کے لکھنے کا ارادہ کیا مگر طبیعت نے پیش قدمی نہ کی اُدھر ناز صاحب کسی طرح معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اتفاقاً ایک روز مولوی مشہود حسن صاحب مدرس مدرسہ امینیہ نے اپنا ایک خواب مجھ سے بیان کیا۔ اور میں نے کچھ بے ربط جملے لکھ کر ناز صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

حلیہ اور اخلاق و عادات

یادش بخیر! مولانا احمد سعید۔ خدا بخشے۔ کل کی سی بات ہے ہمارے درمیان موجود تھے اور لوگوں کے لئے سفارشی خطوط لکھ رہے تھے۔ آج ہم ان کے لئے دعائے مغفرت میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دلی کی خاک سے جو چند باکمال ہستیاں اٹھیں مولانا کی ہستی ان میں سے ایک باکمال ہستی تھی۔ صورت شکل کے لحاظ سے بھی مردانہ حسن کا عمدہ نمونہ۔ اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی جوہر قابل۔ میدہ شہاب رنگ۔ طوطے کی چونچ کی سی کھڑی ناک۔ چوڑا چکلا جبہ اور مسکراتا ہوا چہرہ۔ پیشانی اونچی اور روشن۔ قدو قامت بلند اور بھاری بھر کم۔ ہر مجلس و محفل میں ممتاز اور جاذب توجہ۔ شیرینی گفتار۔ انداز کلام اور علم مجلسی سے مجمع پر چھا جانے والے۔

خدا بخشے! مولانا بہت سی متضاد صفات اپنے اندر رکھتے تھے۔ پرائیوٹ محفلوں میں ٹھیٹھ کرخنداری انداز کی ظرافت بھی تھی۔ اوراد و وظائف کا شغل بھی تھا۔ سیاسی مجلس میں عالمی سیاست پر سیر حاصل بحث بھی تھی۔ علمی مجلس میں قرآنی نکات کا بیان اور اسرار و حکم کا انکشاف بھی تھا۔ صوفیا کی محفل میں دقائق تصوف کی تحقیق اور عالم جذب و کیف بھی تھا۔ ادبی محفل میں سخن سنجی اور سخن فہمی بھی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ شعر کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ جنگ آزادی کے میدان میں قید و بند کی مشقت بھی جاری تھی۔ ملکی سیاست کے میدان میں الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ بھی تھی۔ ساگر چہ اپنی شیریں بیانی کی دھاک تمام ہندوستان میں بٹھا دی اور اپنی ٹھوس خطابت کا لوہا دشمنوں سے بھی منوا لیا۔ مگر الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ میں ٹھوکر بھی کھا جاتے تھے۔ عجیب و غریب ہستی تھی مولانا کی۔ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ کہتے نہیں بنتی غم الفت کا فسانہ۔

ابتدائی تعلیم

مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی بولنا اور چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا کہ وعظ کہنے لگے تھے۔ ان پڑھ آدمی کا وعظ اور تقریر ہی کیا۔ جن لوگوں کے اندر ذاتی جوہر اور دماغی صلاحیت موجود ہوتی ہے ان کو کسی استاد کامل کا انتساب اور رہبری حاصل نہ ہو تو اکثر وہ بھٹک جاتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بے لگام ہو جاتا ہے۔ کس قدر عظیم الشان برکت و سعادت ہے اس انتساب میں۔ اور یہی انتساب تو ہے جس کے بغیر سلسلۂ سند مکمل نہیں۔ رسول عربی فداہ امی وابی سے ہم تک دین کے پہنچنے کا ذریعہ یہی انتساب تو ہے۔

اس منظر کے دیکھنے والے اب بھی یقیناً موجود ہیں جبکہ ایک نوجوان واعظ چاندنی چوک میں فوارے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب دے رہا ہے۔ تقریر میں بڑا زور ہے ایسا زور کہ علماء پر بھی حیرانی چھا جاتی ہے۔

ایک مرد حق آگاہ نے اس بلبل ہزار داستان پر اپنی دور رس نگاہیں ڈالیں۔ بھانپ لیا۔ کھینچ لیا کندن بنا کر چھوڑا۔ فوارے کے سامنے سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا مفتی کفایت اللہ تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا حافظ قاری محمد یامین سکندر آبادی مولانا کو ابتدائی کتابیں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ پھر باضابطہ داخلہ ہو گیا۔ تعلیم کے دوران میں ہی حضرت مفتی صاحب کی توجہ و تربیت شروع ہو گئی تھی۔

علم مجلسی

اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے جبکہ مولانا ایک طالب علم کی حیثیت سے مدرسہ امینیہ میں پڑھتے تھے۔ طلبائے مدرسہ کی انجمن اصلاح الکلام کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ باڑہ ہندو راؤ میں منعقد ہوا۔ بڑا بھاری پنڈال بنایا گیا۔ راقم الحروف کے استاد مرحوم جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ایک قصیدہ لکھ کر لائے تھے۔ مولانا احمد سعید نے کھڑے ہو کر رسمی تعارف کرایا۔ رسمی اس لئے کہا کہ جلسوں میں دستور ایسا ہی ہے۔ ورنہ سائل صاحب اور ان کے خاندان سے تو دلی کا بچہ بچہ واقف تھا۔ تعارف کے ساتھ مولانا نے کہا:۔

"شاہی زمانہ ہوتا تو نواب صاحب جیسے قادر الکلام اور فصیح و بلیغ شعراء کو خلعت ملتے۔ انعامات سے نوازے جاتے۔ ہم غریب طالب علم آپ کو سوائے دعا کے اور کیا دے سکتے ہیں"

اس کے بعد نواب صاحب نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ نواب صاحب کا رخ مجمع کی طرف تھا اور مولانا اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے ہر شعر پر داد دینی شروع کی۔ نواب صاحب نے مجمع کی طرف سے پیٹھ موڑ لی۔ اب مولانا ہیں اور نواب صاحب ہیں۔ وہ داد دے رہے ہیں۔ وہ سنائے چلے جا رہے ہیں۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ مجمع میں سے آوازیں آنے لگیں۔ نواب صاحب! نواب صاحب! ادھر بھی! مجمع چیختے چیختے تھک گیا۔ مگر نواب صاحب نے ادھر رخ نہ کیا۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ کہیں مجمع بے قابو نہ ہو جائے۔ مگر ایک تو یہ کہ نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی خاندانی عظمت سے کون واقف نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مجمع آجکل کا مہذب اور تعلیم یافتہ مجمع نہیں تھا کہ بے قابو ہو جاتا یا ہوٹنگ کرتا۔

نواب صاحب نے اپنا قصیدہ اسی طرح پورا مولانا کو سنا دیا۔ اور مولانا نے بھی داد و تحسین کا حق ادا کر دیا۔

کیسا اخلاص و محبت سے بھرا ہوا تھا وہ زمانہ!

شاگردی اور تربیت حضرت مفتی اعظمؒ اور مولانا احمد سعیدؒ کی رفاقت کا زمانہ معمولی زمانہ نہیں ہے۔ یہ پچاس برس کا طویل زمانہ ہے۔ ایک طرف تعلیم و تربیت بھی جاری تھی۔ دوسری طرف تقریر و مناظرہ بھی۔ وہ مناظروں کا دور تھا حضرت مفتی صاحب اپنے ساتھ لے جاکر مولانا کو مناظرے کی مشق بھی کراتے تھے۔ خود معاون بنتے تھے شاگرد مناظرہ کرتا تھا۔ بڑے بڑے معرکے کے مناظرے ہوئے۔ یہ مناظرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال مناظرے تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ کی قوت استدلال اور مولانا کی قوت تقریر۔ یہ ایک ایسا عمدہ امتزاج تھا جس کا جواب مناظروں کے دور کی پوری تاریخ میں مشکل ہی سے کہیں دستیاب ہو سکے گا۔

سیاسی دور کی رفاقت مناظروں کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا دور شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالی۔ یہ رفاقت استوار تر ہوتی چلی گئی۔ مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند بنائے گئے۔ ہر لمحے کے رفیق۔ ہر کام میں شریک۔ سفر و حضر کے ساتھی۔ زنداں میں غمگسار۔ جلسوں میں ترجمان۔ جلوت میں ہم جلیس۔ خلوت میں ہم راز۔ غرض کہ زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں تھا جس میں ان دونوں کی رفاقت نہ پائی گئی ہو۔ عیدین میں عیدگاہ بھی دونوں ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔

مرقع رفاقت ابھی چند روز ہوئے مولوی مشہود حسن صاحب مدرس مدرسہ امینیہ نے مجھ سے اپنا خواب بیان کیا۔

"میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید کا ہاتھ پکڑے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب بہت تندرست اور تنومند معلوم ہو رہے ہیں۔ مولانا کچھ کمزور اور لاغر ہیں۔ راستے میں جہاں نالیاں آتی ہیں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں۔ دیکھو نالی ہے۔ مولانا کا قدم نالیوں پر اس طرح پڑتا ہے کہ ایک کنارے پر ایڑی اور دوسرے کنارے پر پنجہ۔ غرضکہ اسی طرح سہارا دیتے ہوئے اور ٹوکتے ہوئے حضرت مفتی صاحب مولانا کو لے جا رہے ہیں۔"

مولوی صاحب موصوف کا خواب سُن کر میں پھڑک اٹھا اور بیساختہ زبان سے نکلا "کھینچ کر لے ہی گئے۔" خواب کیا ہے دونوں کی رفاقت کا ایک مکمل اور سچا مرقع ہے۔ رہبر صادق اور استاد کامل ہو تو ایسا ہو۔ یہ رہنمائی مولانا کے لئے زندگی میں بھی شمع راہ بنی رہی اور اب عالم برزخ میں بھی منارۂ منزل ثابت ہوئی۔ اور

عالم ظاہر میں دونوں کی قبروں کے درمیان بھی کوئی فاصلہ نہیں۔

حضرت مفتی اعظمؒ کے کردار سے مولانا کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی؟ اس کا جائزہ لینا

کردار کی رہنمائی تو میرے موقف سے بالاتر ہے۔ البتہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ ابوالغیاث شیخ کریم الدین صاحب میرٹھی جو ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۵-۱۶ برس تک جنوبی ہند میں بطور سفارت جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے موقع پر جمعیۃ علماء پر ایسا تنگی کا وقت آیا کہ فنڈ میں روپیہ بالکل نہ تھا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہوگیا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو دہلی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے ان کا پیغام آیا کہ لاکھ دو لاکھ جس قدر روپے کی ضرورت ہو ہم کانگریس کے فنڈ سے دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ تحریک کو جاری رکھئے۔ مولانا اُس وقت ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ پیش کش قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ اور اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کانگریس کا فنڈ تمام فرقوں کا مشترک فنڈ تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ گرفتار ہو چکے تھے اور اُس وقت تک دہلی جیل ہی میں تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

"جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کردیں گے۔"

کیا ہے کردار؟ اور کیا چیز ہے کردار کی بلندی؟ آؤ! دیکھو! یہ ہیں ہمارے اسلاف جن کی مثال زمانہ کبھی پیش نہیں کرسکے گا۔

میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے حضرت مفتی اعظمؒ کو یہ پیغام پہنچایا کہ:۔

"حکومت برطانیہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہوجائیں اس کے صلے میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صفدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کریگی اور آپ کی ذات خاص کے لئے ہبہ کردیگی۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ آپ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پروپیگنڈہ کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں اور سیاسیات سے الگ رہیں۔"

یہ ایک رازدارانہ پیغام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا۔ اور آج پہلی مرتبہ صفحہ قرطاس پر آرہا ہے حضرت نے جواب دیا:۔

"میں آزادیٔ وطن کی تحریک میں اپنی ذاتی منفعت کے لئے شریک نہیں ہوا ہوں۔ آپ کا پیش کش کا شکریہ! کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔"

ابوالغیاث صاحب فرماتے ہیں کہ جنگ آزادی کے پورے دور میں صرف تین آدمی ایسے دیکھے جنھوں نے تحریکات کے سلسلے میں سیکڑوں سفر کیے۔ مگر مصارف سفر ہمیشہ اپنی جیب سے ادا کئے۔ حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ اور حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ۔ فرق یہ ہے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب دولت مند اور غنی تھے۔ حضرت مفتی اعظم فقیر مستغنی۔ جمعیۃ علمائے ہند سے حضرت نے اپنی صدارت کے پورے دور میں اپنا سفر خرچ کبھی نہیں لیا۔ اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر کو ملتوی فرمادیتے تھے۔ مگر التوا کا سبب کچھ اور ظاہر فرماتے تھے۔

پس اے مسلمانو! یاد کرو وہ وقت جبکہ تم جامع مسجد شاہجہانی کے صحن میں کھڑے ہو کر ایسی اولوالعزم ہستیوں پر "کانگریس کے تنخواہ دار" ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے۔

اور اے آدمیو! یاد رہے گا یہ وقت جبکہ تم اُن بے لوث مجاہدین کی قربانیوں کو بھول چکے ہو اور ان کا نام صفحۂ تاریخ سے مٹادینا چاہتے ہو۔ جنھوں نے اپنی ضروریات کے لئے بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور آزادی کی جنگ میں ان کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔ اپنے سر کٹا کر ہمارے سر اونچے کر گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

تری کوتاہ بینی دوسروں کی قدر کیا جانے
باندازِ نظر ہوتا ہے اوجِ آسماں پیدا
واصف

خدمات جمعیۃ علمائے ہند قیام جمعیۃ کے وقت سے ۱۹۳۹ء تک پورے بیس برس حضرت مفتی اعظم رح اس کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ رہے۔ شروع شروع میں جب تک اس کا دفتر مدرسہ امینیہ میں رہا۔ دونوں حضرات ہر وقت شریک کار رہے۔ جب اس کے لئے مستقل دفتر علیحدہ قائم ہوا تو مولانا ہی اس کے انچارج رہے۔ مفتی صاحب شام کو مدرسے سے فارغ ہو کر کبھی کبھی دفتر تشریف لے جاتے تھے۔ اور مولانا دن بھر دفتر میں ہی رہتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات رات کو بھی دفتر میں سوتے تھے۔

مولانا اگرچہ حضرت مفتی صاحب کے شاگرد تھے مگر حضرت کا برتاؤ مولانا کے ساتھ ایسا تھا کہ دیکھنے والے ان کو آپس میں دوست اور ہم عصر خیال کرتے تھے۔ تعلیم و تعلم کا مشغلہ ۱۹۳۳ء میں ملتان جیل میں بھی رہا۔ یعنی وہاں مولانا نے مفتی صاحب سے فتح الباری کا آخری پارہ پڑھا۔

مولانا کو قرآن مجید کے معانی و مطالب اور ربط آیات پر بے انتہا عبور تھا۔ اور یہ مولانا کا خاص امتیاز اور ملکہ تھا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

آنسو رہ وفا میں گراتے گزر گئے | لوٹو! کہ ہم خزانے لٹاتے گزر گئے
دامن کو الجھنوں سے بچاتے گزر گئے | اچھے رہے جو ہنستے ہنساتے گزر گئے
ہستی کے رہگزار میں کس کو قیام ہے | آئے ادھر تو ملتے ملاتے گزر گئے
یہ بھی تری نگاہ کی توفیق تھی کہ ہم | اس رہگزر سے ٹھوکریں کھاتے گزر گئے
آئی بہار غنچۂ خاطر نہیں کھلا | یہ دن بھی یونہیں اشک بہاتے گزر گئے
ملتی نہیں ہر ایک کو یہ دولت جنوں | کتنے ہی آئے خاک اڑاتے گزر گئے

واصف سے ہم ملے جو سرِ رہگزارِ عشق
باہم دلوں کے داغ دکھاتے گزر گئے

مرقع کی تکمیل ایک روز کسی کام سے جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا۔ آئیے واصف صاحب! آپ کی بڑی عمر ہے۔ میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ وہ سنانا چاہتا تھا۔

"میں نے دیکھا کہ ایک عالی شان مکان میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے میں اور آپ اور آپ کے بھائی خلیل الرحمٰن صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف قسم کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اتنے میں مولانا احمد سعید مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں حضرات دنیا میں بھی ساتھ تھے اور یہاں بھی ساتھ ہیں۔ مولانا احمد سعید ہنسے۔ حضرت مفتی صاحب اپنی عادت کے مطابق سنجیدگی سے مسکرائے۔"

لیجئے تکمیل ہو گئی اس مرقع کی جس کا خاکہ مولوی مشہود حسن کو دکھایا گیا تھا۔ رنگ بھرنے والے نے رنگ بھر کر اس کو قصر علیین میں سجا دیا۔

تدفین مولانا کے دل میں ہمیشہ سے حضرت مفتی اعظمؒ کے قریب دفن ہونے کی آرزو تھی۔ اور زندگی میں اس کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ مہرولی میں دو قبروں کی جگہ محفوظ کر رکھی تھی۔ یہ آرزو پوری ہو گئی۔ اور آج درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ظفر محل کی دیوار کے نیچے دونوں استاد شاگرد میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین +

حفیظ الرحمان واصف
مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ

تحدیث نعمت - رویائے صادقہ

۳۲۳ ؁ھ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخوں میں عاصی پر معاصی راقم الحروف مرغوب احمد غفر اللہ ولوالدیہ ولمشائخہ الکرام
کوچہ چیلاں مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب مرحوم میں عالم رویا میں حضرت خلیل اللہ سیدنا ابراہیم صلوات اللہ علیہ و علیٰ نبینا و علیٰ جمیع الانبیاء
والمرسلین کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مدرسہ میں تشریف آوری کی اطلاع ہوتے ہی فقیر
نے عالم شوق میں مدرسہ کے طلبہ کو یہ کہتے ہوئے بیدار کیا کہ بزرگان دین کی ملاقات سے ہمیں کسقدر مسرت ہوتی ہے۔
آپ تو خلیل اللہ ہیں۔ جلدی دوڑ کر شرف زیارت حاصل کرو۔ چنانچہ طلبہ حاضر خدمت ہو گئے۔ حضرت سیدنا ابراہیم
علیہ السلام۔ شمالی جانب صحن مسجد میں مولانا محمد شفیع صاحب کی درسگاہ کے حجرے کے سامنے قبلہ رو دو زانو تشریف فرما
تھے۔ اور مواجہہ میں حضرت ؑ کے حضرت مولانا عبدالعلی صاحب محدث وصدر مدرس و ناظم مدرسہ غایت ادب سے
بیٹھے تھے۔ دیگر مدرسین وطلبہ اطراف میں نہایت ادب سے بیٹھے ہوئے زیارت سے مشرف ہو رہے تھے۔ حضرت
خلیل اللہ ؑ کا حلیہ مبارک آج پچاس سال کے بعد بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ میانہ قامت لیکن قریب کشیدہ قامت کے
رنگت نہایت سرخ وسفید جسم اطہر نہ ہلکا نہ بھاری لیکن بھرا ہوا۔ سیاہ جبہ و عمامہ باندھے ہوئے۔ میری خوشی کا اُس
وقت جو عالم تھا اُس کے اظہار سے قاصر ہوں۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب ؒ نے نہایت ادب سے عافیت مزاج
اقدس دریافت کرنے کے بعد تشریف آوری و تصدیعہ فرمائی کا سبب دریافت کیا۔ تو حضرت خلیل اللہ ؑ نے صاف لفظوں
میں فرمایا کہ "میں مولوی رشید احمد کو لینے آیا ہوں۔ (اسی ماہ میں مورخہ ۸ رجب کو مولانا کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ
انتقال کے کچھ روز بعد کا ہے) اس کے بعد حضرت خلیل اللہ ؑ نے مولانا عبدالعلی صاحب ؒ سے فرمایا کہ مولوی صاحب مجھے
آپ کے جوان صاحبزادے عبدالجلیل کے انتقال کی اطلاع ہوئی تھی۔ مرحوم بہت آرام سے ہے آپ صبر کیجئے۔ اس کے
بعد حضرت ؑ نے فرمایا کہ میں مدرسہ امینیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہ ؑ کے ہمراہ طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ
فقیر بھی سنہری مسجد میں گیا۔ مدرسہ کی سیڑھی کے سامنے اوپر میں مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ کا حجرہ تھا سیڑھی چڑھکر اوپر
تشریف لے گئے۔ پھر واپس اترے ہم نیچے کھڑے تھے۔ حضرت کا حجرہ کی سیڑھی سے اترنے کا سماں اب تک میری نظروں
میں گھوم رہا ہے۔ حضرت ؑ کی شکل وشباہت قد و قامت اور خوبصورتی کی مثال وشباہت میں اگر ناقص تشبیہہ کسی
کے ساتھ دے سکوں تو مولانا عبدالحق صاحب حقانی مرحوم اور میرے والد مرحوم کو دے سکتا ہوں۔

الحمد للہ والشکر للہ۔

(مرسلہ مولوی اسمٰعیل سلمہٗ فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ)

—— : ختم شد : ——

فہرست مضامین مفتی اعظمؒ کی یاد

اس کتاب کے ملنے کے پتے

(۱) الجمعیۃ بک ڈپو - گلی قاسم جان - دہلی
(۲) کتب خانہ رشیدیہ - اردو بازار - دہلی
(۳) مکتبہ برہان - اردو بازار - دہلی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس - دہلی